شام کی مُنڈیر سے

وزیر آغا

مکتبۂ فکر و خیال
اقبال ٹاؤن لاہور

ضابطہ

حقوق ـــــ بحقِ مصنف محفوظ

طبع ـــــ اوّل

ناشر ـــــ بذلِ ندیم

تعداد ـــــ ایک ہزار

خطاطی ـــــ صغیر شروانی

سرورق ـــــ موجد

مطبع ـــــ مکتبہ جدید پریس لاہور

ماہ وسال اشاعت: دسمبر ۱۹۸۶ء

قیمت ـــــ ۶۰ روپے

مکتبۂ فکر وخیال، ۲۷-اے ستلج بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور

غُلام جیلانی اصغر کے نام!

وہ خوش کلام ہے ایسا کہ اُس کے پاس ہمیں
طویل رہنا بھی لگتا ہے مختصر رہنا

مُصنّف کی دوسری کتابیں

شاعری:

۱۔ شام اور سائے

۲۔ دن کا زرد پہاڑ

۳۔ غزلیں

۴۔ نردبان

۵۔ آدھی صدی کے بعد

۶۔ گھاس میں تتلیاں

تنقید:

۱۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح

۲۔ نظمِ جدید کی کروٹیں

۳۔ اُردو شاعری کا مزاج

۴۔ تنقید اور احتساب

۵۔ نئے مقالات

۶۔ تصوّراتِ عشق و خرد

۷۔ تنقید اور مجلسی تنقید

۸۔ نئے تناظر

۹۔ دائرے اور لکیریں

اِنشائیے:

۱۔ خیال پارے

۲۔ چوری سے یاری تک

۳۔ دوسرا کنارہ

متفرق:

۱۔ مسرّت کی تلاش

۲۔ تخلیقی عمل

۳۔ شامِ دوستاں آباد

تالیف:

۱۔ بہترین نظمیں ۱۹۵۸ء

۲۔ بہترین نظمیں ۱۹۵۹ء

۳۔ بہترین نظمیں ۱۹۶۰ء

۴۔ بہترین نظمیں ۱۹۶۱ء

۵۔ عبدالرحمٰن چغتائی ___ شخصیت اور فن

۶۔ انتخابِ جدید (حصّہ دوم)

ترتیب

۱- سفر

۱۹۲۲ء تا ۱۹۴۹ء ۹

۲- قیام

۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۹ء ۸۵

۳- سفر

۱۹۵۹ء تا ۱۹۷۵ء ۱۲۳

۴- قیام

۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۰ء ۲۰۷

۵- سفر

۱۹۸۰ء تا ؟ ۲۴۷

ورق ورق نہ سہی عمرِ رائیگاں میری
ہوا کے ساتھ مگر تم نہ عمر بھر رہنا

کچھ اس کتاب کے بارے میں!

آج سے چند سال پہلے جب مجھے "آدھی صدی کے بعد" کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھنے کی سعادت نصیب ہوئی تو میں خوش تھا کہ میں نے اپنی کہانی سُنا دی ہے اور اب میں مکمل طور پر آزاد ہوں۔ مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں نے "آدھی صدی کے بعد" میں تو صرف اپنے محسوسات کے مدوجزر کی داستان ہی قلم بند کی ہے۔ اس کے عقب میں پھیلے ہوئے اُن واقعات اور حادثات کی نشان دہی نہیں کی جن کے بالواسطہ یا بلاواسطہ اثرات سے یہ کہانی مُرتّب ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں میں نے اس میں اپنے فکری جزر و مد کے حامل سفر کو بھی موضوع نہیں بنایا۔ لہٰذا مجھے اپنی کہانی ایک بار پھر سُنانی چاہیئے۔

اپنی کہانی ہر شخص سنانا چاہتا ہے۔ کیوں؟ —— شاید اس لیے کہ اپنی تمام تر انکساری کے باوجود ہر شخص خود کو "مرکزِ دو عالم" سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنی شخصیت کو جھاڑ پونچھ کر اس طور پر پیش کرے کہ وہ پُراسرار یا کرشماتی (CHARISMATIC) نظر آنے لگے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں۔ بعض لوگ جن کی زندگیوں میں سیاست ایک اہم کردار ادا کرتی ہے، اپنی کہانی سُناتے ہوئے درپردہ یہ بتا رہے ہوتے ہیں کہ تاریخ میں اُن کا کیا مقام ہے۔ بعض دوسرے اپنے کردار کی اُس سختی یا توانائی کو بیان کرتے ہیں جس کے طفیل وہ زمانے سے متصادم ہو کر ذرّے سے آفتاب بن گئے اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بیباکی اور صاف گوئی کو اپنا مسلک قرار دیتے ہوئے اپنے کردار کے ان پہلوؤں کو منظرِ عام پہ لاتے ہیں جو خلقِ خدا کی نظروں میں گردن زدنی قرار پا سکتے ہیں۔ مقصود ان کا بھی اپنی شخصیت ہی کو اُبھارنا ہوتا ہے۔

گو وہ یہ کام بہ ظاہر اپنی شخصیت کی نفی سے سرانجام دیتے ہیں۔

جب میں نے زیرِ نظر کتاب لکھنا شروع کی تو میرا مقصود اپنی شخصیت کو نمایاں کرنا ہرگز نہیں تھا۔ مقصود فقط یہ تھا کہ اپنی اس داستانِ حیات میں دوسروں کو بھی شریک کروں جس سے میں خود تو آشنا ہوں لیکن جس سے دوسرے لوگ واقف نہیں ہیں۔ تاہم کہانی سناتے ہوئے مجھے معاً یہ محسوس ہوا کہ میں کہانی سُنا نہیں رہا بلکہ "سُن" رہا ہوں۔ یکایک سامع بن جانے کے اس تجربے نے مجھ پر بہت سی ایسی باتیں منکشف کیں جو بصورتِ دیگر میری نظروں سے اوجھل رہتیں۔ بالخصوص اپنی تصانیف کے فکری پس منظر سے تو میں کہانی سُنتے ہوئے ہی آگاہ ہوا۔ اب کھُلا کہ میں نے اکیس ۲۱ کتابیں تصنیف نہیں کیں بلکہ صرف "ایک" کتاب لکھی ہے مگر ایک ایسی کتاب جو ان اکیس ۲۱ کتابوں کا حاصل جمع نہیں ہے بلکہ اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہے۔ جس طرح اساطیر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان میں سے ہر اسطور اپنی جگہ ایک منفرد اور بے مثال کہانی ہے مگر تمام اساطیر مل جُل کر صرف "ایک" کہانی سُناتی ہیں جو اپنے پُراسرار معنی کے اعتبار سے جُملہ دیومالائی کہانیوں سے مختلف ہے بالکل اسی طرح اپنی تمام تر کتابوں کو مربوط کر کے اور ان کے پس منظر سے آشنا ہو کر میں نے جو "کتاب" دریافت کی وہ ان میں سے ہر کتاب سے مختلف تھی۔ نیز اس کی ایک اپنی کہانی تھی۔ اس کتاب کے بارے میں میرا یہ تاثر تھا کہ یہ ابھی نامکمّل ہے اور شاید کبھی شرمندۂ تکمیل نہیں ہو گی، میرے لیے اپنی زندگی کے طویل سفر کو "تیسری آنکھ" سے دیکھنے کا یہ تجربہ انوکھا بھی تھا اور پُراسرار بھی! —— انوکھا یوں کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے کئی سفر نہیں کیے، صرف ایک سفر کیا ہے اور وہ سفر بھی ابھی ناتمام ہے۔ درمیان میں قیام کے وقفے ضرور آئے ہیں مگر ان کی حیثیت "دم لینے" سے زیادہ نہیں ہے —— پُراسرار یوں کہ میرا یہ سفر کائنات کے لامتناہی سفر ہی کا ایک حصّہ ہے اور میں اس کی ابتداء، انتہا اور غایت سے کبھی پوری طرح آشنا نہیں ہو سکتا!

بہرکیف کتاب آپ کے سامنے ہے۔ اگر اس کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ کو محسوس ہو کہ میری کہانی آپ کی اپنی کہانی بھی ہے تو میں سمجھوں گا کہ میری یہ کوشش غارت نہیں گئی!!

وزیر آغا

وزیر کوٹ، ۱۳؍ اکتوبر ۱۹۸۶ء

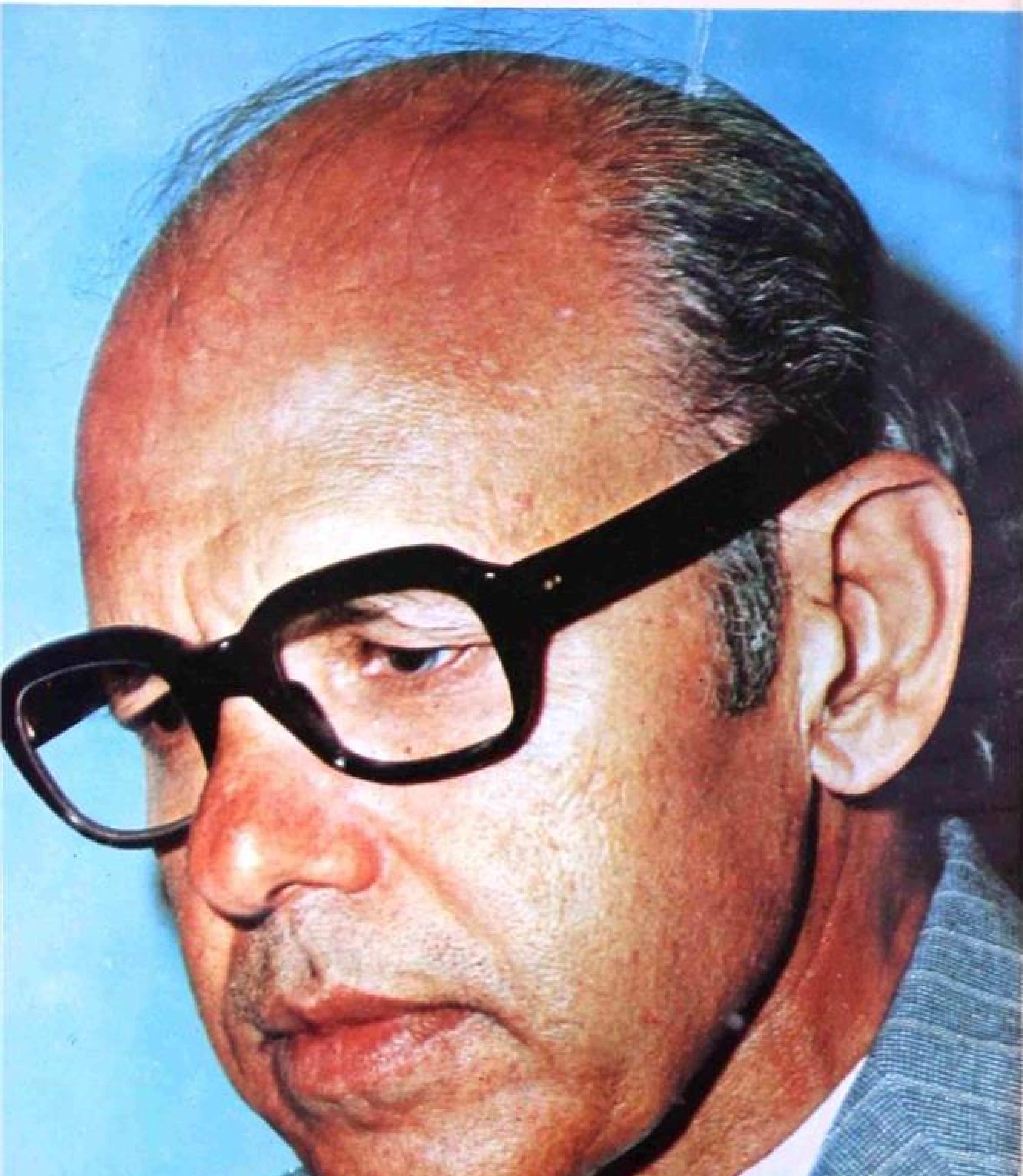

وزیر آغا (۱۹۵۷ء)

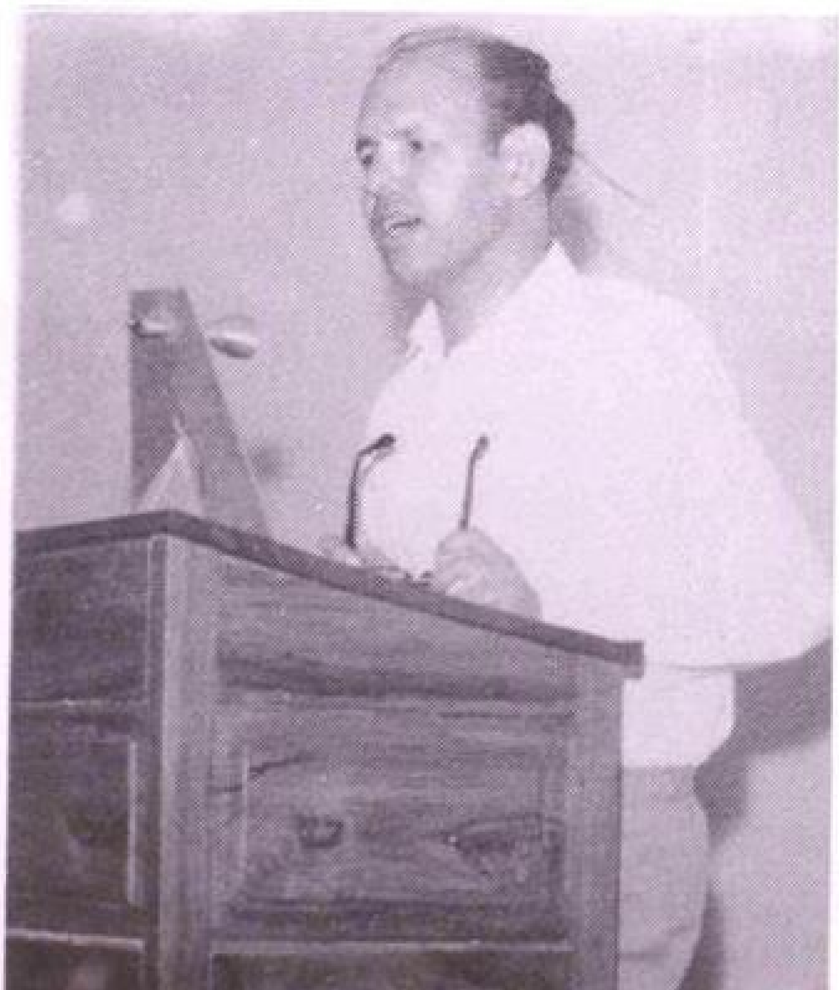

وزیر آغا (۱۹۷۰ء)

آبائی مکان (وزیر کوٹ)

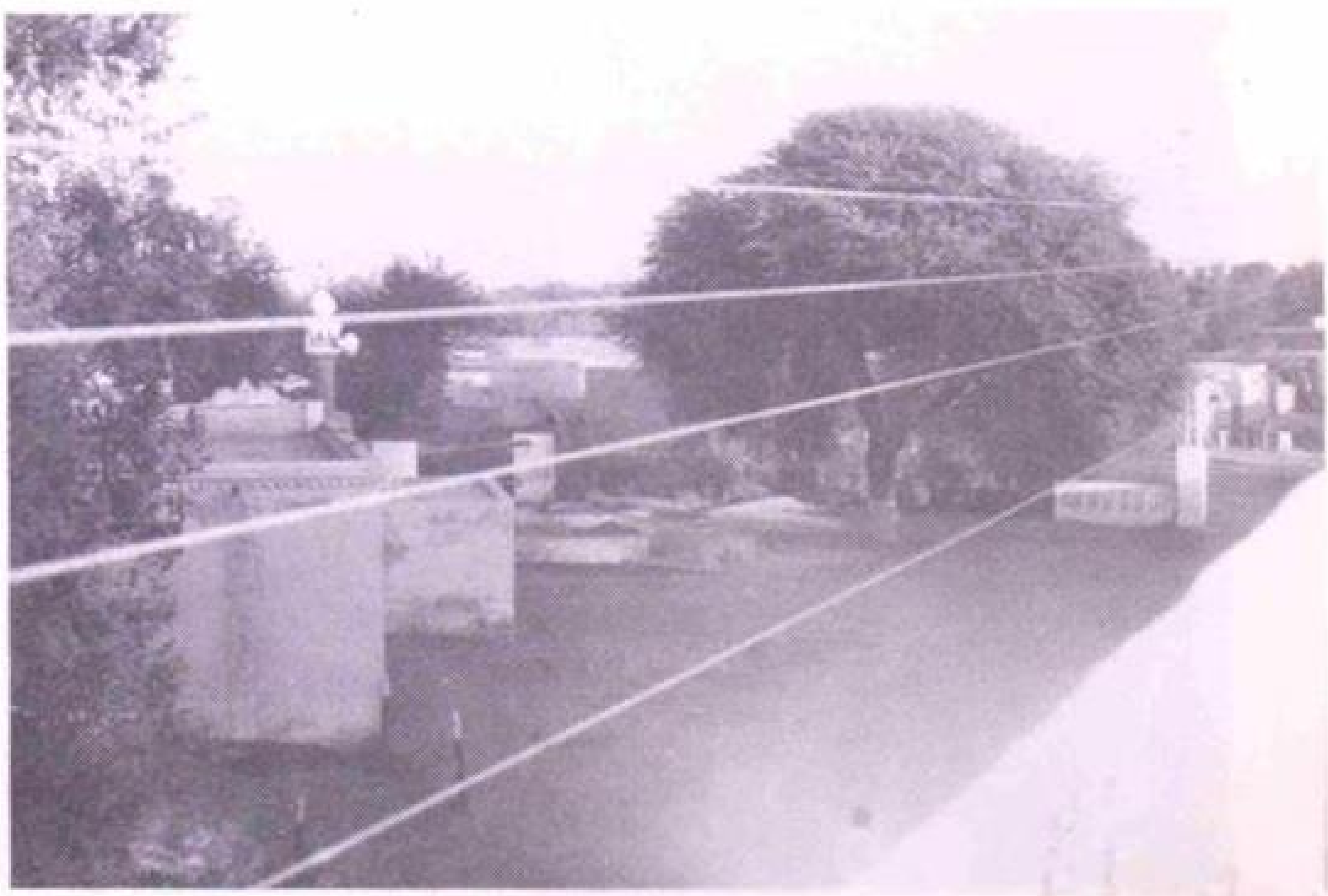

(وزیر کوٹ)

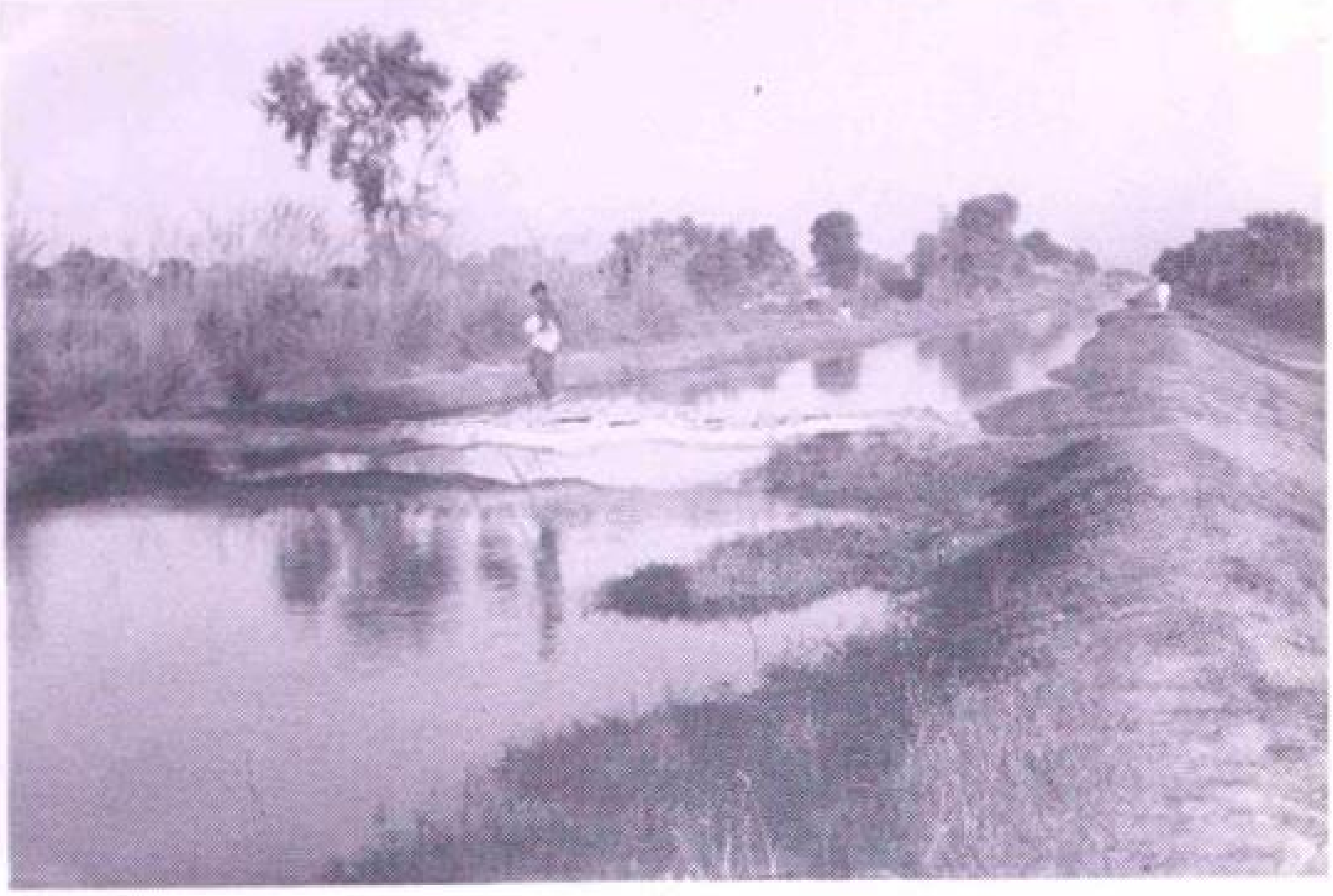

نہر (وزیر کوٹ)

بڑ کا درخت (وزیر کوٹ)

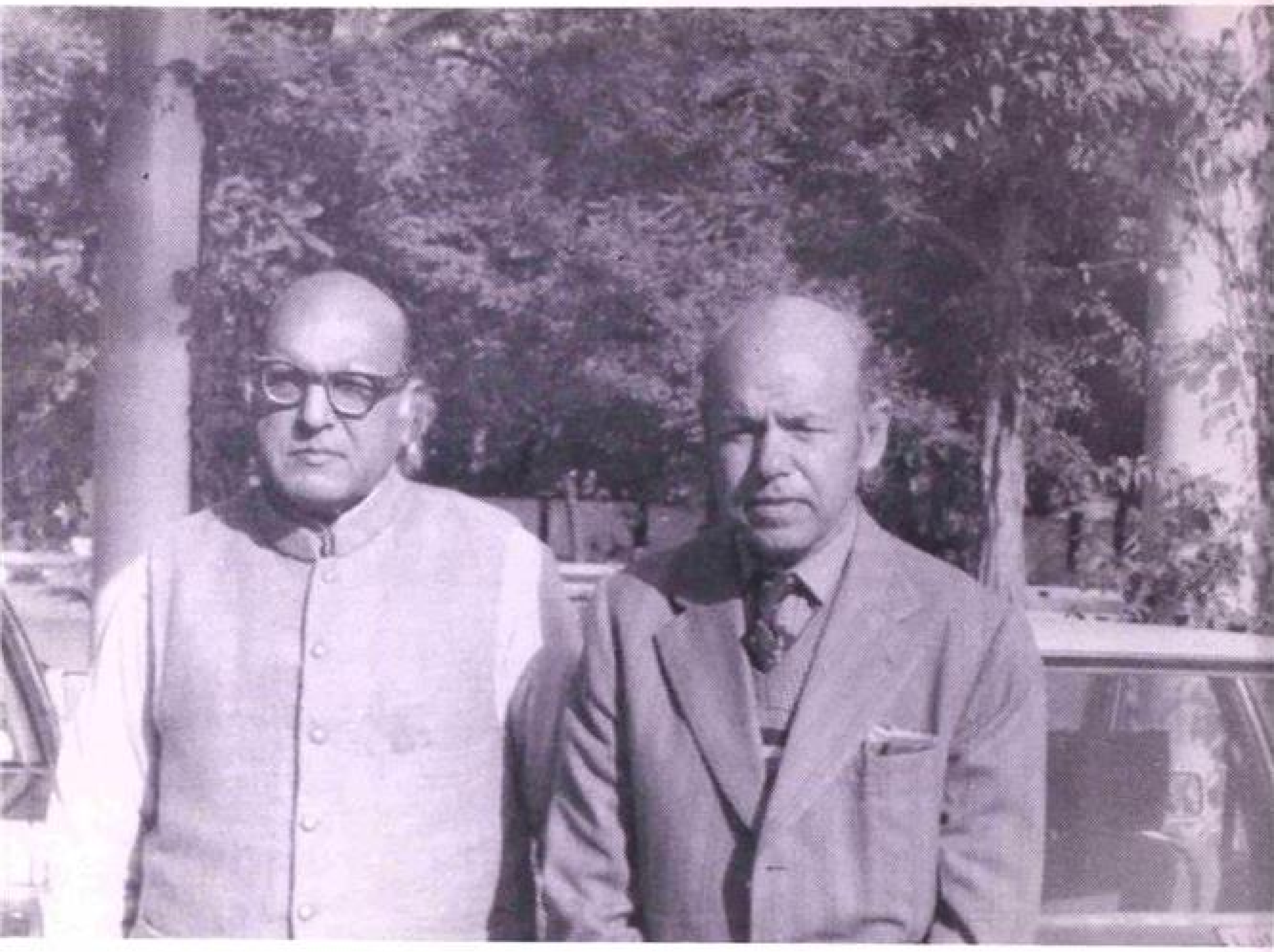

وزیر آغا۔ انور سدید

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ مشتاق قمر۔ جمیل آذر۔ وزیر آغا

بلراج کومل - وزیر آغا - گوپی چند نارنگ - انتظار حسین - احمد ہمیش - لنڈوٹنیک ۔

رشید امجد - محمد منشا یاد - سلیم آغا قزلباش - ضیاء جالندھری - وزیر آغا - رعنا تقی - مشتاق قمر - اکبر حمیدی - جمیل آذر -

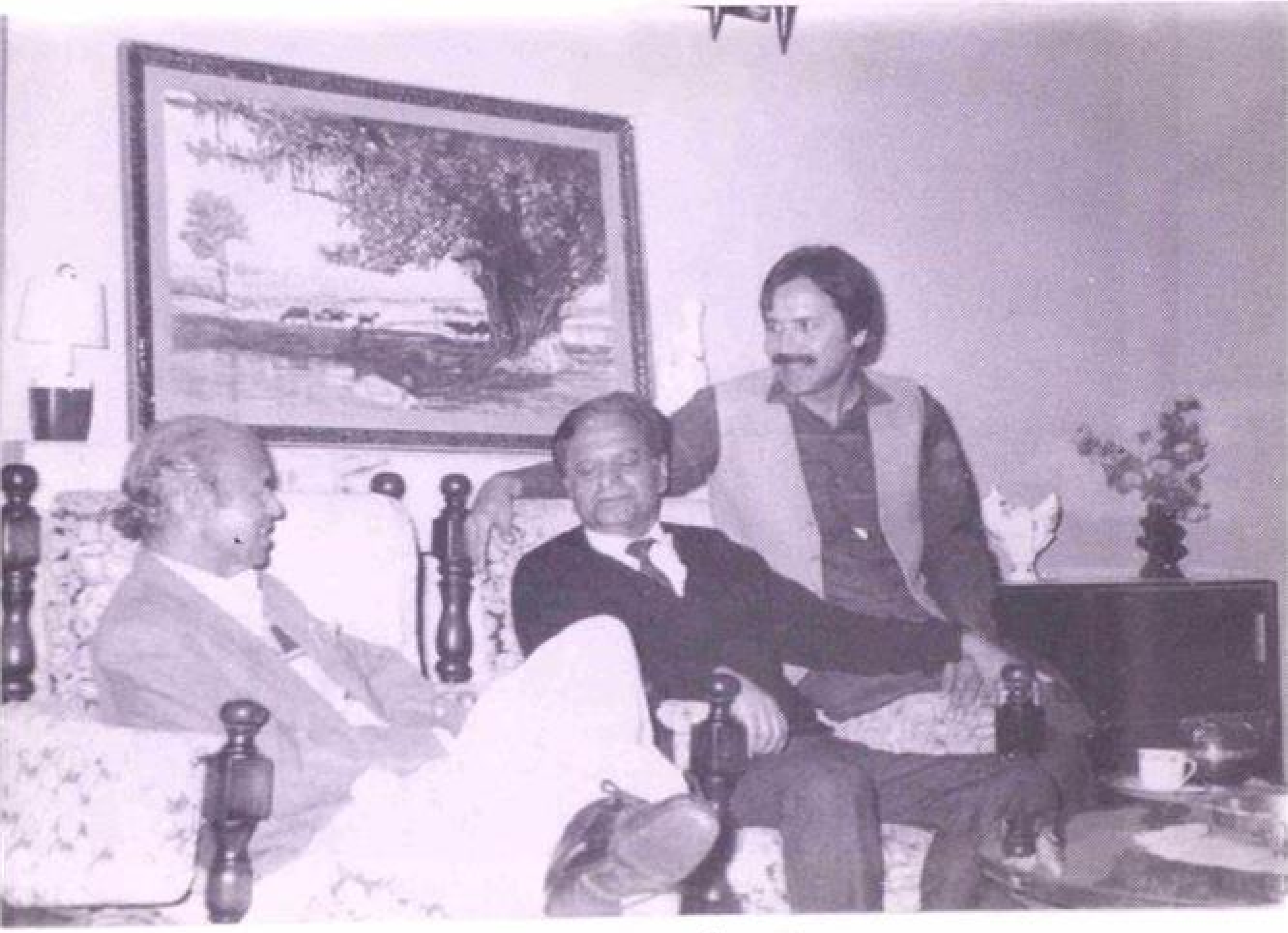

وزیر آغا ۔ جوگندر پال ۔ حسن رضوی ۔

قیصر قلندر ۔ بلراج کومل ۔ وزیر آغا ۔ بیگم قیصر قلندر ۔ مسز بلراج کومل

ڈاکٹر شمیم حنفی وزیر آغا۔ انتظار حسین۔ شہزاد احمد۔

ڈاکٹر سعد اللہ کلیم۔ وزیر آغا۔ اقبال ساجد۔ شیر افضل جعفری

ظفر اکبر آبادی - ڈاکٹر ریاض مجید - ڈاکٹر ریاض احمد ریاض - انور سدید - وزیر آغا - ڈاکٹر احسن زیدی - غلام جیلانی اصغر

شہزاد منظر - سیما شکیب - راغب شکیب - وزیر آغا - انور سدید - ادیب سہیل -

اقبال ساغر صدیقی۔ ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف۔ فرحت نواز۔ وزیر آغا۔ جمیل آذر۔ انور سدید۔ رضوانی۔ توصیف تبسم۔ الیصار عبد العلی

غلام جیلانی اصغر۔ میاں محمد انور۔ صاحبزادہ عبد الرسول۔ وزیر آغا۔ ملک نسیم احمد اہیر۔ چوہدری محمد انور

(عقب میں) مسٹر تارڑ۔ الیاس چوہدری۔ ایم۔ ڈی۔ شاد۔ سجاد نقوی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ انور سدید۔ وزیر آغا۔

وزیر آغا۔ اصغر علی انجینئر۔ انور سدید

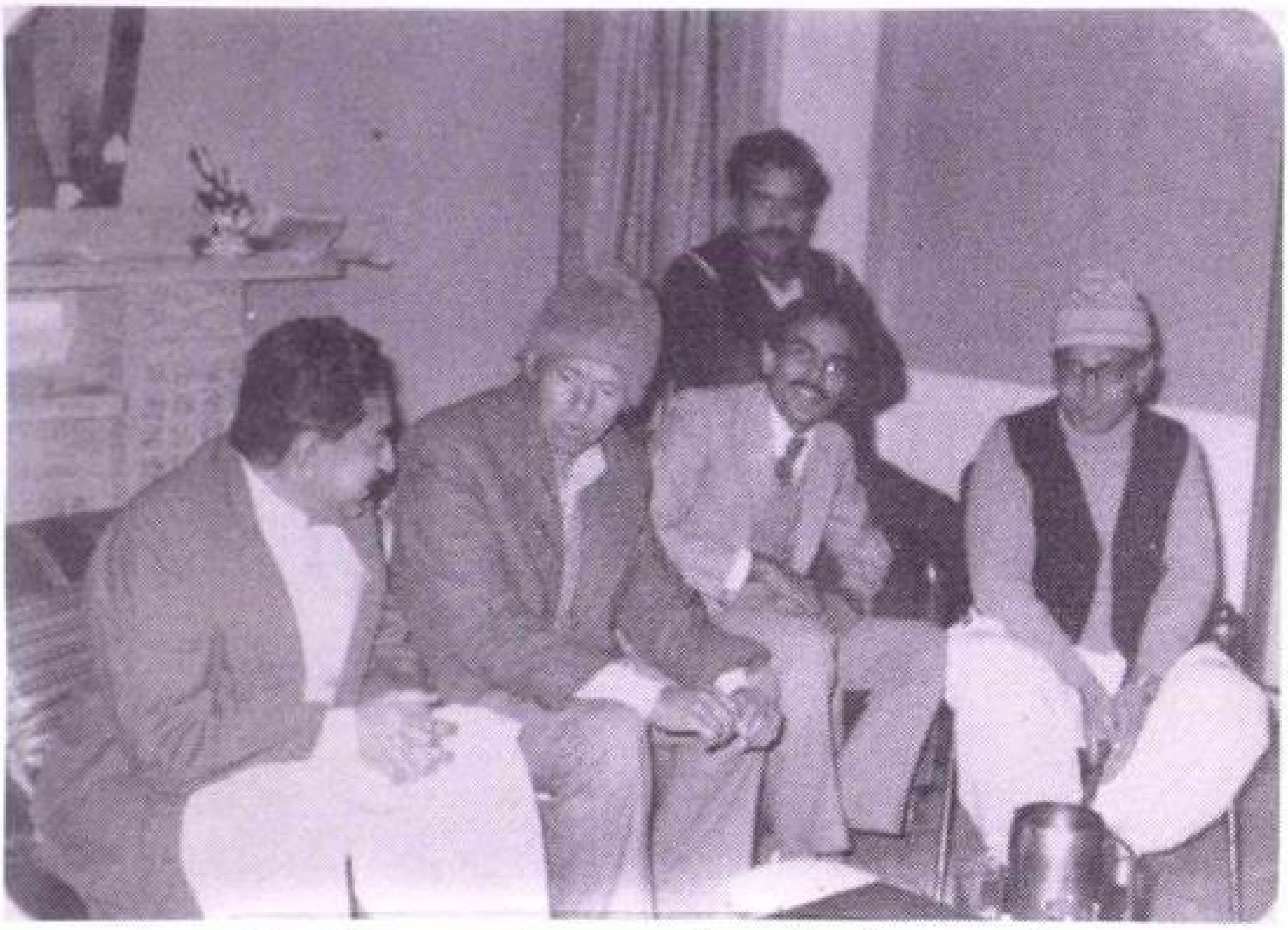

سجاد نقوی، امداد آکاش، ایم ڈی شاد، وزیر آغا۔ رشید قیصرانی

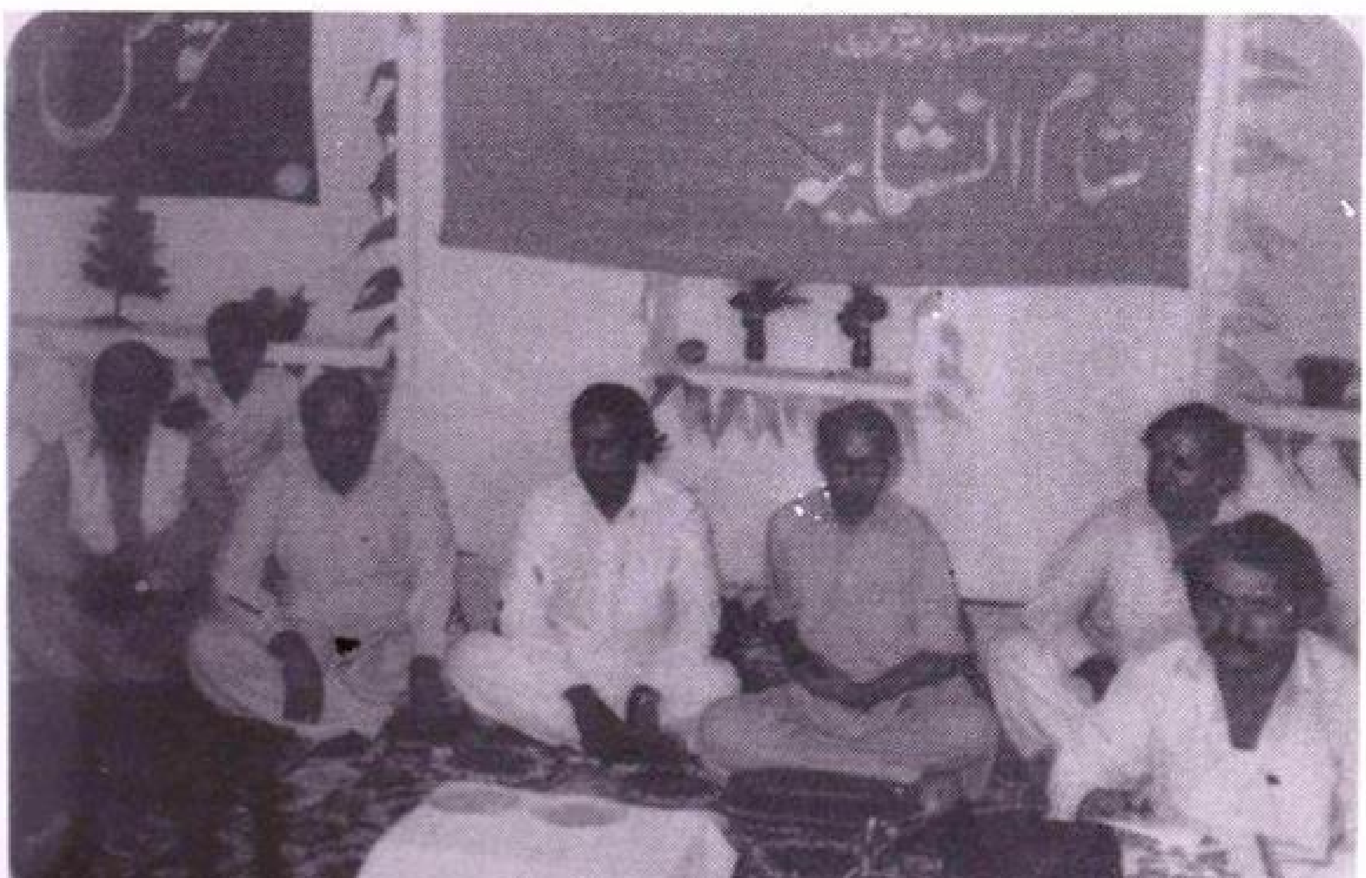

جان کاشمیری۔ سلیم آغا۔ وزیر آغا۔ اصغر سودائی۔ انور سدید۔ جمیل آذر

سفر

۱۹۲۲ء تا ۱۹۴۹ء

وہ پھول ہے تو اپنی ہی خوشبو میں تر رہے
بے وجہ کیوں ہوا کی طرح در بدر رہے

۱

دن ڈھل چکا — مگر پرندے کا سفر ابھی جاری ہے۔ بدن کا سارا لہو پروں میں سمٹ آیا ہے۔ دُور اُفق پر سیہ درختوں کی ایک لکیر سی دکھائی دینے لگی ہے۔ بظاہر یہ خطِ شام ہے مگر میرے لئے یہ سپیدۂ سحر ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں شام کی اُس دہلیز کی طرف نہیں جا رہا جس سے آگے اندھی شب کا ایوان ہے اور جہاں پہنچتے ہی پَر بکھر جاتے ہیں اور چراغوں کی لَوئیں ٹمٹما کر بجھ جاتی ہیں۔ میں تو شام کی منڈیر پر اُترنے کی کوشش میں ہوں جہاں سے میں طلوع ہوتی ہوئی تاروں بھری رات کا نظّارہ کر سکوں گا۔ مجھے ایک دوست نے دیارِ غیر سے ایک ٹیلی سکوپ بھیجا ہے۔ چھوٹا سا ہے مگر دُور کی چیزوں کو کھینچ کر اپنے قریب لے آتا ہے۔ جب یہ موصول ہوا تو میں اسی شام اپنے گھر کی چھت پر چڑھ گیا ٹیلی سکوپ کو اسٹینڈ پر فکس کیا اور رات کا انتظار کرنے لگا پھر جب رات طلوع ہوئی تو میں نے ٹیلی سکوپ کا رُخ آسمان کی طرف کر دیا۔ ستارے پھڑپھڑانے لگے۔ ستّارے ہمک کر میری گود میں آ گرے اور بنات النّعش گردوں بے نقاب ہو گئیں —— اور اب میں ہر شام زمین سے اپنا پلّو چھڑا کر آسمان کی طرف پرواز کر جاتا ہوں۔ پچھلے ۶۴ برس سے مَیں اس ارضِ خاک کا "شہری" تھا مگر اب میں آسمان کا شہری بھی ہوں —— شام، میرے لیے ٹرمینس نہیں ہے جہاں مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رُک جانا ہے بلکہ ایک جنکشن ہے جہاں سے مجھے گاڑی تبدیل کرنی ہے۔ ٹیلی سکوپ کی صورت

میں نے اس گاڑی کا ٹکٹ خرید لیا ہے۔ سو میرا سفر ابھی جاری ہے۔

اِس نئے سفر کی کہانی تو میں بعد میں سناؤں گا۔ پہلے اُس سفر کی بازآفرینی کرتا ہوں جو میں طے کر آیا ہوں۔ منڈیر پر سے دیکھنے کا یہی تو فائدہ ہے کہ آپ طلوع اور غروب دونوں کا نظّارہ کر سکتے ہیں۔

۲

میرا سفر ۱۸ مئی ۱۹۲۲ء کو شروع ہوا۔ میں ضلع سرگودھا (پنجاب) کے ایک ڈورافتادہ گاؤں میں رات کے پچھلے پہر نازل ہوا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اُس وقت کون سا ستارہ کس بُرج میں تھا اور کیا واقعی ان ستاروں نے میری قسمت رقم کر دی تھی۔ میرے جنم پر والد صاحب نے ایک پنڈت جی سے میری پتری نکلوائی تھی جسے میری ماں نے محفوظ کر لیا تھا۔ مگر کسی نے اس جنم پتری کو (جو دیوناگری لپی میں تھی) پڑھوانے کی کوشش نہ کی۔ بعد ازاں خود میں نے بھی کبھی اس بات کی ضرورت محسوس نہ کی۔ حالانکہ جوانی میں مستقبل کے بارے میں جاننے کے لئے انسان بے چین ہوتا ہے۔ یہ جنم پتری آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ اس کے کچھ حصّے دیمک نے چاٹ لئے ہیں۔ کچھ حصّے کاغذ کا رنگ بدل جانے کے باعث ناقابلِ مطالعہ ہیں۔ مگر کچھ حصّے آج بھی پڑھے جا سکتے ہیں مگر اب مجھے مستقبل میں کوئی دلچسپی نہیں ہے البتہ یہ جنم پتری مجھے میرے ماضی کے بارے بہت کچھ بتا سکتی ہے مگر جتنا اپنے ماضی کے بارے میں خود مجھے علم ہے اتنا جنم پتری کو کیسے ہو سکتا ہے! اگر آج اسے پڑھوالوں تو اس کا مقصد بجز اس کے اور کیا ہوگا کہ پنڈت جی کو سچّا یا جھوٹا ثابت کیا جا سکے۔ اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں کیونکہ پنڈت جی کو پرلوک سدھارے اب کتنے ہی یُگ بیت چکے ہیں۔

میرے والد (جو زندگی کے آخری ایّام میں د۔ع۔خ کے نام سے مشہور ہوئے) لاہور میں گھوڑوں کا کاروبار کرتے تھے۔ یہی کاروبار میرے دادا کا بھی تھا جو میرے ہم نام تھے۔ میرے پڑدادا بھی گھوڑوں ہی کے سوداگر تھے اور ایران سے افغانستان چلے آئے تھے۔ غالباً سیاسی وجوہ کے باعث! میرے دادا کچھ عرصے پشاور میں رہے پھر لاہور آ گئے اور لاہور ریلوے اسٹیشن کے پاس سُلطان کی سرائے میں قیام کیا۔ لاہور میں ان کے مراسم انگریزوں سے نسبتاً زیادہ تھے۔ شاید اس لئے کہ وہی اُن

دنوں گھوڑوں کے قدردان تھے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان کی اصل دوستی کسی انگریز افسر سے نہیں تھی بلکہ مشہور ناول نگار رُوڈیارڈ کپلنگ (RUDYARD KIPLING) سے ہوئی جو ان دنوں لاہور کے انگریزی اخبار ٹریبیون سے منسلک تھے۔ والد صاحب سے مجھے پتہ چلا کہ کپلنگ ہر شام میرے دادا کے پاس سلطان کی سرائے میں آتے اور گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ بعدازاں جب کپلنگ نے ناول کِم (KIM) لکھا تو اس میں میرے دادا کے ایک بھائی کو بطور کردار شامل کیا۔ خدا معلوم اس میں سچائی کس حد تک ہے! کِم (KIM) کا مطالعہ کرتے ہوئے گھوڑوں کے ایک سوداگر سے تعارف تو حاصل ہوتا ہے!

اس صدی کے آغاز میں میرے دادا کے چھوٹے بھائی اچانک وفات پا گئے تو اُن کا دل دنیا سے اُچاٹ ہوگیا، انھیں اپنے چھوٹے بھائی سے بڑا پیار تھا۔ سو گھوڑوں کے کاروبار میں انھیں ذرّہ بھر دلچسپی نہ رہی اور ہمارے خاندان کے مالی حالات روز بروز خراب سے خراب تر ہونے لگے۔ اتفاق سے انھیں دنوں کرانہ بار میں نہر آگئی اور طویل و عریض رقبے لوگوں میں تقسیم کئے جانے لگے۔ چونکہ انگریز کو گھوڑوں کی سخت ضرورت تھی اس لئے یہ سارا رقبہ گھوڑی پالی شرائط کے تحت تقسیم ہوا۔ یعنی زمین سرکار کی رہی البتہ اس پر کام کرنے والوں کے لئے یہ شرط عائد کردی گئی کہ وہ ہر پچاس ایکڑ پر ایک گھوڑی پالیں گے اور بچّے (یعنی گھوڑی کے بچّے) حکومت کے پاس اونے پونے فروخت کردیں گے اور اگر انھوں نے گھوڑی کی نگہداشت میں غفلت برتی تو زمین ان سے چھین لی جائے گی۔ میرے والد نے سوداگری کے مستقبل کو تاریک ہوتا دیکھ کر گھوڑی پالی کے تحت زمین کے حصول کے لئے درخواست دے دی اور چونکہ گھوڑوں کے سلسلے میں ان کی شہرت پہلے ہی انگریز تک پہنچ چکی تھی لہٰذا انھیں ضلع سرگودھا کے ایک گمنام سے گوشے میں ساڑھے سات سو ایکڑ کا ایک رَس سٹڈ قائم کرنے کی اجازت مل گئی اور وہ لاہور سے نقلِ مکانی کرکے ضلع سرگودھا میں آگئے۔ انھوں نے پہلے ایک چھوٹا سا گاؤں آباد کیا اور اس کا نام اپنے والد کے نام پر وزیر کوٹ رکھا اور پھر اپنے حصّے کے جنگل کو اکھیڑنے اور زمین کو ہموار کرنے میں مصروف ہوگئے۔ میں جب ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوا تو ابھی وزیر کوٹ کی زمین پوری طرح ہموار نہیں ہوئی تھی۔

۳

اپنی عمر کے پانچویں برس سے پہلے کا کوئی واقعہ میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔ میں نے پانچ سالوں پر پھیلے ہوئے اس تاریک برِاعظم میں اُترنے کی ہزار کوشش کی ہے مگر مجھے کبھی کچھ دکھائی نہیں دیا۔ البتہ پانچویں برس کے تین واقعات، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سنگ ہائے میل کی طرح ایستادہ ہیں۔ اور میں آج بھی اپنی چشمِ تصور میں انہیں دیکھ سکتا ہوں۔ پہلا واقعہ تو میرے چھوٹے بھائی کی پیدائش تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ میری ماں سخت بیمار ہے میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں ماں کے کمرے میں جانے کے لئے ضد کرنے لگا مگر میری خالہ نے مجھے جھڑک دیا اور میں رونے لگا اور روتے روتے سو گیا۔ اگلی صبح میں جاگا تو ماں موجود نہیں تھی۔ میں لپک کر گیا اور اس کمرے کے بند دروازے کو پیٹنے لگا جس کے اندر میری ماں بیمار پڑی تھی۔ تب کسی نے دروازہ کھول دیا اور میں بھاگ کر اندر چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ میری ماں بستر پر دراز تھی۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ مگر وہ مجھے دیکھ کر مُسکرائی تب اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور مجھے اپنے سینے سے لگا کر میری پیشانی کو چُوم لیا اور مجھے جیسے قرار سا آگیا ——— دوسرا واقعہ، حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ہوا یہ کہ ہمارے گاؤں کے ترکھان نے میرے لئے لکڑی کی ایک چھوٹی سی بیل گاڑی بنائی۔ بالکل اسی طرح کی جیسی اپاہج فقیر گلی گلی بھیک مانگنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ پھر کسی نے مجھے اس گاڑی میں بٹھا دیا اور گاڑی کے آگے ایک بچھڑا جوت دیا۔ اس کے بعد مجھے اتنا یاد ہے کہ گاڑی اُڑی جا رہی تھی اور لوگ چیختے چلّاتے گاڑی کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے کیونکہ بچھڑا اپنے پیچھے بوجھ سا بندھا ہوا دیکھ کر بے قابو ہو گیا تھا اور دولتیاں جھاڑتا اور پھنکارتا سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ اس واقعہ کی بس اتنی سی یاد میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ برسوں بعد مجھے میرے بڑے بھائی نے بتایا کہ اس روز میں معجزانہ طور پر بچ گیا تھا کیونکہ کسی نوجوان نے برق رفتاری سے دوڑتے ہوئے مجھے گاڑی میں سے اُچک لیا تھا اور دوسرے ہی لمحے گاڑی اور بچھڑا گاؤں کے گہرے جوہڑ میں گر گئے تھے ——— تیسرا واقعہ میری شدید علالت کا تھا۔ مجھے دراصل ٹائیفائڈ ہو گیا تھا اور ان دنوں ٹائیفائڈ کا کوئی علاج نہیں تھا۔ بیمار پڑنے سے پہلے میری صحت بہت اچھی تھی۔ سُرخ و سفید اور گول مٹول! گھر والے مجھے اٹھائے پھرتے تھے۔

لیکن ٹائیفائڈ کے بعد میری صحت بگڑتی ہی چلی گئی۔ معدے کا روگ مستقل صورت اختیار کر گیا اور میں سُوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ بعد ازاں جوانی بھی اس شاخ کو پوری طرح ہرا نہ کر سکی۔ میرے جسم کی ہڈیاں کمزور رہ گئیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ میں بچپن میں بہت شرمیلا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی بڑی وجہ جسمانی کمزوری تھی۔ جسم توانا ہو تو انسان باہر کی دنیا کو فتح کر لینے کے لئے مستعد ہوتا ہے۔ ہر جوان اور صحت مند جسم کے اندر کوئی نہ کوئی سکندرِ اعظم ضرور موجود ہوتا ہے جو پوری دُنیا کو زیر پا لانے کے خواب دیکھتا ہے اگر جسم کمزور ہو تو انسان خود میں سمٹ جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کا فرار ہے جسے شرمیلے پن کا نام دے دیا جاتا ہے۔ میرے معاملے میں یہ صُورتِ حال سکول اور پھر کالج کے ایّام تک جاری رہی۔ چنانچہ میں نے ان ایّام میں اپنا کوئی دوست نہ بنایا۔ ہمیشہ خلقِ خدا سے دُور دُور ہی رہا۔ البتہ کالج سے فارغ ہونے کے بعد تلافی کی ایک صُورت پیدا ہوئی اور میں نے متعدد دوست بنائے مگر یہ ایک الگ داستان ہے ——— بہرحال علالت کا یہ واقعہ میری یادداشت میں آج بھی محفوظ ہے!

(۴)

بچپن کے بعد لڑکپن آیا اور لڑکپن کے ایّام میری یادداشت میں پوری طرح روشن ہیں۔ عجب ہنگامہ خیز دَور تھا۔ اُن دنوں ہمارا گھر پچیس تیس افراد پر مشتمل تھا۔ میرے دو سوتیلے بھائی اور دو سوتیلی بہنیں تھیں۔ چاروں مجھ سے عمر میں اتنے بڑے تھے کہ اُن کے بچّے یا تو میرے ہم عمر تھے یا عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ اُن کے علاوہ خاندان کے کچھ اور لوگ بھی سر چھپانے کے لئے ہمارے گھر میں آ گئے تھے۔ دراصل یہ زمانہ ہی انتشار اور سراسیمگی کا تھا جو گھر کے باہر بھی تھی اور گھر کے اندر بھی! اس وقت مجھے باہر کی صُورتِ حال کا علم نہیں تھا البتہ گھر کی حالتِ زار کے کچھ نقوش آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ مثلاً جب ہر چھ ماہ کے بعد مالیہ آبیانہ ادا کرنے کا وقت آتا تو گھر میں کھسر پھسر شروع ہو جاتی اور پھر گھر کی کسی نہ کسی خاتون کا کوئی زیور بیچ دیا جاتا تاکہ مالیہ آبیانہ ادا ہو سکے۔ یہ دراصل ۱۹۲۹ء کے عالمی بحران کے فوراً بعد کے ایّام تھے۔ بہت سے کاشتکار مالیہ آبیانہ کی عدمِ ادائیگی کے باعث جیل یاترا بھی کر آئے تھے۔

مگر میرے گھر والوں کو اپنی عزّت بہت عزیز تھی اور وہ عزّتِ سادات کو بچانے کے لئے پوری طرح کوشاں تھے ۔ اُن دنوں کاشت کار کی پیداوار کی کوئی قیمت نہیں تھی ۔ مثلاً گندم کی قیمت شاید ایک روپیہ فی من تھی اور کپاس سات آٹھ روپے فی من ! یہی حال دوسری فصلوں کا بھی تھا ادھر گھوڑوں کی صحت کو برقرار رکھنا بھی ضروری تھا ورنہ زمین سے ہاتھ دھونے پڑتے ۔ اس لئے زمین کے بڑے حصّے پر چارہ کاشت کیا جاتا ۔ اس کا بھی زراعت پر بُرا اثر پڑا اور زراعت کے علاوہ ہمارے گھر پر بھی ! اس وقت تو مجھے اس بات کا احساس نہ ہوا لیکن اس کے کئی برس بعد جب حالات بہتر ہوئے نیز شہروں میں جا کر دوسروں کی خوش حالی کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ ہم لوگوں کا لڑکپن کتنی عُسرت اور تنگدستی میں گزرا تھا ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے گھر میں ہفتہ میں ایک بار گوشت پکتا لیکن چونکہ گوشت کم اور مردماں بسیار کا معاملہ تھا اس لئے مساوات قائم رکھنے یا شاید خوفِ فسادِ خلق کے پیشِ نظر اس گوشت کی چھوٹی چھوٹی ایک ہی سائز کی بوٹیاں تراش لی جاتیں ۔ جب کھانا تیّار ہو جاتا تو ہماری خالہ ہانڈی لے کر میدان میں اُتر آتیں ۔ ساتھ ہی ایک بڑی چنگیر ہوتی جس میں تنور کی روٹیاں اہرامِ مصر کی صورت میں دکھائی دیتیں ۔ گھر میں دو تین درجن پیڑھیاں موجود تھیں ۔ ہم اپنی اپنی پیڑھی لئے خالہ کے گرد دائرہ کی صورت میں بیٹھ جاتے اور اپنے سامنے زمین پر تانبے کی ایک ایک تھالی رکھ لیتے ۔ باری باری خالہ سے سالن وصول کرتے ، اپنے ساتھی کی پلیٹ میں اُترتی ہوئی بوٹی کی جسامت پر چیختا ہوا احتجاج کرتے اور پھر ایک ہاتھ میں روٹی پکڑے دوسرے ہاتھ سے لقمہ منہ میں ڈالتے ۔ ہفتے کے باقی دنوں میں مسور کی دال ۔ شلغم ۔ مُولی یا حلوہ کدو کا سالن بنتا ۔ چونکہ یہ چیزیں ہمیں بار بار کھانے کو ملتیں اس لئے مجھے ان سے نفرت ہو گئی اور میں اکثر و بیشتر مکّی کے بُھٹّوں ، گڑ کے ڈھیلوں اور بُھنے ہوئے چنوں پر گزارہ کرتا ۔ جہاں تک ستر پوشی کا تعلق ہے تو سال میں ایک بار میرے والد شہر جا کر وہاں سے لدھیانہ اور لٹّھے کے پندرہ بیس تھان لے آتے (بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ تھان اُدھار پر آتے تھے) اور ہمیں لدھیانے کی قمیصیں اور لٹّھے کی شلواریں بنوا دی جاتیں ۔ ہمارے کپڑے بڑی خالہ سیتی تھیں ۔ میری یہ خواہش ہوتی کہ مجھے تھان کا وہ حصّہ ملے جس پر نمبر لگے ہوتے اور کاغذ پر چھپی ہوئی تصویر چسپاں ہوتی ۔ چنانچہ

جب مَیں کھڑ کھڑ کرتا ہوا لباس پہن کر باہر نکلتا تو گاؤں کے ہمجولیوں کو تصویر اور نمبر دکھا کر مرعوب کرتا۔

۵

لڑکپن کے ایّام خوشیوں سے معمُور تھے۔ غُربت کا تو ہمیں احساس تک نہیں تھا کیونکہ ہم اپنے سے بہتر معیارِ زندگی سے واقف ہی نہیں تھے۔ گاؤں کے دوسرے باسیوں کا حال اتنا پتلا تھا کہ ان کے مقابلے میں ہم خود کو شہزادے سمجھتے تھے مگر اس سلسلے میں ہم کسی احساسِ برتری میں مبتلا نہیں تھے۔ گاؤں کے سب لڑکے ہمارے ہم جولی تھے۔ ہم اکٹھے ہی کھیلتے اکٹھے ہی کھیتوں میں آوارہ گردی کرتے، پرندوں کے پَر اور انڈے جمع کرتے، شہتوت اور تربوز کھاتے اور غلیل سے پرندوں کو زخمی کرنے کی مہم میں سارا دن مصروف رہتے۔ البتہ شام کو اِن ڈور گیمز کا آغاز ہوتا۔ اِن ڈور سے مراد یہ ہے کہ ہم کھیتوں کے بجائے گاؤں کی گلیوں میں کھیلتے۔ لکن میٹی سے لے کر کبڈی تک ہم تمام مراحل سے گزرتے مگر یہ سب کچھ چاندنی راتوں میں ہوتا۔ ہم ڈھول میں اَٹے آدھی رات تک کبڈی کھیلتے اور پھر تھک ہار کر گھروں کو لوٹتے۔ مصروفیّت کا یہ عالم تھا کہ سورج نکلنے سے چاند نکلنے تک کا سارا عرصہ جیسے پَل جھپکنے میں گزر جاتا۔ گرمیوں میں دوپہر کا وقت ہم نہر کنارے بسر کرتے۔ نہر ہمارا سوِمنگ پُول تھا جس میں ہم اور ہمارے گاؤں کے ڈھور ڈنگر ایک ساتھ اشنان کرتے اور یہ اشنان دن کے پچھلے پہر تک جاری رہتا۔

چاندنی راتوں میں تو ہم کھیلتے لیکن اندھیری راتوں میں ہمیں گھر سے باہر نکلتے ہوئے ڈر لگتا۔ گاؤں میں جنّوں بُھوتوں کی کہانیاں ہمہ وقت گردش میں رہتیں۔ ہر گبڑا درخت جنّات کا بسیرا تھا بالخصوص وَن اور لسوڑھی کے درختوں سے ہم بے حد خائف تھے۔ میرا خیال ہے کہ بڑوں نے یہ کہانیاں صرف اس لئے مشہور کر رکھی تھیں تاکہ ان کے بچّے اندھیرے میں گھر سے باہر نہ نکلیں اور یوں "سپ سلونگے" سے محفوظ رہیں۔ مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ خود انہیں ان کہانیوں کی سچّائی کا یقین تھا اور یہ یقین مذہب الارواح کے زمانے سے دست بدست بلکہ

دل بدل ہوتا ان تک پہنچا تھا۔ بہرحال اندھیری راتوں میں جب ہم باہر نہ نکل سکتے تو گھر میں بیٹھ کر کہانیاں سُنتے اور داستان گو کو اس کی قیمت بھی ادا کرتے۔ مثلاً خالہ جان سے کہانی سننے کے لئے یہ ضروری تھا کہ پچھلے برس کی رضائیوں کی روئی کو اپنے ہاتھوں سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کریں بعد ازاں اس روئی کو دُھنئے کے پاس بھیج دیا جاتا تاکہ رضائیاں دوبارہ بھری جا سکیں۔ سو ہم سب روئی کو لیر لیر کرتے مگر ساتھ ہی خالہ جان سے کہانی بھی سُنتے جاتے جو شہزادوں اور پریوں کے بارے میں ہوتی۔ کبھی کبھی وہ ہمیں ڈراؤنی کہانیاں بھی سُناتیں۔ خاص طور پر ایک کہانی تو ایسی تھی جس کا ہم بار بار مطالبہ کرتے اور جسے سُن کر ہر بار ہمارے پسینے چھُوٹ جاتے۔ کہانی ایک شہزادی کی تھی۔ شہزادی جب آئینے کے سامنے جاتی تو آواز آتی : "کیا میں آؤں؟" ——— اور شہزادی آئینہ پھینک کر بھاگ جاتی۔ مگر آئینہ دیکھے بغیر وہ رہ بھی نہیں سکتی تھی۔ آخر جب بہت تنگ آ گئی تو ایک روز "کیا میں آؤں؟" کے جواب میں اس نے چیخ کر کہا: "آجاؤ!" ——— اور پھر ایک دھماکہ ہوا اور خون میں تر ایک لاش اس پر آ گری اور وہ بیہوش ہو گئی ——— شہزادیوں اور جنّوں دیوؤں کی کہانیاں تو ہم خالہ جان سے سُنتے مگر عمرو عیّار اور افراسیاب کے قصّے سُننے کے لئے جُوبھا کی منت سماجت کرتے مگر اس کی ہمیں نسبتاً زیادہ قیمت ادا کرنا پڑتی۔ جُوبھا میرے منجھلے بھائی تھے مجھ سے عمر میں تقریباً بیس برس بڑے تھے۔ ان کا نام آغا نذیر علی تھا۔ کہانی سنانے کے لئے ان کی یہ شرط ہوتی تھی کہ ہم ان کے پاؤں دبائیں۔ جب کبھی ان کی کہانی کسی نازک مقام پر پہنچتی اور ہم حیرت میں ڈوبے ان کے پاؤں دبانا بھول جاتے تو وہ فوراً کہانی کو روک کر ایک کبت پڑھتے۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے آج کل ٹیلیویژن ڈراما کو روک کر اشتہار دکھائے جاتے ہیں۔ ہمارے معاملے میں کبت کا یہ مطلب تھا کہ پاؤں دباؤ، ورنہ کہانی ختم! یہ کبت کچھ اس طرح کا تھا۔

بات کی کروں بات۔ فات کی کروں فات\
بیٹری کے کانٹے ساڑھے نو نو ہات\
ہم بات کریں تمھارے تئیں\
تم دھیان رکھو ہمارے تئیں

دیکھو ہماری بات میں کیسا لذت آتا ہے۔

کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ جب وہ کہانی کو آگے چلا نہ سکتے تو ہر فقرے کے بعد اس "اسمِ اعظم" کو دہراتے تب ہمیں معلوم ہو جاتا کہ موٹر کار میں تیل ختم ہو چکا ہے اور وہ اب MISSING کر رہی ہے سو ہم ان کے پاؤں دبانا چھوڑ کر اپنے اپنے بستروں میں دبک جاتے!

موٹر کار کا ذکر آیا ہے تو میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ انہیں دنوں میرے والد نے ایک تھرڈ ہینڈ کار چار سو روپے میں خریدی تھی۔ غالباً پہلی جنگِ عظیم سے پہلے کا ماڈل تھا۔ اس کی چھت نہیں تھی۔ سامنے کا شیشہ بھی غائب تھا بھونپو باہر کی طرف فکس تھا۔ یہ موٹر کار سلف سٹارٹ نہیں تھی۔ جب کہیں جانا ہوتا تو گاؤں کے لڑکے اس کو دھکیلتے ہوئے گاؤں کے باہر تک لے آتے اور پھر نہر سے ملحقہ سڑک پر زور زور سے دھکیلتے تو کار میں جان پڑ جاتی۔ مجھے اس کار پر سفر کرنے کا صرف ایک موقع یاد ہے۔ ہمیں لاہور جانا تھا۔ اُن دنوں چنیوٹ کے قریب دریائے چناب پر ابھی پُل تعمیر نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا والد صاحب طالب والا کے راستے کشتیوں کے پُل کو عبور کر کے لاہور جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز کار پر سامان اور سواریاں لاد دی گئی تھیں۔ مڈگارڈوں پر بستر باندھے گئے تھے اور کار کے عین درمیان والد صاحب کا حقّہ تھا جس کی نالی اینٹی ایئر کرافٹ گن کی طرح آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھی۔ ہم صبح چار بجے اس موٹر کار میں سوار ہوئے اور شام چھ بجے لاہور پہنچے گویا ہم نے ایک سو دس میل کا فاصلہ ۱۴ گھنٹوں میں طے کیا تقریباً ۸ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے۔ مگر والد صاحب بہت خوش تھے، وہ اپنی اس موٹر کار کو "اسپِ آہستہ خرام" کے نام سے پکارتے تھے۔

(٦)

میرے والد اپنی دونوں بڑی بیٹیوں کے ساتھ فارسی میں لیکن میری والدہ کے ساتھ پنجابی میں باتیں کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ میری والدہ کو فارسی نہیں آتی تھی۔ دراصل میرے نانا جان قزلباش نہیں تھے، سیّد تھے اور لکھنؤ کے باشندے تھے پھر وہ نقلِ مکانی کر کے کلکتہ چلے گئے۔ وہیں میری والدہ پیدا ہوئیں۔ بعد ازاں ان کی وفات پر میری والدہ اور خالہ لاہور آ گئیں جہاں وہ اپنے

ماموں کے پاس مغل حویلی میں رہنے لگیں۔ لہٰذا وہ پنجابی بولتی تھیں لیکن فارسی زبان سے ناواقف تھیں۔ زبان ماں کے وسیلے سے اولاد تک پہنچتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے فارسی کے بجائے پنجابی سیکھی اور یہی میری مادری زبان ہے۔ جوانی کے آغاز میں میں نے فارسی بولنی سیکھ لی تھی مگر جلد ہی فارسی کا شوق ماند پڑ گیا اور میں نے فارسی میں گفتگو کرنا ترک کر دیا۔ آج یہ حال ہے کہ اگر فارسی میں گفتگو کرنے کی کوشش کروں تو چند ہی لمحوں کے بعد مُنہ دُکھنے لگتا ہے۔

—— مگر میرے لڑکپن میں گھر میں دو زبانیں زور شور سے بولی جاتی تھیں —— فارسی اور پنجابی! البتہ جب انگریز گھوڑیوں کے ملاحظہ کے لئے وزیر کوٹ آتے تو والد صاحب ان سے انگریزی میں باتیں کرتے اور ہم سب بچّے بڑے شوق سے ان کی گفتگو سُنتے۔ بعد ازاں ہم اپنے انگریز مہمانوں کی نقلیں اتارتے اور منہ ٹیڑھے کر کے انگریزی کے الفاظ بولتے "وِل وِل۔ ڈیم فول۔ آل رائٹ گو"!

۷

یوں تو لڑکپن کے یہ سارے دن ہنگامے اور شور شرابے کے ایام تھے اور ہم صبح سے شام تک ایک کبھی نہ ختم ہونے والی بھاگم دوڑ میں مصروف رہتے لیکن محرم کے ایام میں ہمارے تحرّک میں اضافہ ہو جاتا۔ ہم دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ محرم کا انتظار کرتے اور جب محرم آتا تو مجالس سُنتے، رباعیاں پڑھتے اور ذاکروں کے گرد گھومتے۔ میرے اکثر ہمجولی زور شور سے ماتم بھی کرتے مگر میں بہت شرمیلا تھا میرے لیے پبلک میں ماتم کرنا ممکن نہیں تھا۔ سو میں جب نہانے کے لئے غُسلخانے میں جاتا تو اندر سے کنڈی لگا کر زور شور سے ماتم کرتا۔ ایک روز میرے ماتم کی آواز سُن کر میری والدہ گھبرا گئیں مگر جب انھیں میری کارگزاری کا علم ہوا تو انھوں نے مجھے جھڑکا اور کہا کہ میں ماتمیوں کے ساتھ ماتم کروں مگر میں ایسا نہ کر سکا بس شرم محسوس ہوتی تھی البتہ محرم سے منسلک بعض دوسری باتوں میں میری شرکت بھرپور تھی ایک تو یہ کہ رات کو مٹّی کے تیل والے گیس روشن ہوتے تو —— ٹڈیاں، گھاس کے طوطے، پروانے، سانپ کی نانیاں اور کس کس قسم کے کیڑے گیس کی روشنی کی طرف کھنچے چلے آتے۔ ہم سب لڑکوں کے پاس شیشے کی

بوتلیں تھیں جن میں ہم ان پتنگوں، گھاس کے طوطوں وغیرہ کو پکڑ پکڑ جمع کرتے اور پھر دوسرے روز مقابلہ کرتے کہ کس نے زیادہ "جانور" پکڑے تھے۔ ہماری دوسری ہابی یہ تھی کہ ہم منبر کے پاس حضرت عباسؑ کے علم کے آگے رکھی چوکی پر نیز سبیل کے فرش پر جو موم بتیاں جلائی جاتیں، ان کا موم اکٹھا کرتے اور اس کا گولا سا بنا لیتے۔ پھر یہ گولا بڑا ہونے لگتا۔ دسویں محرّم کے بعد ہم میں سے ہر لڑکے کے پاس ٹینس کے بال سے لے کر فٹ بال تک ہر سائز کے گولے جمع ہو جاتے۔

محرّم کی طرح ہم شبِ برات کا بھی انتظار کرتے۔ گاؤں کا سکھ دکاندار اس موقعہ پر شہر سے پھُلجھڑیاں، پٹاخے، چکّر، ہوائیاں اور انار لے آتا اور ہم سال بھر کی جمع کی ہوئی پونجی آتش بازی پر خرچ کر دیتے۔ شام پڑتے ہی آتش بازی کے مقابلے ہوتے اور ایک دوسرے پر پٹاخے پھینکے جاتے۔ اس رات ہم میں سے شاید ہی کسی لڑکے کی قمیص جلنے سے بچ پاتی۔ اس کھیل میں بڑے بھی شامل ہوتے خاص طور پر ہمارے چُوہا تو پوری طرح اس میں شرکت کرتے۔ دراصل چُوہا ذہنی اور جذباتی طور پر لڑکپن کو عبور نہ کر سکے تھے۔ ساری زندگی وہ اس "مقدس مقام" پر ہی کھڑے رہے۔ ہمارے لئے شبِ برات ایک تو آتش بازی کی رات تھی دوسرے اس سے ایک انوکھا خوف بھی وابستہ تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس رات اگر کسی کو اپنے بدن کا سایہ بغیر سر کے نظر آئے تو اس کی خیر نہیں ہے۔ وہ سال بھر کے اندر اندر ضرور مر جائے گا۔ سو ہم اُس رات اپنے سائے سے خوف زدہ رہتے۔ کوشش کرتے کہ ہمیں اپنا سایہ دیکھنے کا اتفاق نہ ہو، ڈرتے کہیں بے سر کا سایہ نظر آ گیا تو کیا ہو گا۔ پھر جب اتفاقاً اپنے سائے پر نظر پڑ جاتی اور سائے کا سر سلامت دکھائی دیتا تو اندر کا سارا خوف کافور ہو جاتا اور ہم کھِل اُٹھتے۔

۸

ہمارے گاؤں میں ایک پرائمری سکول تھا جس میں مجھے داخل کرایا گیا۔ والد صاحب میرا ہاتھ پکڑے مجھے سکول ماسٹر کے پاس لے گئے اور پھر وہیں چھوڑ آئے۔ میں اس نئی صورتِ حال پر ابھی رونے کے لئے تیار ہو ہی رہا تھا کہ ماسٹر صاحب نے مجھے ایک رنگین پنسل عطا کی اور میرے

آنسو پلکوں کے پیچھے ہی خشک ہو گئے۔ اس پرائمری سکول کی صرف چند باتیں ہی مجھے یاد ہیں۔ ایک تو یہ کہ چھٹی سے ذرا پہلے ہمیں پہاڑے حفظ کرائے جاتے۔ ایک لڑکا سامنے کھڑا ہو کر زور زور سے "ایک دونی دونی، دو دونی چار" کا آوازہ لگاتا اور اس کے جواب میں سکول کے سارے لڑکے اپنی پوری قوت سے پہاڑے کو دہراتے۔ ہماری آوازوں میں ایک عجیب ساطنطنہ ہوتا جس میں فریقِ مخالف کی آواز پر سبقت لے جانے کی کوشش کے ساتھ سکول کی قید سے رہائی پانے کی مسرّت بھی شامل ہوتی۔ پھر جب پہاڑے ختم ہو جاتے تو ہم باڑے سے نکلی ہوئی بھیڑوں کی طرح خوشی کے نعرے لگاتے گھروں کی طرف چل دیتے۔ وزیر کوٹ کے اس پرائمری سکول سے وابستہ میری ایک یہ یاد بھی ہے کہ ایک روز نہر پر متعیّن ایک لڑکے نے زور کا نعرہ لگایا کہ انسپکٹر صاحب آ گئے! جسے سنتے ہی ہمارے سکول ماسٹر ہڑبڑا کر چارپائی سے اُٹھے اور کھونٹی پر سے اپنی شلوار اتار دوڑتے ہوئے سکول کی دیوار کے پیچھے چلے گئے اور پھر دو ہی منٹ بعد تہمد کے بجائے شلوار پہنے نمودار ہو گئے۔ ہمیں وہ بہت عجیب سے لگے کیونکہ اس سے پہلے ہم نے کبھی انہیں شلوار میں ملبوس نہیں دیکھا تھا۔ جب انسپکٹر صاحب معائنہ کے بعد سکول کے گیٹ سے باہر چلے گئے تو ماسٹر جی نے ایک منٹ ضائع کئے بغیر شلوار سے نجات حاصل کر کے دوبارہ تہمد باندھ لیا۔ پھر انھوں نے ایک لمبا آسودہ سانس لیا جیسے پنچھی کو پنجرے سے رہائی مل گئی ہو۔ ان کا یہ لمبا آسودہ سانس مجھے آج تک یاد ہے!

۹

میری زندگی میں سال ۱۹۳۲ء ایک موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس سال لاہور سے دو سیّد بھائی ایک طویل عرصے کے لئے ہمارے گاؤں میں آ کر رہے۔ بڑے شاہ صاحب سُرخ و سفید، دراز قد اور انتہائی وجیہہ تھے۔ بڑی بڑی سنہری مونچھیں تھیں جن کے کناروں کو وہ ہر وقت مڑورتے رہتے۔ دیسی لباس پہنتے اور شعر کہتے تھے۔ چھوٹے شاہ صاحب سُوکھے سڑے تھے، انگریزی لباس پہنتے، داڑھی مونچھ صاف! زیادہ تر انگریزی میں بات کرتے حتّٰی کہ اَن پڑھ

کسانوں کے ساتھ بھی گفتگو انگریزی میں کرتے گو ساتھ ساتھ اپنے ہر فقرے کا پنجابی میں ترجمہ بھی کرتے جاتے۔ دونوں شاہ صاحبان نہایت خوش گفتار تھے۔ برسوں بعد جب میں نے کالج میں مُغل ہسٹری کا مطالعہ کیا تو سیّد برادران کی صورت میں میری ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ تب میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ جس طرح سیّد برادران نے مُغل سلطنت کے مدوجزر میں بھرپور حصّہ لیا تھا۔ کچھ ایسے ہی شاہ صاحبان نے بھی ہمارے گھر کے معاملات میں دلچسپی لی۔ آگے چل کر ان کی اس دلچسپی کے نہایت دردناک نتائج برآمد ہوئے۔

شاہ صاحبان نے آتے ہی سب سے پہلے تو گاؤں کی سیاست میں حصّہ لیا۔ پھر گاؤں کی سماجی زندگی میں دخیل ہوئے۔ پھر یہ ہوا کہ انھوں نے ہمارے گھر کی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ہمارے گھر میں سیاست کا عمل انہیں کی وجہ سے شروع ہوا۔ وہ پہلے میرے بڑے بھائی کے دوست بنے۔ پھر ان کے مخالف ہو گئے۔ میرے بڑے بھائی زیادہ تعلیم یافتہ تو نہیں تھے مگر تجربہ کار ضرور تھے۔ جسمانی طور پر بہت مضبوط تھے اور لوگ ان سے خوف زدہ رہتے۔ دل کے بہت اچھے تھے۔ بچّوں سے انھیں بڑا پیار تھا۔ مجھے تو وہ بہت ہی پیار کرتے تھے۔ بیوی بچّوں پر جان چھڑکتے تھے۔ جب ان کی بیوی فوت ہوئی اور اپنے پیچھے چھ بچّے چھوڑ گئی تو بڑے بھائی نے جنھیں میں حاجو بھا کہتا تھا اپنی ساری توجہ اپنے بچّوں پر مرکوز کر دی اور عقدِ ثانی پر کبھی آمادہ نہ ہوئے۔ تاش کھیلنے کے شوقین تھے۔ اکثر گاؤں کے سکھ دُکاندار کی دُکان پر شرطیں لگا کر تاش کھیلتے۔ میرے والد کو ان کا تاش کھیلنا ناپسند تھا۔ ان کے کمرے میں سارا دن اودھم مچا رہتا کیونکہ وہ بچّوں کو ڈانٹتے نہیں تھے جب کہ میرے والد بچّوں کے معاملے میں نہایت سخت گیر تھے۔ چنانچہ جب ہم بڑے بھائی کے کمرے سے نکلتے تو انتہائی مؤدب اور سنجیدہ بن جاتے۔ مگر جب کمرے میں ہوتے تو ہم پر سے سارے نقاب اُتر جاتے اور ہم اپنے "اصل" کا مظاہرہ کرنے لگتے۔

۱۰

شاہ صاحبان کی آمد سے قبل ہمارے گھر میں معمولی سا تناؤ تو تھا لیکن دلوں کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں تھی۔ معمولی تناؤ تو ہر گھر میں ہوتا ہے کیونکہ جہاں برتن ایک جگہ جمع کر دئے جائیں

وہ ضرور کبھی نہ کبھی ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے۔ ہمارے گھر میں دو بیویوں کی اولاد ایک چھت کے نیچے رہ رہی تھی۔ معمولی سی چنگاری اس میں آگ لگا سکتی تھی اور یہ آگ شاہ صاحبان کی وجہ سے لگی۔ انھوں نے کبھی ایک اور کبھی دوسری پارٹی کا ساتھ دیا۔ مگر جب میرے بڑے بھائی صاحب سے ان کا جھگڑا ہوگیا تو وہ کھلم کھلا ہماری طرف آ گئے۔ والد صاحب نے بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو اعتدال پر لانے کے لئے بڑے شاہ صاحب کو وزیر کوٹ سے تقریباً سات میل دُور سکھوں کے ایک گاؤں (چک ۴۳ جنوبی) کے مڈل سکول میں ٹیچر لگوا دیا۔ دونوں بھائی اس مڈل سکول کے ہوسٹل میں منتقل ہو گئے مگر وزیر کوٹ میں ان کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اور وہ یہاں کی سیاست میں بدستور حصّہ لیتے رہے۔ شاہ صاحبان کی بدولت ہمارے گھر کا انجر پنجر تو ضرور ڈھیلا ہوا مگر میری زندگی سنور گئی۔ ہوا یہ کہ بڑے شاہ صاحب نے والد صاحب کو مشورہ دیا کہ چونکہ وزیر کوٹ میں کھیل کُود زیادہ اور تعلیم کا انتظام ناقص ہے اس لئے وہ مجھے ان کے حوالے کر دیں۔ والدہ کو مجھ سے بڑا پیار تھا اور وہ ایک لمحہ کے لئے بھی مجھے خود سے دُور کرنے پر رضامند نہیں تھیں۔ مگر والد صاحب اس معاملے میں اڑ گئے اور انھیں بادلِ نخواستہ مجھے خود سے جُدا کرنا پڑا۔ یہ بہت اچھا ہوا کیونکہ اگر مَیں وزیر کوٹ میں رہ جاتا تو دوسرے لڑکوں کی طرح مَیں بھی کبھی اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکتا۔ سو اس معاملہ میں مَیں شاہ صاحب کا احسان مند ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔

بہرحال مَیں چند ہی روز کے اندر اندر وزیر کوٹ سے چک ۴۳ جنوبی کے سکول ہوسٹل میں منتقل ہو گیا۔ ہوسٹل کیا تھا۔ گاؤں سے ایک فرلانگ دُور ایک ویرانے میں دو کمروں کی ایک عمارت تھی۔ رفعِ حاجت کے لئے ہمیں ہوسٹل سے دُور کماد، مکّی یا کپاس کے کھیتوں میں جانا پڑتا۔ صحن میں ایک ہینڈ پمپ نصب تھا جس کے نیچے بیٹھ کر ہم غُسل کرتے۔ ہمارا کھانا ایک نوجوان فضل شاہ پکاتے تھے۔ ماش کی دال پکانے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ جب وہ اس سے فارغ ہو کر چولھے پر توا ڈالتے اور چپاتیاں پکانے لگتے تو ہم تینوں ان کے پاس بیٹھ جاتے اور توے سے اُترنے والی ہر گرم چپاتی پر جھپٹ پڑتے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں بانٹ لیتے اور دال میں بھگو کر کھانے لگتے۔ پھر دوسری چپاتی کا انتظار شروع ہو جاتا۔ بعد کی زندگی میں مجھے ہزاروں دعوتوں میں شریک ہونے کا موقع ملا اور

چینی، انگریزی، ہندوستانی ہر قسم کے کھانے کھائے مگر جو لطف فضل شاہ کی دال اور چپاتیوں میں تھا وہ پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ پچھلے برس تک فضل شاہ صاحب سال میں دو بار مجھے ملنے وزیر کوٹ آتے رہے ہیں۔ وہ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں مگر آج بھی جب وہ نظر آتے ہیں تو میری آنکھوں کے سامنے ان کی دال اور چپاتیاں آ جاتی ہیں اور میرے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔

(۱۱)

بڑے شاہ صاحب کو ادب سے لگاؤ تھا۔ غزل بھی کہتے تھے جب نئی غزل کہتے تو سکول کے اساتذہ کو سناتے۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب بزرگ آدمی تھے ان کے گھر میں دو جوان کنواری بیٹیاں تھیں جن کے مستقبل کے بارے میں وہ فکرمند رہتے۔ شاہ صاحب کی شاعری کے وہ سب سے زیادہ قدردان تھے اور ان کی غزل کے ہر شعر پر اچھل اچھل کر داد دیتے تھے مگر شاہ صاحب کے لئے یہ چھوٹا سا حلقہ ناکافی تھا۔ چنانچہ وہ اپنی غزل کے دائرۂ اثر کو بڑھانے کے لئے گاؤں کے سکھ جاٹوں کے پاس بھی جانے لگے۔ داد وہ بھی دیتے تھے مگر مختلف انداز میں۔ مثلاً وہ غزل کا شعر سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور بلّے بلّے کا شور مچانے لگتے۔ شاہ صاحب کے پاس "نیرنگِ خیال" بھی آتا تھا۔ اُن دنوں اس میں امتیاز علی تاج کا "چچا چھکن" بالاقساط چھپ رہا تھا۔ بڑے شاہ صاحب ہم دو تین لڑکوں، فضل شاہ اور چھوٹے شاہ صاحب کو بٹھا کر "چچا چھکن" سناتے خود بھی ہنستے، ہمیں بھی ہنساتے۔ پھر میں خود بھی نیرنگِ خیال پڑھنے لگا۔ اور چچا چھکن کے علاوہ دوسری چیزوں کو "سونگھنے" لگا۔ اسی دوران شاہ صاحب نے مجھے غزلیں اور نظمیں حفظ کرانا شروع کیں۔ علاوہ ازیں وہ مجھ سے میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے پڑھواتے اور مجالس میں مجھے مرثیے پڑھنے کی مشق کراتے اس سے مجھے دو فائدے پہنچے ایک تو یہ کہ میں شعری آہنگ کو پہچاننے لگا اور اس بات نے مجھے آگے چل کر شعر کہنے کی ترغیب دی۔ دوسرے مجالس میں مرثیہ پڑھنے سے میری وہ فطری جھجک بھی کم ہوئی جس نے مجھے اپنی ذات سے باہر آنے کی اجازت نہ دی تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس مہم کے باعث میں اپنی فطری جھجک پر غالب آ گیا۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ میں زندگی بھر اس سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکا۔ آج

بھی یہ حالت ہے کہ دو تین دوستوں کی موجودگی میں تو بے تکلفی کا مظاہرہ کرسکتا ہوں اور کرتا ہوں لیکن جیسے ہی احباب کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے میرے اندر خود میں سمٹنے کا رویہ توانا ہوجاتا ہے اور مَیں بھری محفل میں تنہا ہوجاتا ہوں۔ بہرحال بڑے شاہ صاحب کا مجھ پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے مجھے وزیرکوٹ کی جامد اور ٹھہری ہوئی فضا سے باہر نکالا۔ مجھ میں حصولِ علم کی لگن پیدا کی۔ میرے ادبی ذوق کو سنوارا اور نکھارا اور سب سے بڑی بات یہ کہ مجھے مستقبل کی گھناؤنی صورت دکھائی اور مجھے یہ احساس دلایا کہ مَیں اپنی بہن اور والدہ کا واحد سہارا ہوں اور اگر مَیں نے تعلیم حاصل نہ کی تو والد کی وفات کے بعد میری والدہ اور بہن "دشمنوں" میں گھِر جائیں گی اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوگا۔

۱۲

اُن ہی دنوں کی بات ہے۔ میں غالباً چھٹی جماعت کا طالب علم تھا اور گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے وزیرکوٹ آیا ہوا تھا کہ ایک روز شاعری کی دیوی کا آنچل مجھ سے مَس ہوا۔ ہوا یہ کہ مَیں حویلی کے دروازے میں کھڑا تھا کہ یکایک ایک عجیب سے آہنگ نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا ــــــ بالکل جیسے باز یا شکرا چڑیا کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیتا ہے اس وقت میری عمر بارہ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ بلوغت کے آثار نظر آرہے تھے لیکن یہ بلوغت ابھی جسم پر نمودار نہیں ہوئی تھی بلکہ اندر سے ٹھونگیں مارنے لگی تھی۔ یقیناً شعری آہنگ کا رگوں اور شریانوں میں چھلکتے بولتے ہوئے لہو سے کوئی گہرا تعلق ہے۔ بچپن میں جب یہ لہو ابھی گرم نہیں ہوتا اور بڑھاپے میں جب یہ لہو ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو شعری آہنگ سے تعارف حاصل نہیں ہوتا۔ ممکن ہے لہو کے مدوجزر ہی کا دوسرا نام شعری آہنگ ہو اور یہ شعری آہنگ اپنے اظہار کے لئے انسان کی شخصیت کو استعمال کرنے کا عادی ہو۔ اگر وہ ہاتھ کی انگلیوں میں مرتکز ہوجائے تو انسان کو مصوّر یا بُت تراش بنا دے، گلے میں بولنے لگے تو وہ موسیقار بن جائے اور زبان کی نوک سے ٹپکنے لگے تو وہ شاعر قرار پائے۔ یہی شعری آہنگ ہزار دوسرے پیکروں میں بھی سما سکتا ہے۔ میرے معاملے میں اس نے نوکِ زبان سے ٹپکنا مناسب سمجھا۔ چنانچہ میں حویلی کے صدر دروازے کی دہلیز میں کھڑے ہو کر تُک بندی کرنے

لگا۔ یعنی زبان نثر کے بجائے شاعری میں باتیں کرنے لگی۔ جب کوئی پرندہ اُڑتا یا درخت کی شاخیں ہلتیں یا کوئی کتا گزرتا یا ویسے ہی نظر آسمان پر، گھر کی منڈیر پر، صحن میں بکھری اینٹوں اور مرغیوں اور بکریوں پر پڑتی تو میں اپنے "خیالاتِ عالیہ" کو شعر کے پیمانے میں ڈھال دیتا۔ ساتھ ساتھ یہ اشعار گرم توے پر گرنے والی گھی کی بوندوں کی طرح ذہن سے غائب بھی ہوتے جاتے۔ تاہم ایک شعر ذہن کے ساتھ چپک سا گیا اور مجھے آج تک یاد ہے۔ ہوا یہ کہ باہر مردانے سے میرا بھتیجا نثار آیا اور اندر زنانے میں چلا گیا۔ پھر چند ہی لمحوں میں باہر آ گیا۔ جب وہ اندر گیا تو سر سے ننگا تھا، باہر آیا تو اس کے سر پر ٹوپی تھی جب وہ میرے قریب سے گزرا تو میرے شعری آہنگ کی لپیٹ میں تھا۔ دوسرے ہی لمحے میری زبان سے نکلا:

ابھی سر برہنہ تھا مسٹر نثار
ابھی سر پہ ٹوپی رکھے آ گیا

یہ گویا میری شاعری کی ابتدا تھی مگر عجیب بات یہ ہے کہ میرے قریب سے شاعری کی دیوی کا دوسری بار گزر اس واقعہ کے پورے ساٹھ برس بعد ہوا۔ اس وقت میں گورنمنٹ کالج لاہور میں طالب علم تھا۔

(۱۳)

چک ۴۳ جنوبی کے مڈل سکول کا میں ایک "لاڈلا" طالب علم تھا۔ شاہ صاحب سے سکول کے بیشتر اساتذہ اور طلبا مرعوب بلکہ خوف زدہ تھے لہٰذا میں کہ شاہ صاحب کے "زیرِ سایہ" تھا، ایک ترجیحی سلوک کا حق دار قرار پایا۔ مگر اس ترجیحی سلوک نے مجھ پر کوئی ناگوار اثرات مرتب نہ کئے جیسا کہ لاڈ پیار کی زد میں آنے والوں پر عام طور سے مرتسم ہو جاتے ہیں۔ میں نہایت مؤدب، کم گو اور شرمیلا تھا ——— اس قدر کہ سکول کی سالانہ تقریبِ انعامات میں مجھے "خاموشی" کا انعام ملا۔ اب سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ بہت بُرا ہوا کیونکہ خاموش رہنے کا انعام پا کر میں نے سوچا کہ یہ کوئی بہت بڑا وصف ہے۔ چنانچہ میں مزید "خاموش" ہو گیا اور میری فطری جھجک مجھے خاموش پا کر مزید دلیر ہو گئی۔ میں دوسرے مضامین کے سلسلے میں تو لائق

طلبا میں گنا جاتا تھا مگر ریاضی کے معاملے میں بالکل صفر تھا۔ ریاضی کا کوئی بھی سوال میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بعد ازاں جب میں نے میٹرک کا امتحان دیا تو الجبرے اور اقلیدس میں اچھے نمبر لئے لیکن ریاضی میں بمشکل پاس ہو سکا۔ بڑے شاہ صاحب خود بھی ریاضی کو ناپسند کرتے تھے۔ شاید اس لئے کہ انھیں اپنی عام زندگی میں اس کی کم ہی ضرورت پیش آتی تھی۔ ان کی تنخواہ اٹھائیس روپے ماہوار تھی اور اس رقم کا حساب رکھنا کچھ ایسا مشکل نہ تھا۔ البتہ انھوں نے مجھے انگریزی اور اُردو میں طاق کر دیا تھا۔ اس قدر کہ میں چھٹی جماعت کا طالب علم ہونے کے باوجود ساتویں جماعت والوں سے مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس صورت حال سے خوش ہو کر بڑے شاہ صاحب نے مجھے ایک ہی سال میں چھٹی اور ساتویں کے امتحان دلا کر آٹھویں جماعت میں داخل کرا دیا اور یہیں سے میری مشکلات کا آغاز ہوا کیونکہ میں کلاس کے نامور طلبا کے بجائے اوسط درجے کے طلبا کی سطح پر آ گیا۔ ممکن ہے بڑے شاہ صاحب کی توجہ سے میں اپنی کھوئی ہوئی ایاقت دوبارہ حاصل کر لیتا لیکن خود شاہ صاحب کی زندگی میں ایک موڑ آ گیا تھا اور ان کی توجہ غمِ دوراں سے ہٹ کر غمِ جاناں پر مرکوز ہونے لگی تھی جس کے نتیجے میں میری تعلیم کو سخت دھچکا لگا۔

ہوا یہ کہ انہی دنوں شاہ صاحب کی شادی ہو گئی اور شادی کے ساتھ تبادلہ بھی۔ اس بار انھیں وزیر کوٹ سے تقریباً بیس میل دُور سلانوالی ہائی سکول میں بھیج دیا گیا۔ میری بدقسمتی کہ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ ہی سلانوالی لے گئے۔

(۱۴)

اُن دنوں سلانوالی ایک بالکل چھوٹا سا قصبہ تھا جس کی وجۂ شہرت اس کی اناج کی منڈی تھی۔ جس پر ہندو بنیوں کا قبضہ تھا۔ میرے لئے گاؤں سے قصبہ میں آنا ایک انوکھا تجربہ تھا۔ ایک تو اس لئے کہ وہاں مجھے بھانت بھانت کے لوگوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ دوسرے اس لئے کہ ہندوؤں کا شہر ہونے کے باعث وہاں تہوار، مثلاً ہولی، بیساکھی، دیوالی اور دسہرہ بڑے زور شور سے منائے جاتے۔ بالخصوص رام لیلا کے ڈراموں کو نیز بیل گاڑیوں

پر نکالے گئے۔ جلوس کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ دسہرے کے موقع پر راون کے بُت کو آگ لگانے اور پٹاخوں کے چلنے کا منظر بھی مجھے بہت اچھا لگا۔ گویا یہ شب برات کی آتش بازی ہی کا ایک نیا رُوپ تھا۔ تیسرے اس لئے کہ وہاں مجھے پہلی بار تنہائی کے شدید کرب سے گزرنا پڑا۔ شاعری کی دیوی کی طرح تنہائی کی دیوی سے بھی یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ بعد ازاں ان دونوں دیویوں سے میری بار بار ملاقات ہوئی۔ بلکہ آخر آخر میں تو ہم ایک ہی چھت کے نیچے رہنے لگے مگر اس کا ذکر بعد میں کروں گا۔

تنہائی کے کرب سے آشنائی مجھے اس شدید علالت کے دوران ہوئی جس کے باعث میرا سلانوالی کا قیام اختتام کو پہنچا۔ شاہ صاحبان (دونوں کی ایک ساتھ شادی ہوئی تھی) اپنی اپنی دردپدی میں اس قدر کھو گئے تھے کہ انہیں اردگرد کا ہوش نہیں رہا تھا۔ ہمیں رہنے کے لئے جو مکان ملا تھا وہ دراصل ایک ہندو آڑھتی کا گودام تھا۔ درمیان میں صحن تھا جس کے چاروں طرف چھ کمرے تھے۔ تین کمرے گندم کی بوریوں اور ان کی رکھوالی کرنے والے چوہوں کے قبضے میں تھے۔ ایک کمرہ بڑے شاہ صاحب اور ان کی بیگم کی تحویل میں تھا۔ پانچویں پر چھوٹے شاہ صاحب قابض تھے۔ آخری کمرے میں میں اور شاہ صاحبان کے دو سالے قیام پذیر تھے۔ شاہ صاحب کے یہ دونوں سالے لاہور ایسے بڑے شہر سے ایک چھوٹے سے قصبے میں نازل ہوئے تھے۔ لہٰذا بیحد نامطمئن تھے۔ گھر پر ان کا قیام مختصر ہوتا۔ سکول سے چھٹی ملنے کے بعد قصبے میں بکھر جاتے۔ وہیں انھوں نے دوستیاں بنائیں اور توڑیں اور یوں سلانوالی شہر کے اندر لاہور کا ایک مختصر رُوپ دریافت کر لیا۔ مگر میں گاؤں سے آیا تھا مجھے قصبہ اور ان کے باسیوں کے طور اطوار اچھے نہ لگتے تھے۔ لہٰذا میں ان سے الگ تھلگ رہنے لگا۔ سلانوالی میں میرا قیام کم و بیش ایک سال پر محیط تھا۔ بہت سی باتیں تو ذہن سے محو ہو چکی ہیں۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ میں آخر آخر میں بیمار پڑ گیا تھا۔ گھر سے باہر سڑک کے کنارے شیشم کے ایک درخت کے نیچے میرے لئے چارپائی بچھا دی گئی تھی جس پر میں سارا دن تنہا بخار میں جلتا رہتا۔ ڈاکٹری علاج کے بجائے کسی پیر صاحب سے ایک تعویذ حاصل کر کے میرے گلے میں ڈال دیا گیا تھا۔ شام کے قریب بڑے شاہ صاحب آتے اور میری چارپائی اٹھوا کر گھر کے اندر لے جاتے۔ شُدہ شُدہ میری علالت کی خبر ہمارے گاؤں میں پہنچ

گئی۔ میری ماں نے جب سُنا کہ میں بیمار ہوں اور کس مپرسی کے عالم میں سڑک کنارے پڑا ہوں تو انہوں نے قیامت برپا کر دی۔ سو والد صاحب نے اپنا منشی روانہ کیا۔ اور وہ مجھے سلانوالی سے وزیر کوٹ لے آیا۔ اس کے بعد شاہ صاحبان کے سائۂ عاطفت میں رہنے کا پھر مجھے اتفاق نہ ہوا۔ البتہ بڑے شاہ صاحب سے زندگی میں پھر کہیں نہ کہیں ملاقات ہوتی رہی۔ میرے دل میں ان کا احترام آج تک باقی ہے۔

۱۵

میں اب نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ میرے چچا آغا برکت علی خاں منٹگمری (ساہیوال) میں وکالت کرتے تھے۔ انھوں نے میرے والد سے کہا کہ وہ مجھے ان کے پاس منٹگمری بھیج دیں تاکہ میری تعلیم بہتر طریق سے ہو سکے۔ سو میں ایک چلچلاتی دوپہر کو ان کے ہاں وارد ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر میرے چچا چچی اور ان کے دونوں بڑے صاحبزادے کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ اس ہنسی میں خوشی کے علاوہ "لطف لینے" کا رویہّ بھی شامل تھا۔ وجہ یہ کہ میرا حلیہ انتہائی مضحکہ خیز تھا۔ لدھیانے کی قمیص جس پر کالی روشنائی کے داغ تھے۔ سر پر سولا ہیٹ جس میں جا بجا نشیب و فراز تھے۔ خاکی رنگ کی نیکر جو گھٹنوں تک لٹکی ہوئی تھی۔ پاؤں میں اپنے گاؤں کے موچی کی تیار کردہ لش لش کرتی جوتی!____ غالباً میرے ہیٹ کی مناسبت سے میرے چچا جان نے مجھے دیکھتے ہی "ہاؤ ڈو یو ڈو" کے فلک شگاف نعرے سے میرا سواگت کیا اور پھر مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ میں نے فوراً دونوں ہاتھوں سے اپنے "قیمتی" ہیٹ کو سنبھالا تاکہ اس معانقے میں اس پر کوئی کاری ضرب نہ لگ جائے۔ میری اس حرکت پر تو گویا قہقہوں کی جوالا پھٹ پڑی اور میں اس جوالا کا سامنا نہ کر سکا۔ میں نے آنکھیں جھکا لیں اور ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ اس وقت میں نے چچا جان اور ان کے خاندان کی سماجی اور ذہنی برتری کے مقابلے میں خود کو ایک بے توقیر اور اجڈ سا دیہاتی محسوس کیا۔ ایک عجیب سا احساسِ کمتری تھا۔ میں چچا جان کے پاس پورا ایک سال رہا مگر اس احساسِ کمتری سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکا۔

(۱۴)

نجانے کیوں لیکن چچا جان نے مجھے گورنمنٹ سکول میں داخل کرانے کے بجائے ہندوؤں کے ایک سکول (اب یاد نہیں کہ وہ ایس ڈی سکول تھا یا ڈی اے وی سکول) میں داخل کرا دیا۔ غالباً اس سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب سے ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ اور اپنے خاندان کے ایک "جوہرِ قابل" کو ان کی تحویل میں دے کر حقِ دوستی ادا کر رہے تھے مگر میں تو بمشکل ایک اوسط درجے کا طالب علم تھا۔ لہٰذا وہ توقّعات جو ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھ سے وابستہ کر رکھی تھیں بہت جلد فسخ ہو گئیں۔ مجھے والد صاحب کی فرمائش پر سائنس کا مضمون لینے پر مجبور کیا گیا۔ مگر ان دنوں مجھے سائنس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ کالج میں بھی میں سائنس سے دُور دُور ہی رہا۔ البتہ کالج سے فارغ ہونے کے بعد طبیعات اور فلکیات، حیاتیات اور دوسرے سائنسی علوم مجھے بہت اچھے لگے اور میں وقتاً فوقتاً ان کا مطالعہ کرتا رہا اور آج بھی کرتا ہوں (گو یہ مطالعہ محض ایک LAY MAN کا مطالعہ ہے) چنانچہ نویں جماعت میں جب مجھے سکول کی لیبارٹری میں کیمسٹری کے تجربات کرنے پڑے اور مختلف گیسوں کی بُو نے مجھے بدحال کر دیا تو میں نے چچا جان سے استدعا کی کہ مجھے سائنس کے مضمون سے نجات دلائی جائے۔ پہلے تو چچا جان رضامند نہ ہوئے مگر پھر میری بے بسی کو دیکھ کر ان کے دل میں رحم کی چنگاری سُلگ اُٹھی اور میں سائنس کے بجائے آرٹ کا طالب علم بن گیا۔ سائنس کے مضمون میں میری واقفیت SUBLIMATION سے آگے نہ تھی اور SUBLIMATION کی جو تعریف مجھے رٹائی گئی وہ یہ تھی: SUBLIMATION IS A PROCESS IN WHICH THINGS DO NOT MELT BUT PASS INTO VAPOURS

حقیقت یہ ہے کہ سائنس تو میں نے ترک کر دی لیکن خود کو SUBLIMATION کے عمل سے ضرور گزارا۔ جب مجھے سائنس کے بجائے اُردو کی کلاس میں بٹھا دیا گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ہَوا کی طرح سبک اور ہلکا ہو گیا ہوں اور ہر دم پگھلنے کی کیفیّت سے مجھے نجات مل گئی ہے — میری خوشی میں ایک بہت بڑا ہاتھ ہمارے ایک پنڈت استاد کا بھی تھا۔ پنڈت جی کو شرد تسلیم

ہیں ڈھلی ہوئی زبان میں گفتگو کرتے ۔ بلا کا حافظہ پایا تھا ۔ ہزاروں اُردو شاعر انھیں زبانی یاد تھے ۔ ان کا نام تو مجھے یاد نہیں لیکن ان کا رُخ وسپید چہرہ اور ان کے ہونٹوں پر کندہ ایک نرم ملائم مسکراہٹ مجھے آج بھی یاد ہے ۔ چونکہ مجھے شعر پڑھنے کی تربیت پہلے سے حاصل تھی ۔ اس لئے میں جلد ہی پنڈت جی کی نظرِ التفات کے باعث اُردو کلاس کا مانیٹر بنا دیا گیا اور میرے لئے اُردو ادب سے براہِ راست متعارف ہونے کا راستہ کھل گیا ۔ مگر اُردو کلاس کی حیثیت تو سکول کے اُس سمندر میں محض ایک جزیرے کی سی تھی جس میں ہندی، سنسکرت اور انگریزی کی کف آلود موجوں کا زور تھا ۔ میں جس سیکشن میں داخل تھا اس میں میرے علاوہ صرف دو اور مسلمان طالب علم تھے اور ہم تینوں کو باقی طلبا نے "شودر" کا درجہ دے رکھا تھا ۔ سکول کا آغاز سنسکرت کے اشلوکوں سے ہوتا ۔ یہ گویا سکول کی "دُعا" تھی جسے سب لڑکے یک زبان ہو کر آوازِ بلند پڑھتے ۔ اس ساری قرأت کے دوران سکول کے مسلمان لڑکے خاموش رہتے لیکن اشلوک کانوں کے راستے ان کے اندر اترتے رہتے آخر آخر میں ہمیں یہ اشلوک یاد ہو گئے لیکن بالکل غلط سلط انداز میں ۔ میں جب ایم اے کا طالب علم تھا تو ایک روز میں نے اپنے ایک ہندو دوست کو (جو کشمیر کے پنڈت تھے) ان میں سے ایک اشلوک سُنایا تو پہلے تو انھوں نے مجھے حیرت سے دیکھا ۔ پھر ہنسنے لگے اور ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے ۔ کہنے لگے یہ کوئی اشلوک وشلوک نہیں ہے ۔ یہ تو کسی جناتی زبان کا جنتر منتر ہے ۔

(۱۷)

اب یہ تو مجھے یاد نہیں کہ کن وجوہ کی بنا پر میرا منٹگمری کا قیام اپنے انجام کو پہنچا ۔ یقیناً اس کے پس منظر میں کسی خاندانی چپقلش کا کوئی ہاتھ نہ تھا اور نہ مَیں نے ہی اس "بن باس" پر کوئی احتجاج کیا تھا ۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اُن دنوں گرمی کی چھٹیوں میں میری خالہ کی اکلوتی نوجوان بیٹی منوّر ایک دن کی علالت کے بعد اچانک فوت ہو گئی اور گھر میں کہرام برپا ہو گیا ۔ پھر آہستہ آہستہ گھر پر ایک عجیب سا کرب انگیز سنّاٹا مُسلط ہوتا چلا گیا ۔ میری ماں کو بہت سے اندیشوں نے گھیر لیا ۔ اور وہ اپنے بچّوں کی صحت اور ان کے مستقبل کے بارے میں ضرورت سے زیادہ متفکر رہنے لگیں ۔ میرا خیال ہے کہ ماں نے والد سے کہا ہو گا کہ ان کے لئے بیٹے کی جدائی ناقابلِ برداشت

ہے۔ اسے بلا وجہ کالے کوسوں دُور بھجوا دیا گیا ہے۔ جہاں بقول میری ماں اُس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے۔ یہ اور اسی قسم کی باتیں ہوا میں موجود تھیں۔ اور کبھی کبھی ان میں سے ایک آدھ میرے کانوں میں ٹپکتی رہی تھی مگر اصل ڈرامے کا مجھے کوئی علم نہیں۔ ڈراما یقیناً ہوا ہوگا کیونکہ میرے والد کا یہ مُوقف تھا کہ والدہ کا لاڈ پیار بچے کی تعلیم پر غلط اثرات مرتسم کرتا ہے جب کہ میری والدہ کا مُوقف یہ تھا کہ ماں سے دُور ہو کر بچے کی شخصیت ادھوری رہ جاتی ہے یوں لگتا ہے جیسے بڑوں کی اس شورانگیز جنیوا کانفرنس میں میری ماں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ چنانچہ مجھے منٹگمری سے واپس بلا کر سرگودھا کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل کرا دیا گیا جہاں سے میں نے ۱۹۳۷ میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

۱۸

منٹگمری سے واپس آ کر میں بمشکل ایک سال سرگودھا میں مقیم رہا۔ بالکل خواب سا لگتا ہے۔ اس عرصۂ قیام کی بیشتر یادیں تو دُھندلا چکی ہیں۔ بس ایک یاد باقی ہے۔ ہمارے ریاضی کے اُستاد ایک لالہ جی تھے۔ ٹھگنے قد کے بھاری بھرکم آدمی تھے۔ سر پر پگڑی اور چہرے پر مونچھیں تھیں۔ ان کی آواز کرخت اور طلبا سے ان کا رویّہ انتہائی درشت تھا۔ میرے لئے ان کا پیریڈ بوجوہ صبر آزما ہوتا اور میں ہمہ وقت اپنی بے آواز صدا میں ان کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کرتا رہتا مگر پھر ایک روز ان کی شخصیت کا اصل رُوپ مجھ پر منکشف ہوا تو میں حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔ ہُوا یہ کہ جب ہمیں میٹرک کے امتحان کی تیاری کے لیے آزاد کر دیا گیا تو لالہ جی نے ہمیں بتایا کہ انہوں نے ہمارے لئے ریاضی کے پرچے تیار کر کے چھپوا لئے ہیں اور اگر پرماتما کو منظور ہوا تو میٹرک کا ریاضی کا پرچہ انہیں پرچوں میں سے آئے گا۔ کہا کہ ہم میں سے ہر لڑکا ہر صبح ان کے پاس آ کر اپنے حصّے کا پرچہ لے جایا کرے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس طرح لڑکوں سے اپنا رابطہ قائم رکھنے کے آرزومند تھے اور انہیں "رخصت" کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس کا ثبوت مجھے اُس روز ملا جب میں ان سے آخری پرچہ لینے گیا۔ پرچہ مجھے دے کر گلوگیر آواز میں بولے: "کاکا! یہ آخری ASSIGNMENT ہے"! میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو ہی آنسو تھے۔

اور کچھ آنسو اُن کے گالوں پر بھی لڑھک آئے تھے۔ بعدازاں دوسرے ہم جماعتوں نے مجھے بتایا کہ اسی تجربے سے وہ بھی گزرے ہیں۔ آج نصف صدی گزرنے کے بعد جب بھی میں اپنی آنکھیں میچتا ہوں تو مجھے لالہ جی کا آنسوؤں میں تر چہرہ صاف نظر آجاتا ہے۔ اپنے شاگردوں سے محبت کرنے والا ایسا انسان مجھے پھر کہیں نظر نہیں آیا۔

(۱۹)

میٹرک کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد میں کچھ عرصہ کے لئے وزیر کوٹ چلا گیا۔ سر سے بوجھ اُتر چکا تھا اور میں خود کو ہوا کے ایک جھونکے کی طرح آزاد محسوس کر رہا تھا۔ چند روز تو گھر کے اندر تاش اور کیرم کھیلنے اور بڑے بھائی کے کمرے میں اپنے ہم عمر بھتیجوں اور بھتیجیوں کے ساتھ گپیں لگانے میں صرف ہوئے مگر پھر میرے اندر کا اوڈیسس بے قرار ہو گیا اور میں زیادہ عرصہ گھر سے باہر گزارنے لگا۔ پہلے تو میں اپنے بچپن کے دوستوں سے ملا مگر جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ میرے اور ان کے درمیان اب کوئی قدرِ مشترک باقی نہیں تھی۔ میں تعلیم حاصل کر کے میٹرک تک جا پہنچا تھا جب کہ وہ اَن پڑھ رہ گئے تھے اور اب کھیتوں میں محنت مزدوری کرنے لگے تھے۔ مگر میں نے دیکھا کہ ان کے چہروں پر نیز ان کی باتوں میں بڑی پختگی آ گئی تھی۔ زندگی سے براہِ راست متصادم ہونے کے باعث ان کے ہاں بچپن کا کھلنڈرا پن اور معصومیت باقی نہیں رہی تھی۔ کئی ایک کی تو شادی بھی ہو چکی تھی۔ مجھے وہ ایک بالکل نئی مخلوق نظر آئے اور میرا ان سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ اب میں کیا کرتا۔ گھر کے اندر مجھے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا اور باہر تنہائی تھی۔ اور پھر اچانک میں نے اس "تنہائی" پر غلبہ حاصل کر لیا۔ ہوا یہ کہ میں نے بڑے بھائی کی بندوق ان سے چند روز کے لئے عاریتاً لے لی اور پرندوں کا شکار شروع کر دیا۔ اُن دنوں کارتوس بہت سستے تھے مگر ہمارے لئے پھر بھی مہنگے تھے۔ لہٰذا بڑے بھائی صاحب نے ایک چھوٹی سی مشین اور کارتوس بنانے کا سامان پچاس روپے میں خرید لیا تھا اور اب وہ اپنے لئے خود ہی کارتوس بنا لیتے تھے۔ میں نے چند روز انہیں کارتوس بناتے ہوئے

دیکھا تو پھر خود بھی کارتوس بنانے لگا ۔ یہ کارتوس قطعاً ناقابلِ اعتبار تھے۔ آدھے سے زیادہ مِس (MISS) ہو جاتے تھے۔ بعد ازاں دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں جب بارود ملنا بند ہو گیا تو ہم چینی پیس کر کارتوسوں میں بھر لیتے تھے ۔ یہ کارتوس بھی آدھے سے زیادہ مِس ہو جاتے تھے۔ مگر شکار کا شوق بہر حال پورا ہو جاتا تھا۔ مگر ذکر میٹرک کے امتحان کے فوراً بعد کا ہے مجھے بندوق چلانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اور بندوق چلانے سے مجھے خوف بھی آتا تھا کیونکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ جب بندوق چلتی ہے تو کارتوس کے چھرّے تو آگے کو جاتے ہیں مگر بندوق کا دستہ پیچھے کی طرف آتا ہے اور بعض اوقات بندوق چلانے والے کے شانے کو توڑ کر رکھ دیتا ہے ۔ مگر شکار کا شوق اس قدر تھا کہ میں نے یہ خطرہ مول لینے کا ارادہ کر لیا گو حفظِ ماتقدم کے طور فائر کرنے کے لئے پہلا کارتوس خود ہی "مرتّب" کیا۔ مَیں نے اس کارتوس میں کم سے کم چھرّے اور بارود ڈالا تاکہ دھچکا بھی کم سے کم لگے ۔ پھر مَیں نے بندوق کی نالی ایک درخت کی شاخ پر پوری طرح جما کر اور کھیت میں بیٹھی ہوئی فاختہ کو نشانہ بنا کر بندوق کی لبلبی دبا دی۔ بالکل معمولی سا جھٹکا لگا ______

مگر دوسری طرف فاختہ بیچاری زمین پر ہی ڈھیر ہو گئی ۔ بیک وقت میرے سینے میں کئی طرح کے جذبات کروٹیں لینے لگے ۔ ایک تو خوشی تھی کہ مَیں نے وہ کام کیا جو صرف بڑے کر سکتے تھے ۔ دوسرے یہ دُکھ کہ مَیں نے کسی کی جان لے لی تھی۔ ایک لمحہ پہلے فاختہ تمام تفکرّات سے آزاد کھیت میں ٹہل ٹہل کر دانہ دنکا چُگ رہی تھی دوسرے لمحے وہ محض ایک مُشتِ پَر تھی ۔ مگر ندامت کے احساس پر جذبۂ افتخار جلد ہی غالب آ گیا اور مَیں ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے میں فاختہ کی لاش اُٹھائے گاؤں بھر سے "حُسنِ کارکردگی" کی داد سمیٹتا پھرا ۔ بڑے بھائی صاحب نے خاص طور پر بہت شاباش دی مگر میری ماں کی آنکھیں بھیگ گئیں کہنے لگیں: "یہ تم نے اچھا نہیں کیا!"

(۲۰)

جب میٹرک کا نتیجہ نکلا تو مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ مَیں نے توقّع سے

زیادہ نمبر حاصل کئے تھے۔ کم از کم یہ نمبر میرے ہم جماعت بھتیجے نادر علی سے کہیں زیادہ تھے۔ نادر مجھ سے عمر میں پانچ سال بڑا تھا۔ لیکن باپ کی آنکھ کا تارا، خوش شکل اور انتہائی صحت مند ہونے کے باعث اس کی دلچسپیاں تعلیم میں کم اور دوسری باتوں میں زیادہ تھیں۔ تعلیم کے میدان میں وہ تعجیل وشتاب کو کارِ شیطان سمجھتا تھا۔ اس لئے ہر جماعت میں کم از کم دو سال صرف کرتا۔ میں جب پہلی جماعت میں داخل ہوا تو وہ پانچویں میں تھا۔ دسویں تک پہنچتے پہنچتے ہم دونوں ہم جماعت ہو چکے تھے۔ اس کے بعد جب میرے والد نے مجھے گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج جھنگ میں داخل کرایا تو نادر بھی میرے ساتھ ہی اس کالج میں داخل ہوا۔ وہاں بھی تعلیم سے کہیں زیادہ اسے کھیل کود میں دلچسپی تھی۔ وہ فٹ بال کا اچھا کھلاڑی تھا، گولہ بھی کالج میں سب سے زیادہ پھینکتا۔ اس کے بدن پر ہر لباس خوب سجتا تھا۔ جب بازار میں نکلتا تو سرگوشیاں" ہونے لگتیں۔ البتہ جب کلاس میں ہوتا تو سب سے پچھلے بنچ پر بیٹھا اونگھتا رہتا۔ میرے ساتھ اس کے تعلقات کشیدہ ہی رہے ایک بار وہ مجھ سے اُلجھ بھی پڑا۔ اِدھر میں جسمانی اعتبار سے بالکل کمزور تھا۔ اس لئے اندر ہی اندر سب کچھ برداشت کرتا رہتا۔ پھر یوں ہوا کہ فرسٹ ایر کے سالانہ امتحان تک پہنچتے پہنچتے تعلیم سے نادر کا دل پوری طرح اچاٹ ہو گیا۔ اور وہ تعلیم کا سلسلہ قطع کر کے واپس وزیر کوٹ چلا گیا۔ اس کی جگہ والد صاحب نے میرے دوسرے بھتیجے نجابت کو تعلیم حاصل کرنے لئے بھجوا دیا۔ نجابت مجھ سے عمر میں دو سال بڑا لیکن تعلیم میں ایک سال پیچھے تھا۔ مگر مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے خوش باش، موسیقی کا دلدادہ اور عاشق مزاج تھا۔ میں گو عمر میں اس سے چھوٹا تھا لیکن وہ ہمیشہ مجھے "چچا جان!" کہہ کر مخاطب کرتا اور اپنے نجی معاملات کے ضمن میں بھی مجھ سے رہنمائی حاصل کرنے کا طالب ہوتا۔ مثلاً ایک روز میرے پاس آیا اور کہا: "چچا جان! مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ سبھی لڑکیاں مجھے اچھی لگنے لگی ہیں، انتخاب مشکل ہو گیا ہے"——— جواباً میں نے نہایت سنجیدگی سے اس پر پند و نصائح کی بوچھار کر دی۔ کہا کہ ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔ اُسے انسانی اخلاقیات پر بھرپور لیکچر دیا اور پھر بُرے اعمال کے نتائج سے اسے آگاہ کرنے کے لئے جہنم کا نقشہ اتنی تفصیل کے ساتھ کھینچا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے میں خود ابھی ابھی وہاں سے آیا ہوں۔ میرے لیکچر کو سن کر وہ مسکرایا اور کوئی فلمی گیت گنگناتا ہوا

باہر چلا گیا۔ میری نصیحتوں کا اس پر کوئی اثر مرتسم نہیں ہوا تھا اور ہوتا بھی کیسے کیونکہ بات وہی اثر کرتی ہے جو دل سے نکلی ہو۔ دوسری طرف میں خود بھی ان دنوں اس کی حالتِ زار سے ملتی جلتی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ چہرے پر داڑھی کے بال نمودار ہو گئے تھے۔ جن کے باعث چہرہ خاصا بھیانک نظر آنے لگا تھا۔ پھر میں نے ان پر مشین پھرانی شروع کر دی۔ جس سے صورتِ حال کچھ بہتر ہو گئی مگر دل کے اندر جو سبزہ اُگ رہا تھا، میں اس کا کیا کرتا۔ یکایک شریانوں کا لہو جیسے گرم ہو گیا تھا اور اس کے گرم ہوتے ہی تصورات کی نہج بھی بدل رہی تھی۔ صنفِ نازک اب ایک نئے رُوپ میں دکھائی دینے لگی تھی۔ مگر میری فطری جھجک اور شرم دل کے اندر سے پھوٹنے والی کیفیات پر پوری طرح غالب تھی چنانچہ اپنے دل کی دھڑکن کی آواز صرف مجھے ہی سنائی دیتی اور اپنے خوابوں کا علم بھی مجھی کو تھا۔ میں اندر ہی اندر سُلگنے لگا تھا لیکن ڈسیوویس کی طرح پھٹ پڑنے کی طرف مائل بالکل نہیں تھا۔ دوسری طرف نجابت قطعاً بے جھجک، دل پھینک اور بھرے مجمع میں اپنے جذبات کا اظہار کرنے پر سدا مائل رہتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے ایف اے کے بعد اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے دنیا میں قدم رکھ لیا، ملازمت کی، گھر بسایا اور یکے بعد دیگرے شادیاں رچاتا چلا گیا۔ دوسری طرف میں تعلیم میں پوری طرح غرق ہو گیا اور میں نے اپنے اندر کا لاوا حصولِ علم پر صرف کر دیا۔

(۲۱)

میں جھنگ میں دو سال مقیم رہا۔ پہلا سال تو میں نے مگھیانہ میں اپنے ایک عزیز کے ہاں گزارا اور دوسرا سال کالج کے ہوسٹل میں۔ میرے یہ عزیز مگھیانہ شہر کے کوتوال تھے۔ نہایت سخت مزاج تھے۔ عام طور سے پنجابی میں باتیں کرتے لیکن غصہ آتا تو اُردو میں منتقل ہو جاتے اور اُردو ایسے کرخت لہجے میں بولتے کہ محسوس ہوتا پشتو بول رہے ہیں۔ البتہ اُردو بولنے کے دوران گالیاں پنجابی میں دیتے۔ کہتے اُردو میں گالی دوں تو ملزم اقبالِ جُرم نہیں کرتا۔ ان کے مکان کے پاس ایک قدیم قبرستان تھا جس میں ایک فقیر سائیں چھلے شاہ رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ میرے اس عزیز کے پاس بھی آتا اور گھنٹہ بھر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے رُخصت ہو جاتا

میرے یہ عزیز اس کے عقیدت مند تھے اور اسے ایک پہنچا ہوا فقیر سمجھتے تھے مگر ہم لڑکے بالے ہمیشہ اس کا مذاق اڑاتے۔ ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ مجھے اس سے خوف آنے لگا۔ ہوا یہ کہ میں گھر کے باہر میدان میں ایک چارپائی پر لیٹا سردیوں کی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ سائیں چھلّے شاہ دوسری چارپائی پر آ کر بیٹھ گئے۔ کئی منٹ تک مجھے اپنی لال لال آنکھوں سے گھورتے رہے۔ پھر کہا: "مجھے کچھ روپے دو!" میں بے اختیار ہنس پڑا۔ میں نے کہا! "باباجی! میرے پاس روپے کہاں؟" واقعی میری جیب میں اس وقت بمشکل ایک روپے کی ریزگاری ہو گی۔ اگر روپے ہوتے بھی تو میں اسے کیوں دیتا۔ بابا نے گھور کر مجھے دیکھا اور تقریباً چیخ کر کہا! "روپے نہیں ہیں تمہارے پاس؟ اور وہ دس روپے کا نوٹ کیا ہوا؟" میں نے حیران ہو کر کہا! "کون سا دس روپے کا نوٹ باباجی؟" —— مگر باباجی نے میری بات کا جواب نہ دیا اور بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ دوپہر کو جب میں نہانے کے لئے غسل خانے میں گیا اور میں نے قمیص کے نیچے پہنی ہوئی روئی کی بنڈی کو اتارا تو مجھے اچانک یاد آیا کہ پچھلے ماہ جب میں وزیر کوٹ سے آیا تھا تو میری ماں نے بنڈی کی جیب میں دس روپے کا نوٹ رکھ کر جیب کو سی دیا تھا۔ انھیں سلانوالی کا تلخ تجربہ شاید یاد تھا۔ اس لیے انھوں نے میرے لئے واپسی کے کرایہ کا بندوبست کر دیا تھا۔ میں نے جیب کو چھوا۔ نوٹ جیب میں موجود تھا۔ یکایک مجھے باباجی کا سوال یاد آ گیا اور میں تا دیر سوچتا رہا کہ باباجی کو اس نوٹ کا علم کیسے ہو گیا؟ —— اس واقعہ کو آج اڑتالیس برس ہونے کو آئے ہیں۔ تا حال مجھے اس کا جواب نہیں ملا!

(۲۲)

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد میرے اس عزیز کا تبادلہ ہو گیا اور مجھے ہوسٹل میں منتقل ہونا پڑا۔ میں نے کالج ہوسٹل میں پورا ایک سال گزارا۔ وہیں زندگی میں پہلی بار پورے تیس روزے رکھے —— نماز بھی پڑھی اور کالج ہوسٹل کی سیاست میں بھی تھوڑا سا حصّہ لیا۔ مگر زیادہ وقت میں نے اپنی تعلیم پر صرف کیا۔ کالج میں داخل ہونے کے بعد میں تعلیم میں چمک اُٹھا تھا۔

بمشکل دو تین ماہ گزرے ہوں گے کہ مجھے اپنے سیکشن کے اچھے طلبا میں شمار کیا جانے لگا مگر جب فرسٹ ایر کے امتحان کا نتیجہ نکلا تو میں نہ صرف اپنی کلاس میں اوّل آیا تھا بلکہ انگریزی، اُردو، فلسفہ اور فارسی وغیرہ مضامین میں بھی میں نے پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ یکایک تمام اُستادوں کی نظرِ کرم مجھ پر مرکوز ہوگئی۔ پھر کالج کی سالانہ تقریبِ انعامات میں مجھے کئی انعام ملے۔ یہ انعامات انگریزی کتابوں کی صورت میں تھے۔ ان کتابوں میں سے ایک ہکسلے HUXLEY کی ROTUNDA بھی تھی۔ (یہ کتاب اب بھی میرے پاس محفوظ پڑی ہے ـــ) لیکن اس جلسۂ تقسیم انعامات میں سب سے زیادہ انعامات ایک چھوٹے قد کے لڑکے کو ملے جو اس وقت میٹرک کا طالب علم تھا۔ اسے انعام میں کتابوں کا اتنا بڑا ڈھیر ملا کہ اس سے اٹھایا نہیں جاتا تھا۔ کالج کے اساتذہ کھُسر پھُسر کر رہے تھے کہ یہ لڑکا تو GENIUS ہے۔ ریاضی اور سائنس اس کے مضامین تھے جن میں وہ اپنی کلاس کے طلبا سے میلوں بلکہ صدیوں آگے تھا۔ اس لڑکے کا نام عبدالسّلام تھا۔ برسوں بعد اسے طبیعات کا نوبل انعام ملا اور وہ دنیا بھر میں مشہور ہو گیا۔ میں کالج میگزین کا مدیر تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے اس میں عبدالسلام کا ایک اُردو ڈراما بھی شائع کیا تھا۔ مگر افسوس کہ میرے پاس اس رسالے کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے مجھے پیغام بھیجا کہ میں انہیں وہ پرچہ مہیا کروں جس میں یہ ڈراما چھپا تھا۔ مگر میں یہ پرچہ کہاں سے لاتا۔ کالج کی لائبریری میں بھی اس میگزین کا کوئی شمارہ محفوظ نہیں۔ سُنا ہے کہ ۱۹۵۰ء کے بعد ایک بار دریائے چناب کے سیلاب نے کالج کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ دوسری کتابوں کے علاوہ کالج میگزین (میگزین کا نام بھی "چناب" تھا) کے سارے پرچے بھی دریا بُرد ہو گئے تھے۔

(۲۳)

کالج میں داخل ہوئے ابھی بمشکل چند ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ مجھے فضا میں ایک عجیب سی کشمکش کا احساس ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک ہی چھت کے نیچے دو قومیں آباد

ہیں۔ کالج کے پرنسپل ایک سردار صاحب تھے۔ نام ان کا پریم سنگھ تھا وہ اسم بامسمّی تھے۔ کھُلی ڈلی طبیعت کے مالک، منافقت سے کوسوں دُور، وہ ہمہ وقت مُسکراتے رہتے۔ کالج کے ہندو اور مسلمان اساتذہ کے درمیان ان کی حیثیت ایک پُل کی سی تھی اور میرا یہ خیال ہے کہ انہیں کی بدولت کالج کی فضا میں کوئی بڑا دھماکا نہ ہوا۔ البتہ ٹینشن سارا عرصہ موجود رہی۔ مسلمان طلبا کی تعداد کم تھی مگر وہ گتھے ہوئے تھے۔ ہمارے ایک پروفیسر خواجہ معراج الدین تھے جو ہمیں فارسی پڑھاتے تھے۔ نہایت وجیہہ، باوقار اور لائق فائق! ـــــ اس قدر کہ ہم نے انھیں اپنا لیڈر متصوّر کر لیا تھا۔ وہ ہر معاملہ میں کالج کے مسلمان طلبا کے مفادات کا تحفّظ کرتے اور بعض اوقات تو پرنسپل تک سے اُلجھ پڑتے۔ ان کی دلیری اور اعتماد سے ہم مسلمان طلبا اس قدر متاثر تھے کہ وہ جدھر سے گزرتے ہم فرشِ راہ ہوتے چلے جاتے۔ کالج سے فارغ ہونے کے تقریباً سترہ برس بعد وہ مجھے ایک روز مری کی مال روڈ پر نظر آ گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا اور اپنا نام بتایا۔ میرا نام سنتے ہی انھوں نے مجھے پہچان لیا اور مجھ سے بغلگیر ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ ادب کے میدان میں میری رفتار سے وہ آگاہ تھے۔ دیر تک میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ مگر ذکر کالج کا تھا جہاں خواجہ صاحب ہمیں قطب ستارے کی طرح نظر آتے تھے۔ فارسی کی کلاس میں جب ایک بار انھوں نے مجھے حافظ کی غزل کا ایک شعر: ؎

کشتی شکستہ گانیم اے بادِ شُرطہ برخیز
باشد کہ باز بینم آں یارِ آشنا را

پڑھنے کو کہا اور میں نے اسے ٹھہر ٹھہر کر خالص ایرانی لہجے میں پڑھا (جس کی تربیت مجھے دی گئی تھی) تو انھوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ شاباش دی اور ساری غزل بہ آوازِ بلند پڑھنے کو کہا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کلاس میں مجھی سے فارسی غزل پڑھواتے اور دوسرے طلبا کو ڈانٹتے بھی جاتے کہ وہ فارسی اشعار اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کچی کچی مولیاں کھا رہے ہوں ـــــ یہ نہیں کہ ہندو اساتذہ مجھ پر کم مہربان تھے۔ میں نے کبھی اپنی کلاس میں کسی ہندو لیکچرر کو ہندو مسلمان میں تفریق کرتے ہوئے نہ دیکھا۔ انھوں نے کلاس کے طلبا کو ہندو مسلمان میں نہیں لائق اور نالائق طلبا میں تقسیم کر رکھا تھا۔ میں چونکہ اپنی کلاس

میں نمایاں تھا اس لئے سبھی ہندو مسلمان اساتذہ میری حوصلہ افزائی کرتے۔ دراصل ٹینشن کلاس کے کمروں میں نہیں بلکہ کالج کی فضا میں تھی۔ اس ٹینشن کے کوئی واضح نقوش موجود نہیں تھے مگر اسے آسانی محسوس کیا جا سکتا تھا۔ میرا خیال ہے اس کی وجہ ملکی فضا میں سیاسی سطح کی ٹینشن ہو گی گو میرے لیئے اس بات کو نظر انداز کرنا مشکل ہے کہ اس کی جڑیں دور ماضی میں بھی اُتری ہوئی تھیں۔

انھیں دنوں علامہ اقبال کی وفات کی رُوح فرسا خبر نے ہمیں جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ پرنسپل صاحب نے خبر سُنتے ہی سٹاف رُوم میں کالج کے اساتذہ اور چند طلبا کو جمع کیا اور پھر علامہ اقبال کے بارے میں ایک بھرپور تقریر کر ڈالی۔ انھوں نے علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا مگر ساتھ ہی کہا کہ اگر علامہ اقبال اپنی اوّلین ڈگر پر قائم رہ کر ہندوستان کی عظمت کے گُن گاتے تو آج ان کا وہی مرتبہ ہوتا جو رابندر ناتھ ٹیگور کا تھا۔ جب انھوں نے یہ بات کہی تو خواجہ معراج الدین صاحب کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ مگر انھوں نے اپنے ہونٹوں کو مقفّل رکھا۔ چونکہ ہم مسلمان طلبا خواجہ صاحب کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور سُرخی سفیدی سے اپنے "ردِ عمل" کو مرتّب کرنے کے عادی تھے اس لئے ہمارے چہروں پر بھی دُکھ کے آثار نظر آنے لگے۔ پرنسپل صاحب کو بھی شاید احساس ہو گیا تھا کہ یہ موقع ایسی باتیں کرنے کا نہیں تھا۔ اس لئے وہ سنبھل کر اقبال کی شاعری کے اوصاف گنانے لگے اور مطلع صاف ہو گیا۔

(۲۴)

ایف اے کا نتیجہ نکلا تو میں آرٹس میں اوّل تھا۔ میری والدہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور میرے والد بھی زیرِ لب مُسکرا رہے تھے۔ مگر اس کے بعد جب مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل کرایا گیا تو میں اوجِ ثریا سے تحت الثریٰ میں تو نہ اُترا البتہ کہیں درمیان میں ضرور معلق ہو گیا یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ اُن دنوں گورنمنٹ کالج لاہور کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ نہر سویز کے مشرق میں واقع ساری دنیا کا بہترین تعلیمی ادارہ ہے ہندوستان بھر کے منتخب طلبا ہر سال اس ادارے میں جمع ہو جاتے تھے۔ راجوں

مہاراجوں کے سپوت نیز بڑے بڑے صنعت کاروں، جاگیرداروں، افسروں اور سیاسی لیڈروں کے صاحبزادے اس تعلیمی ادارے کی طرف رجوع کرتے مگر انہیں کسی کی سفارش کی بنا پر نہیں بلکہ تعلیم میں اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر داخل کیا جاتا۔ سو گورنمنٹ کالج لاہور میں ان دنوں لیاقت اور امارت کا سنجوگ بالعموم دیکھنے میں آتا۔ میں اس کالج میں داخل ہوا تو ان دونوں سے محروم تھا۔ محروم ان معنوں میں کہ معاشی اعتبار سے تو میں کالج کے آخری بیس تیس لڑکوں میں شامل تھا۔ جب کہ تعلیمی اعتبار سے بھی میں "قابلِ ذکر" نہیں تھا۔ تھرڈ ایئر میں تقریباً ڈیڑھ سو طالب علم تھے۔ میرا رول نمبر ۵۶ تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ گورنمنٹ کالج جھنگ سے گورنمنٹ کالج لاہور تک پہنچتے پہنچتے میں ۵۶ قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ چنانچہ احساسِ کمتری نے مجھے دبوچ لیا اور پھر چار برس تک مجھے اپنے پنجوں سے آزاد نہ کیا۔ میں باقی تمام طلبا سے الگ تھلگ رہنے لگا۔ کسی تقریری مقابلے یا کھیل میں بھی حصّہ نہ لیا۔ کوئی دوست نہ بنایا۔ سارا وقت اپنی معیّت میں گزارنے لگا۔ میرے لئے تنہائی کا یہ تجربہ انوکھا تھا۔ میں جب سلانوالی میں بیمار پڑا اور تنہائی کی دیوی سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں کسی بے آباد جزیرے میں قید کر دیا گیا ہوں۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں آکر محسوس ہوا کہ میں انبوہ میں تنہا ہوں گویا تنہائی کی دیوی ایک قدم اور میری طرف بڑھ آئی تھی۔ اپنی معیّت میں رہنے کا یہ تجربہ اُس فارسی مصرعِ کے بمصداق تھا کہ

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای

چنانچہ مجھے قعرِ دریا ہمہ وقت اپنے سامنے دکھائی دیتا۔ اب میری عمر تقریباً اٹھارہ برس کی تھی۔ مجھ پر جوانی تو آگئی تھی تاہم جوانی نے کسی جگری دوست کی طرح مجھ سے اچانک معانقہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ دبے پاؤں آکر آہستہ سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ معاً میں اپنے اردگرد کے ماحول کو ایک نئی نظر سے دیکھنے لگا۔ معاشرتی سطح کے کئی سوال میرے ذہن میں کلبلانے لگے۔ مگر میرے لئے ان میں سے ہر سوال ریاضی کا کوئی سوال نہیں تھا جسے میں باہر سے حل کرنے کی کوشش کرتا بلکہ ہر سوال میرے داخلی کرب سے پھوٹتا تھا لہٰذا جذبات میں ملفوف تھا۔

مگر نہ تو میں اپنے کسی ہم جماعت کو اپنے ان نئے نویلے سوالات میں شریک کر سکتا تھا۔ نہ ابھی اس قابل تھا کہ کتابوں کے مطالعہ سے کسی نتیجے پر پہنچتا۔ لہٰذا میں نے خود کو سامنے بٹھا کر سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ خود پر اپنے اندر کے اس انسان کو منکشف کرنے کی کوشش کرنے لگا جو احساسِ تنہائی میں لپٹا ہوا تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ جب میں اظہار کے شدید دباؤ میں آ کر اس داخلی کرب سے دوچار ہوا تو شاعری کی دیوی میری مدد کو پہنچ گئی۔ شاعری کی دیوی سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ اس زمانے کے لکھے ہوئے اشعار اب مجھے یاد نہیں ہیں۔ (میں اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھ رہا تھا) البتہ ایک انگریزی نظم کی یہ چند لائنیں آج بھی یاد ہیں :

DARKNESS FALLS

BRUSHING LIGHT AWAY, SWEEPING DAY ASIDE

I STAND FORLORN NEAR A SILENT TREE

WITH MIND SUBDUED AT LAST

THE WOUND OF MY SOUL IS STILL AJAR

AND THE STARS ARE SHINING GINGERLY!

اُردو اشعار بھی اسی وضع کے تھے۔ البتہ بعض میں اُن صوفیانہ ضرب الامثال کا عکس بھی تھا جو میں نے اپنے گھر میں اکثر سُنی تھیں۔ مجھے اپنے یہ اشعار اس قدر عزیز تھے کہ ان کی اشاعت بھی مجھے گوارا نہیں تھی۔ کیونکہ یہ مبہم سا خدشہ میرے دل میں موجود تھا کہ اگر یہ اشعار شائع ہو گئے تو پھر صرف میرے نہیں رہیں گے بلکہ پبلک پراپرٹی بن جائیں گے اور میں بلا شرکتِ غیرے ان کی معیت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا آرزو مند تھا۔ البتہ ایم۔ اے کے آخری سال تک پہنچتے پہنچتے میں ایک حد تک اپنی اس "خود غرضی" پر غالب آ گیا تھا۔ چنانچہ ایک روز میں نے ایک کشمیری پنڈت جی کو جو میرے ہم جماعت تھے اپنے چند اشعار سنائے۔ خدا جانے پنڈت جی نے ان اشعار میں معانی کی کون سی نئی پرتیں دریافت کر لی تھیں کہ انھوں نے اچھل اچھل کر ایسے جذباتی انداز میں مجھے داد دی کہ میں شرمسار ہو گیا۔ اس کے

دو برس بعد وہ مجھے ایک روز سرینگر میں مل گئے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے: "وہی اشعار پھر سناؤ!"—— میں نے سنا دئے۔ دیر تک جھومتے رہے مگر اب میں خود شعر کو پہچاننے لگا تھا چنانچہ میں نے ایک روز کالج کے ایّام کا یہ سارا شعری سرمایہ چولہے میں جلا دیا اور خود شعلے کی طرح آزاد ہو گیا۔ مگر ذکر کالج کے ایّام کا تھا۔ ان دنوں میں "راوی" التزام کے ساتھ پڑھتا تھا۔ محمد اجمل (بعد ازاں ڈاکٹر محمد اجمل) اس کے مدیر تھے مگر میرا ان سے کوئی تعارف نہیں تھا۔ راوی میں لکھنے والے دوسرے طلبا سے بھی میری کوئی واقفیت نہیں تھی۔ ان حضرات میں سے کسی کو اس بات کا علم تک نہ تھا کہ ایک "سایہ" سا ہمہ وقت ان کا ہم رکاب ہے۔ اُن دنوں مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں نے ایک طلسمی ٹوپی پہن رکھی ہے یعنی میں تو سب کو دیکھ سکتا ہوں مگر کوئی مجھے نہیں دیکھ سکتا۔

۲۵

عجیب بات ہے کہ کالج کے ان ایّام میں ایک طرف تو میں شاعری کے دیار میں داخل ہوا اور دوسری طرف معاشی نشیب و فراز کا ایک کربناک احساس مجھ پر تیزی سے مسلّط ہونے لگا۔ میں خود HAVE NOTS کے قبیلے کا ایک فرد تھا۔ کالج ہوسٹل کے اخراجات بچانے کے لیئے والد صاحب نے مجھے اپنے ایک عزیز کے گھر بھیج دیا تھا جو اُن دنوں موچی دروازہ کے امام باڑہ رضا شاہ میں مقیم تھے۔ امام باڑہ رضا شاہ ایک نہایت خستہ حال عمارت تھی جس کے صرف دو کمرے ایک حد تک قابلِ رہائش تھے۔ ایک کمرے میں میرے یہ عزیز قیام پذیر تھے۔ دوسرا کمرہ میری تحویل میں آیا۔ اس کمرے میں ایک اندھا کنواں تھا جسے لکڑی کے ایک تختے سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ مجھے کالج فیس کے علاوہ دس روپے بطور جیب خرچ ملتے تھے۔ ایک سائیکل بھی مہیّا کر دیا گیا تھا جس پر میں ہر روز موچی دروازے سے سرکلر روڈ پر سے گزرتا ہوا گورنمنٹ کالج پہنچتا یا پھر مہینے میں ایک بار مال روڈ کے ریگل سینما میں انگریزی فلم دیکھنے کے لیئے جاتا۔ سارا ہال گوروں سے بھرا ہوا ہوتا۔ لیکن وہ صرف سرگوشیوں میں باتیں کرتے۔ میں سکرین کے قریب چار آنے والی کلاس میں بیٹھ کر فلم دیکھتا۔ اس کلاس میں صرف اہلِ وطن ہوتے۔ مگر گوروں کی موجودگی سے

ہم سب اس قدر سہمے ہوتے کہ فلم کے نازک مقامات پر بھی شور نہ مچا سکتے

میں جب اپنی اس معاشی بدحالی کا موازنہ اپنے کالج کے طلبا سے کرتا تو ایک احساسِ کم مائگی مجھ پر بُری طرح چھا جاتا۔ ان میں سے بیشتر طلبا قیمتی لباس پہنتے، قیمتی سگریٹ پیتے، بعض کے پاس اپنی کاریں بھی تھیں جنھیں وہ شہر کی سڑکوں پر دوڑاتے۔ اونچے درجے کے ریستورانوں کا طواف کرتے اور ہر بات میں انگریزوں کی تقلید کرتے۔ چنانچہ آپس میں باتیں بھی انگریزی ہی میں کرتے میں خود انگریزی بول لیتا تھا مگر اکثر و بیشتر موزوں الفاظ بروقت نہیں سوجھتے تھے۔ میری خوش قسمتی کہ طلبا سے میری بول چال بہت کم تھی لہٰذا میں زیادہ تر لبِ گویا کے بجائے گوشِ شنوا بنا رہتا۔ تاہم مجھے بار بار یہ احساس ہوتا کہ وہ امیر ہیں اور میں غریب! شدہ شدہ یہ فرق مجھے افراد کے ساتھ ساتھ طبقات میں بھی دکھائی دینے لگا۔ میں خود سے پوچھتا آخر کیوں؟ یہ فرق کیوں ہے اور کیا انصاف کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ افراد اور طبقات میں مساوات قائم ہو۔ سب کو ایک جیسے مواقع ملیں اور سب انگلیاں برابر ہوں۔ پھر میں اپنے ہاتھ کی انگلیوں کی طرف دیکھتا مگر وہ برابر نہیں تھیں۔ انگلیاں کہیں بھی برابر نہیں تھیں۔ پھر بھی میں سوچتا کہ انسان نے اپنی خود غرضی کے تحت استحصال کی روایت قائم کی ہے۔ اور اپنی حرص کی تلوار سے بعض انگلیوں کو کاٹ کر انھیں ان کے فطری قد سے چھوٹا کر دیا ہے اور وہ انھیں مزید چھوٹا کرنے کا خواہش مند ہے۔ پھر یوں ہوا کہ مجھے معاشی سطح پر عدل کا جو فقدان نظر آیا تھا وہ تقدیر کے طریقِ کار میں بھی نظر آنے لگا اور میں بالکل چکرا گیا۔ بعد ازاں کالج سے فارغ ہونے کے بعد مجھے اپنی اس ذہنی کیفیت کو عبور کرنے کے متعدد مواقع ملے اور میں نے ان سے فائدہ بھی اٹھایا لیکن عدم مساوات کا یہ کربناک احساس میرے داخل میں کسی نہ کسی صورت ضرور موجود رہا اور میری اوّلین نظموں میں تو بالخصوص بہت واضح تھا۔ مثلاً میری پہلی "قابلِ ذکر" نظم جو میں نے نُصرت آرا نُصرت کے فرضی نام سے لکھی، اس عدم مساوات کے احساس ہی سے لبریز تھی؛

بادلو! دُھند کے مانند بکھرنا سیکھو
اک رِدا بن کے بکھر جاؤ مری دُنیا پر

اپنے دامن میں چھپا لو میرے سب بچّوں کو!
یہ بلکتے ہوئے ہنستے ہوئے معصوم سے لوگ
جن کے ہاتھوں میں کھلونے ہیں، زر و سیم کا بار
یوں بکھر جاؤ کہ اک دل کو بھی محسوس نہ ہو
ہم سفر کتنے کھلونوں کا بنا ہے مالک
کہ زر و سیم کی تقسیم کا یہ جُرم، فریب
میرے بچّوں کی ہلاکت کا بنا ہے موجب
بادلو! آؤ، اُتر آؤ میری دُنیا پر

"دھرتی کی آواز" (۱۹۴۶)

(۲۶)

میں نے ۱۹۴۳ء میں معاشیات کے مضمون میں ایم اے کیا۔ دوسری جنگِ عظیم چھڑی ہوئی تھی سول سروس کے امتحانات منسوخ تھے۔ چاروں طرف انگریز کے خلاف نفرت کی ایک لہر سی دوڑ رہی تھی۔ ہر چند میں نے سیاست میں عملی طور پر حصّہ نہیں لیا تھا اور نہ حصہ لینے کا کوئی ارادہ تھا مگر ذہنی طور پر اُس وقت کے ہندوستان کا شاید ہر شخص سیاست میں ملوث تھا۔ میں اخباروں میں سیاسی لیڈروں کے بیانات پڑھتا۔ قومی اور بین الاقوامی واقعات کے پس منظر میں جھانکتا اور پھر اُس روز کا انتظار کرتا جب یہ برِصغیر انگریز کی غلامی کا جُوا اپنے شانوں سے اتار پھینکے گا اس وقت مجھے ہٹلر کے اصل کردار کا کوئی علم نہیں تھا۔ لیکن چونکہ وہ میرے دشمن کا دشمن تھا۔ اس لئے مجھے اُس سے ہمدردی اور اُس کی فتوحات میں خاص دلچسپی تھی اور میں سمجھتا تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو ہمیں از خود آزادی نصیب ہو جائے گی۔ میں اس ذہنی کیفیت میں مبتلا تھا کہ والد صاحب نے مجھے فوج میں لفٹیننٹ بھرتی کرانے کا ارادہ کر لیا۔ بڑے بڑے انگریز افسروں سے ان کے مراسم تھے۔ چنانچہ ایک روز وہ مجھے سرگودھا میں ایک انگریز افسر کے بنگلے پر لے گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں چار پانچ انگریز اور ان کی میمیں موجود تھیں، یہ سب لوگ اُردو

زبان سے تو آشنا تھے اور اسے جناتی لہجے میں بولنے پر قادر بھی تھے۔ لیکن میرے ساتھ انھوں نے سارا عرصہ انگریزی میں باتیں کیں۔ میں سخت گھبرایا ہوا تھا۔ بالخصوص اس لئے کہ میموں سے باتیں کرنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ وہ مجھ پر سوالات کی بوچھار کر رہی تھیں اور میں چور آنکھوں سے ان کے سراپا کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اچانک یہ ملاقات ختم ہو گئی۔ والد صاحب یہ سارا عرصہ "بڑے صاحب" سے باتیں کرتے رہے تھے۔ اپنے زمانے میں انھوں نے کچھ عرصہ لاہور کے ایف سی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی اس لئے انگریزی بول لیتے تھے گھر آ کر انھوں نے مجھے اور میری والدہ کو بتایا کہ صاحب سے بات ہو گئی ہے اور وہ مجھے فوج میں لینے کو تیار ہیں۔ میری والدہ نے یہ بات سنی تو رونا شروع کر دیا۔ مگر میں نے بھرتی ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ والد صاحب برہم بھی ہوئے اور حیران بھی کیونکہ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے ان کی کسی بات کو ماننے سے انکار کیا تھا مگر جب انھوں نے میرے انکار کی وجہ پوچھی اور میں نے انھیں بتایا کہ میں اُس قوم سے کیسے تعاون کر سکتا ہوں جس نے ہمیں صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے اور جو نسل در نسل ہمارا خون پیتی رہی ہے تو والد صاحب نے تحسین آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ مسکرائے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔

(۲۷)

اب میں "آزاد" تھا۔ کالج اور ملازمت کے بندھنوں سے آزاد! ——— کچھ عرصہ تو میں نے وزیر کوٹ میں گزارا اور بندوق ہاتھ میں لئے سارا سارا دن شکار کرتا رہا۔ کچھ شکاری دوست بھی مل گئے اور ہم وزیر کوٹ سے میلوں دور سرکنڈے کے جنگلوں اور ان جنگلوں میں موجود پانی کے قطعوں کے کنارے تیتروں اور مرغابیوں کا شکار کرنے لگے۔ شام کو جب میں گھر لوٹتا تو مٹی بھو چور اور عضو عضو نڈھال ہوتا۔ ملازمت سے انکار کر کے میں نے اپنی "جہت" کی بھی نفی کر دی تھی۔ کوئی کاروبار بھی پیش نظر نہیں تھا۔ سوال یہ تھا کہ میں اپنی آئندہ زندگی کس حیثیت میں گزاروں گا۔ والد صاحب نے مشورہ دیا کہ میں گھوڑوں کا کاروبار کروں۔ میں نے حامی بھر لی۔ سوچا آبا و اجداد کا پیشہ ہے ــ ممکن ہے خون میں اس کاروبار کے کچھ جراثیم ابھی باقی ہوں اور اس کے ذریعے مجھے روزی کمانے

کا موقع مل سکے۔ والد صاحب نے کہا کہ گھوڑے کے کاروبار کے لئے پہلے گھوڑے کو پہچاننا بے حد ضروری ہے۔ اور گھوڑے کو پہچاننے کے لئے لازم ہے کہ اس سے "دوستی" کی جائے اور دوستی صرف اسی صُورت میں ممکن ہے کہ گھُڑ سواری کی جائے مگر اس طور کہ راکب اور مرکب بالآخر ایک ہو جائیں۔ سو مَیں نے گھُڑ سواری کا آغاز کیا اور جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ گھُڑ سواری بجائے خود ایک آرٹ ہے۔ مجھے گھُڑ سواری کے بنیادی اصولوں سے آگاہ کر کے گھوڑے پر سوار کرا دیا گیا اور گھوڑے کی باگ میرے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ ہم دونوں روانہ ہوئے تو ایک دوسرے کے لئے قطعاً اجنبی تھے۔ دونوں کا مزاج، جہت اور رفتار ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی جنگلی جانور کی پیٹھ پر مجھے باندھ دیا گیا ہے اور یہ جنگلی جانور جدھر چاہتا ہے مجھے لئے لئے پھرتا ہے۔ بالکل خواب کا سا عالم تھا جہاں خواب، خواب دیکھنے والے کی گرفت سے آزاد ہو کر ایک الگ سانس لیتا ہوا وجود بن جاتا ہے اور جدھر چاہتا ہے خواب بین کو لئے لئے پھرتا ہے۔ برسوں بعد گھُڑ سواری کے اس تجربے نے مجھ پر یہ بات منکشف کی کہ اگر اسپِ تخیّل مطلق العنان ہو تو شاعری آزاد تلازمۂ خیال سے آگے نہیں جاتی۔ اگر تخیّل کی باگ آگہی کے ہاتھ میں ہو اور وہ اس کی چال سے آوارہ خرامی کے عنصر کو منہا کر سکے تو اعلیٰ شاعری کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے مگر یہ تو بعد کی بات ہے۔ گھُڑ سواری کے تجربے سے گزرتے ہوئے مجھ پر یہ احساس چھایا رہا کہ اگر گھوڑا مجھ پر غالب آگیا تو میں بے جہت ہو جاؤں گا اور مَیں گھوڑے پر غالب آگیا تو محض بنی بنائی کھائیوں میں سفر کروں گا۔ کسی اوڈیسس کی طرح "نامعلوم" کا سفر نہ کر سکوں گا۔ ہفتہ بھر ہم دونوں ہم رکاب رہے تو ایک دوسرے کو پہچاننے لگے۔ پھر یوں ہوا کہ ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے اور جب باہر نکلتے تو چند ہی لمحوں کے بعد مجھے محسوس ہوتا کہ مَیں گھوڑے کے جسم کا ایک حصّہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ گھوڑے کو بھی ایسے ہی محسوس ہوتا ہو گا خاص طور پر جب مَیں گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا تو مجھے یوں لگتا جیسے گھوڑا نہیں دوڑ رہا میں خود دوڑ رہا ہوں۔

(۴۹)

اُن دنوں بمبئی اور پونا گھوڑوں کے کاروباری مراکز تھے۔ بمبئی میں گھڑ دوڑ بہت مقبول تھی محض اس لئے نہیں کہ یہ ایک پُر لطف کھیل تھا بلکہ اس لئے بھی کہ یہ ایک منافع بخش کاروبار تھا۔ لوگ گھوڑوں پر شرطیں لگاتے، لاکھوں کماتے، لاکھوں گنواتے اور نفع نقصان کے اس عمل سے لطف کشید کرتے۔ پونا میں بڑے بڑے گھوڑوں کے سٹنڈ تھے جہاں گھوڑوں کی نسل کشی کی جاتی تھی۔ میرے والد کا خیال تھا کہ گھوڑوں کا کاروبار کرنے سے پہلے بمبئی اور پھر پونا کا ایک چکر لگانا ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے مجھے تین سو روپے دئے اور کہا کہ میں دو ماہ کے لئے بمبئی اور پھر پونا جاؤں اور معلومات حاصل کر کے واپس وزیر کوٹ آجاؤں۔ اس کے بعد کاروبار کا آغاز ہوگا۔

یہ غالباً ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے۔ میں لاہور سے خیبر میل میں سوار ہوا اور سارا عرصہ ریل کی کھڑکی سے لگا، ہندوستان کی دھرتی پر بکھرے ہوئے دیہاتوں، شہروں، پہاڑوں اور جنگلوں کا نظّارہ کرتا اور اشعار گنگناتا سفر کرتا چلا گیا۔ اُن دنوں میں نے اُردو شاعری کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر رکھا تھا۔ فیض، یوسف ظفر اور قیوم نظر کی بیشتر نظمیں مجھے زبانی یاد تھیں۔ میں یہ نظمیں خود کو سناتا اور لطف اندوز ہوتا۔ سو مجھے اپنے کمپارٹمنٹ کے کسی مُسافر سے بات کرنے کی ضرورت تک نہ پڑی۔

بمبئی کے قیام کے تین واقعات مجھے یاد ہیں، باقی ذہن سے محو ہو چکے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ بمبئی سٹیشن پر اترتے ہی میں ایک ہوٹل والے کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس نے اپنے ہوٹل کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے تھے مگر جب میں گھوڑا گاڑی میں سوار اس کے ہوٹل پہنچا تو دیکھا کہ یہ تین چار کمروں پر مشتمل ایک نہایت خستہ حال عمارت تھی۔ میں تھکا ہارا تھا اس لئے کھانا کھاتے ہی سو گیا۔ آدھی رات کے قریب مجھے جیسے کسی نے جھنجوڑ کر بیدار کر دیا۔ میں لپک کر اٹھا اور بجلی جلادی اور پھر میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے بستر کی سفید چادر پر خون کے لاتعداد چھوٹے بڑے دھبّے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں کھٹمل اس چادر پر مصروفِ خرام تھے۔ میں نے اپنے جسم کی طرف دیکھا تو اس پر "مشقِ ناز" کے نشانات ہی نشانات تھے، سارا

جسم سوجا پڑا تھا۔

دوسرا واقعہ سمندری طوفان سے میرا تعارف تھا۔ برسات کے دن تھے مجھے بتایا گیا تھا کہ سمندر دیکھنا ہو تو جوہو جا کر دیکھو، سو مَیں جوہو پہنچا اور دیر تک ساحل کنارے ٹہلتا رہا بے شمار عورتیں اور مرد سمندر میں نہا رہے تھے۔ اُن دنوں جوہو میں ناریل کے لاتعداد درخت تھے، جن کے باعث جوہو ایک نہایت خوبصورت تصویر کی طرح نظر آتا تھا۔ (اس کے تقریباً بتیس برس بعد جب مَیں بیوی بچوں کے ساتھ بمبئی گیا اور بطورِ خاص انھیں جوہو دکھانے لے گیا تو مجھے سخت مایوسی ہوئی کیونکہ اب جوہو کا سارا فطری حُسن پختہ مکانات کے ملبے تلے دب چکا تھا۔) بہرحال مَیں جوہو کے بے مثال حُسن کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تب دُور سمندر پر مجھے ایک دُھند سی دکھائی دی جو بڑی تیزی سے ساحل کی طرف بڑھنے لگی۔ اس دُھند کو دیکھتے ہی سمندر کی لہریں سرکش ہو گئیں، اُن کا شور بڑھ گیا اور وہ لمحہ بہ لمحہ جوہو کی طرف اُمڈنے لگیں۔ سمندر میں نہانے والوں کو خطرناک سمندری طوفانوں کا شاید تجربہ تھا اس لئے وہ آناً فاناً سمندر سے نکل گھروں کو چل دئے۔ البتہ مَیں کچھ دیر سمندر کنارے ہی بیٹھا رہا۔ تب بارش بھری تیز ہوا ایک تلوار کی طرح مجھ پر آپڑی اور سمندری موجیں چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی طرح میری طرف لپکیں تو میرے پاؤں اُکھڑ گئے اور مَیں نے دوڑ کر جوہو کنارے کے ایک ریستوران میں پناہ لے لی۔ اُس وقت ریستوران میں کوئی گاہک موجود نہیں تھا۔ ریستوران کے پارسی مالک نے میری حالتِ زار دیکھی تو میرے پاس آ بیٹھا۔ مجھے چائے پلائی۔ پوچھا کہ کہاں سے آیا ہوں۔ پھر دیر تک اُس طوفان کا ذکر کرتا رہا جس نے اُن دنوں یورپ میں قیامت برپا کی ہوئی تھی۔ کہنے لگا! دیکھ لینا چند ہفتوں کے اندر اندر روسی فوجیں برلن میں داخل ہو جائیں گی!

تیسرا واقعہ کاروباری نوعیت کا تھا۔ مجھے ہدایت ملی تھی کہ بمبئی جا کر فتح صاحب سے ضرور ملوں۔ فتح صاحب ایک کروڑپتی صنعت کار تھے۔ مگر کچھ عرصہ سے انھیں T.B.E نسل کے اعلیٰ گھوڑے پالنے کا شوق چرایا تھا۔ نواب صاحب کالا باغ نے انھیں بتایا تھا کہ کالا باغ کے پانی اور زمین میں کیلشیم بافراط ہے۔ اس کا گھوڑوں کی ہڈیوں پر بہت اچھا اثر مرتسم ہو گا اور وہ ریس میں اپنے حریفوں کو پیچھے چھوڑ جائیں گے۔ چنانچہ فتح صاحب

نے نواب صاحب کالاباغ کے ساتھ مل کر کالا باغ میں ایک سٹنڈ قائم کر لیا تھا۔ والد صاحب کا خیال تھا کہ فتح صاحب کو کسی نہ کسی طرح وزیر کوٹ لایا جائے۔ ممکن ہے وہ وزیر کوٹ میں بھی ایک سٹڈ کھولنے پر آمادہ ہو جائیں۔ چنانچہ میں انھیں ملنے کے لئے گیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ ہمارا بھی ایک ہارس سٹڈ ہے تو بڑی شفقت سے ملے اور وزیر کوٹ آنے کا وعدہ کیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد میں انھیں دوبارہ نواب صاحب کالا باغ کے ہاں بھی ملا۔ نواب صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اور میں نے دوبارہ انھیں وزیر کوٹ آنے کی دعوت دی۔ مگر مصروف آدمی تھے۔ وزیر کوٹ نہ آسکے اور یوں ان کے ساتھ مل کر ہارس سٹڈ قائم کرنے کا منصوبہ دل سے زبان تک کا سفر بھی نہ کر سکا۔

بمبئی سے میں پونا گیا۔ برسات کے دن تھے۔ یہ سفر مجھے خواب کی طرح یاد ہے — سارا علاقہ ایک سبز چادر کی طرح پھیلا ہوا تھا حتّٰی کہ پہاڑیاں تک سبز پوش تھیں۔ جا بجا آبشاروں کے مناظر آجاتے تھے۔ میں کبھی گاڑی کی ایک کھڑکی میں جا بیٹھتا، کبھی دوسری کھڑکی کے ساتھ چپک جاتا۔ مگر دوسرے مسافر مزے سے بیٹھے اخبار پڑھنے یا گپیں لگانے میں منہمک تھے۔ میں سوچنے لگا کہ انسان فطرت سے کس قدر کٹ چکا ہے کہ اب فطرت سے اس کی گفتگو ہی ختم ہو چکی ہے۔ اس بات کا احساس مجھے بعد میں بھی متعدّد بار ہوا۔ مری کی مال روڈ پر سیر کرتے ہوئے میں کئی بار رک کر پہاڑوں کے منظر کو مشروب کی طرح پینے لگتا۔ مگر مال روڈ کی مخلوق اس ملکوتی منظر سے بے نیاز فقط نسلِ انسانی کا نظّارہ کرنے میں محو ہوتی۔ اس وقت میں سوچتا کہ افلاطون کے مقولے "خود کو پہچان"! پر خلقِ خدا کس خلوص کے ساتھ عمل پیرا ہے کہ اب اسے اپنے سوا کچھ اور دکھائی ہی نہیں دے رہا۔

میں پونا میں ایک ہفتہ ٹھہرا۔ وہاں کے سارے ہارس سٹڈ دیکھے اور گھوڑوں کے بارے میں بڑی قیمتی معلومات حاصل کیں۔ مگر سارا عرصہ میری زیادہ توجّہ ارد گرد کے ماحول، فطری نظّاروں اور وہاں کے لوگوں کی طرزِ بود و باش اور اس کے پیچھے پھیلی ہوئی تاریخ کی کروٹوں پر مرکوز رہی۔ جی چاہا کہ میں وہاں سے کیرالا اور مدراس تک جاؤں۔ حیدر آباد دکن کی تہذیب کو قریب سے محسوس کروں۔ میں اجنتا اور ایلورا بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر جیب تیزی

سے خالی ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں واپس بمبئی آیا۔ وہاں سے ایسی ٹرین پکڑی جو مجھے براستہ آگرہ، دہلی لے گئی۔ آگرہ میں تاج محل دیکھے بغیر میں واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اور دہلی میں قطب مینار پر چڑھ کر دہلی کا نظّارہ کرنا بھی میرے خوابوں میں شامل تھا۔ یہ سب کچھ ہو گیا تو ایک روز واپس وزیر کوٹ جا پہنچا لیکن اب مجھے گھوڑوں کے کاروبار میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

(۲۹)

میں اپنے اندر کی تبدیلی سے اپنے والد کو ابھی مطلع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مبادا انھیں رنج پہنچے سو میں نے ان سے کہا کہ گھوڑوں کے کاروبار کے لئے تو ساری زندگی پڑی ہے، پہلے میں ذرا گھومنا چاہتا ہوں۔ اُن دنوں جنگ کی وجہ سے بیرونِ ملک جانا تو ممکن نہیں تھا اس لئے میں نے وطنِ عزیز میں اپنے سفروں کا آغاز کیا۔ وزیر کوٹ سے باہر نکلنے کے اس تجربے میں ایک انوکھا لطف تھا کیونکہ اب اس کی نوعیت بن باس کی سی ہرگز نہیں تھی۔ تقریباً دس برس کی عمر سے میں وزیر کوٹ سے باہر رہ رہا تھا۔ اور اپنی والدہ اور اپنے گاؤں سے یہ جدائی میرے لئے سوہانِ رُوح کا درجہ رکھتی تھی۔ میں جب چھٹیوں میں گاؤں آتا تو یوں لگتا جیسے مجھے جنّتِ گم گشتہ میں دوبارہ داخل ہونے کی اجازت مل گئی ہو اور جب چھٹیوں کے اختتام کے بعد گھر سے روانہ ہوتا تو پہلے بیل گاڑی اور بعد ازاں تانگے پر سفر کرتے ہوئے گاؤں کی حدود تک بار بار اپنی جیب سے کاغذ کے ٹکڑے نکال کر پھینکتا جاتا اور کہتا: "اے کاغذ کے ٹکڑو! تم کتنے خوش قسمت ہو کہ اس دھرتی پر رہو گے جبکہ میں جا رہا ہوں"۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ برسوں بعد جب میری تخلیقات، نیز میرے تنقیدی نظریات میں "دھرتی" کا مؤقف اُبھرا تو اس کی تہہ میں یہی ناسٹلجیا کارفرما تھا۔ کسی نہ کسی طرح دھرتی اور ماں ایک دوسری میں مدغم ہو کر ایک نئی شخصیت بن گئی تھیں۔ اور میرے لئے اس شخصیت سے جدائی چودہ برس کے طویل بن باس کے مترادف تھی۔ مگر ایم۔ اے کرنے کے بعد یہ بن باس اپنے اختتام کو پہنچا تھا اور میں واپس اپنے گھر آ گیا تھا۔ سو اب جو سفر کا آغاز ہوا تو اس کی صورت بن باس کی سی ہرگز نہیں تھی۔ اب میں ایک سیّاح تھا مسافر نہیں تھا۔

(۳۰)

۱۹۴۳ء سے (جب مَیں نے ایم اے کیا) ۱۹۴۹ء تک (جب میری شادی ہوئی) —— چھ سال کا عرصہ میرے لئے سیاحت کا دور تھا۔ مگر یہ سیاحت اکہری نوعیّت کی نہیں تھی یعنی مَیں باہر کی دُنیا ہی کی نہیں، اندر کی دُنیا کی سیاحت بھی کرنے لگا تھا۔ باہر کی دنیا تو جیسے عجائبات کا ایک دیار تھا۔ مَیں ہر چیز کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اُونچے اُونچے پہاڑ، دریائے چناب کا پتّھروں سے ٹکراتا اور جھاگ اُڑاتا ہوا پانی، گھنے گہرے جنگل، بانہال کی چوٹی پر ایک لمبی سُرنگ سے گزر کر کشمیر کی وادی کا نظّارہ، کانگڑے میں چائے کے باغات کی خوشبو، ڈلہوزی میں اپر بکروٹا کی کمر سے لپٹی ہوئی سڑک پر چہل قدمی —— اس قسم کے ہزاروں تجربات تھے جن سے مَیں اُن دنوں "مرتّب" ہو رہا تھا۔ میرے لئے کلی کا کِھلنا بھونرے کی گُن گُن، چڑیوں کی چہکار، پودے کا اُگنا۔ ہاتھ کی ریکھائیں اور متبسّم آنکھوں کی گہرائی، اِن سب میں ایک "جہانِ دیگر" آباد تھا اور مَیں اس کی تہوں تک اُتر کر اپنی دنیا سے متعارف ہونے کے لئے بیتاب تھا۔ دوسری طرف میری ذات کے اندر بھی سفر کا آغاز ہو گیا تھا۔ مَیں اندر کی پُراسرار کائنات کی کُنہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ یہ جاننے کا آرزومند تھا کہ اس "اسرار" کی نوعیت کیا ہے اور حقیقتِ عظمیٰ سے میرا کیا رشتہ ہے؟ نیز یہ کہ مَیں کیوں ہوں اور میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی یہ کائنات کس لیے ہے؟ آخر اتنے بڑے اہتمام اور منصوبہ بندی کے پسِ پشت کوئی تو بڑا مقصد ضرور کارفرما ہوگا۔ وہ مقصد کیا ہے؟

اس چھ برس کے عرصے میں مجھے دو ایسی شخصیّتیں ملیں جنھوں نے مجھے اندر کی دنیا کی اس سیاحت پر مزید راغب کیا اور اس سلسلے میں میری رہنمائی بھی کی اور ایک شخصیّت جس نے اس سیاحت میں میرا ساتھ دیا۔ رہنما شخصیّتوں میں ایک تو میرے والد تھے جو بعد ازاں و۔ع۔خ کے نام سے مشہور ہوئے۔ دوسرے مولانا صلاح الدین احمد تھے۔ ہم سفر کا نام شمس آغا تھا۔

(۳۱)

و۔ع۔خ سے میری پہلی ملاقات ایم اے کے آخری دو سالوں میں ہوئی۔ بظاہر یہ حیران کُن

بات ہے لیکن حقیقت یہی ہے۔ اس سے پہلے وہ میرے سامنے ایک سخت گیر باپ کے رُوپ میں اُبھرے تھے۔ میرے دل میں ان کا بڑا احترام تھا مگر اس احترام میں خوف کا کثیر عنصر بھی شامل تھا۔ میں ہی نہیں سب لوگ ان سے ڈرتے تھے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ وہ گھوڑوں کے کاروبار سے منسلک ہوئے اور پھر گھوڑا پالی کے سلسلے میں ایک گاؤں میں باقی زندگی کاٹ دی۔ اگر وہ سیاست کے دیار میں چلے جاتے تو اپنی نہایت توانا اور اصولوں پر سمجھوتہ نہ کرنے والی شخصیّت کے باعث کامیاب ہوتے۔ ان کی ساری شخصیّت ان کی آنکھوں میں سمٹی ہوئی تھی اور کوئی ان سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا تھا۔ ہپناٹزم کے بھی ماہر تھے۔ کئی بار انھوں نے اس کا مظاہرہ کیا تھا۔ مگر ان کی شخصیّت کا ایک اور پہلو بھی تھا جو عرصۂ دراز تک مجھ سے اوجھل رہا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ وہ تصوّف اور ویدانت کے اسکالر ہیں مگر مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ سلوک کی اتنی منازل طے کر چکے ہیں کہ اب وہ ایک CHARISMATIC PERSONALITY کے مالک ہیں۔ میں جب ایم اے میں تھا تو مجھے کئی بار ان کی "سنگت" میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ "سنگت" کی صورت یہ تھی کہ وہ ہر روز دو تین گھنٹوں کے لئے بڑ کے درخت کے نیچے چارپائی بچھا کر نیم دراز ہو جاتے اور ان کے سامنے گاؤں کے چند عمر رسیدہ لوگوں کے علاوہ وقتاً فوقتاً باہر سے آئے ہوئے لوگ بھی آ بیٹھتے۔ وہ سب ہمہ تن گوش ہوتے۔ جب کہ و۔ع۔خ ایک تار باتیں کرتے چلے جاتے۔ میں دُور سے اس سنگت کو دیکھتا رہا تھا۔ پھر ازراہِ تجسس ایک روز چپکے سے اس "سنگت" میں شامل ہوا اور ہر چند کہ ان کی باتوں کی ساری تہیں تو مجھ پر منکشف نہ ہوئیں تاہم مجھے محسوس ہوا کہ ان کے سراپا سے روشنی کی ایک شعاع سی برآمد ہو کر مجھ میں سما گئی ہے۔

اس کیفیت کا لمس مجھے یاد تھا۔ سو اب کہ میں تعلیم سے فارغ ہو کر گاؤں میں قیام پذیر ہوا تو میں نے و۔ع۔خ کی ذات سے استفادہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اتفاق سے انہیں دنوں میرا بھانجا شمس آغا بھی کچھ عرصے کے لیے وزیر کوٹ آیا ہوا تھا۔ شمس ایک جینئیس ـــــ تھا ـــــ وہ انتہائی متجسس ہونے کے علاوہ پل بھر میں مشکل سے مشکل بات کی تہہ تک پہنچنے پر قادر تھا۔ اس کا مطالعہ زیادہ وسیع نہیں تھا مگر اس کا حافظہ بلا کا تھا۔ سو وہ

جو کچھ پڑھتا یا سُنتا اپنے اندر پوری طرح جذب کرلیتا۔ ادب بالخصوص اُردو ادب سے اسے گہرا لگاؤ تھا۔ اِدھر میرا یہ حال تھا کہ ہر چند میں کالج کے ایام ہی میں شعر کہنے لگا تھا لیکن اُردو ادب سے میرا تعارف بالکل سرسری سا تھا۔ شمسؔ کے آنے کے بعد میں اُردو ادب میں دلچسپی لینے لگا۔ بالخصوص فکشن کا مطالعہ میں نے شمسؔ کے ترغیب دلانے پر ہی کیا۔ مگر ادب کے علاوہ شمس کی ذات میں سوالات کا انمول خزانہ بھی تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم گرمیوں کی راتوں کو چارپائی پر دراز ہو کر ستاروں کو دیکھتے اور اتنی وسیع و بے کنار کائنات کے بارے میں سوچتے۔ مگر کائنات کے مُعمّے کو حل کرنے کے عام فہم نسخوں سے ہم مطمئن نہیں تھے۔ ہمیں تو ایک نئے زاویۂ نگاہ کی طلب تھی جو اس عظیم "اسرار" کے پردے کو چاک کر سکتا۔ تب ایک روز میں نے اس سے کہا کہ و۔ع۔خ کے پاس چلتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہی ہمارے سوالوں کے جواب فراہم کر سکتے ہیں۔

(۳۲)

ہم مسلسل تین ماہ تک ہر روز و۔ع۔خ کی "سنگت" میں بیٹھتے رہے اور لوگ بھی آتے مگر ہم و۔ع۔خ کے اُپدیش میں اتنے منہمک ہوتے کہ ہمیں قطعاً پتہ نہ چلتا کہ کون آیا کون گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ تین ماہ پر پھیلے ہوئے اس "اُپدیش" میں و۔ع۔خ شاذ ہی تکرار کے مرتکب ہوئے۔ بس معرفت کا ایک سمندر تھا کہ ہر روز ان کے سراپا سے نکل کر ہمیں بہالے جاتا۔ وہ ہمارے بڑے بڑے سوالات کو چھوٹی چھوٹی کہانیاں بیان کر کے حل کر دیتے۔ کہتے کہ بات بچّوں کی زبان میں ادا ہونے لگے تو سمجھو یہ تمھاری گرفت میں پوری طرح آگئی۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ پچیس تیس سال تک انھوں نے تصوّف اور ویدانت کا مُطالعہ کیا تھا اور ہندوستان بھر میں صوفیوں، یوگیوں اور ویدانتیوں کی تلاش میں پھرتے رہے تھے۔ مطالعہ کا انداز یہ تھا کہ ساری ساری رات دئے کی روشنی میں کتاب پڑھتے رہتے۔ صبح کی اذان کی آواز بلند ہوتی تو انھیں پتہ چلتا کہ رات بیت گئی ہے۔ مطالعہ کے اس انداز نے پچاس کی عمر تک ان کا ساتھ دیا۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ جب وہ پچاس برس کی عمر کو پہنچے تو کتابوں سے متنفّر ہو گئے کیونکہ ان میں الفاظ کا ضیاع بہت زیادہ تھا۔ کہتے کہ لفظ تو جنّ کی طرح ہے اس پر قابو رہے تو تابع رہتا ہے ـــــ

بے قابو ہو جائے تو اس سے جان کا خطرہ ہے۔ لہٰذا وہ نہایت سادہ زبان میں چھوٹی چھوٹی تمثیلوں کی مدد سے باتیں کرتے۔ مگر ہمیں صاف محسوس ہوتا کہ ان کا علم کتابی نہیں ہے بلکہ روحانی تجربے سے پھوٹا ہے دراصل یہ وہی فرق ہے جو مسائلِ تصوّف بیان کرنے اور محسوس کرنے میں ہے۔ شاعری میں اسے آورد اور آمد کے خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ و۔ع۔خ باتیں کرتے ہوئے بعض اوقات آنکھیں میچ لیتے اور چند لمحوں کے لئے اپنے اندر اُتر جاتے یا شاید موم کی طرح پگھل کر پوری کائنات میں سرایت کر جاتے۔ جُز اور کُل کے فرق کو بیان کرتے ہوئے کہتے کہ جُز کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کُل میں جذب ہونے کی کوشش کرے۔ قطرے کو کیا پڑی ہے کہ وہ سمندر کی تلاش کرے۔ قطرے کو توصرف یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ خود سمندر ہے۔ قطرہ اور سمندر دونوں پانی ہیں۔ مقدار اور حجم کا فرق بے معنی ہے۔ فرق تو جوہر کا ہوتا ہے اور جوہر کے اعتبار سے قطرے اور سمندر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کہتے کہ صوفی کا کام فقط یہ ہے کہ وہ تمھاری آنکھوں کا رُخ تبدیل کردے ایسا کرنے کے لئے آنکھوں کے سامنے آئینہ لانے کی ضرورت ہے۔ تب آنکھیں خود کو دیکھنے لگیں گی۔ رُوحانی اعتبار ہی سے نہیں مادی اعتبار سے بھی پوری زندگی بلکہ پورا موجود (EXSISTENCE) ایک ہے۔ اس میں دوئی کا ہونا محض فریبِ نظر ہے۔ و۔ع۔خ دنیا کو ترک کرنے یا سنیاس اختیار کرنے کے روایتی تصور کو نہیں مانتے تھے۔ کہتے ترک کیسے کروگے ؟۔ جہاں جاؤگے "نئے رشتے" وجود میں آجائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ رشتوں میں تبدیلی آئے گی ــــــ! سو ترک کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس کُلبلاتی ہوئی نام رُوپ کی حامل کائنات میں رہتے ہوئے تم نام رُوپ سے اُوپر اُٹھ جاؤ اور لحظہ بھر کے لئے خود کو اتنا پھیلاؤ کہ ہر شے تمہارے وجود کا حصّہ بن جائے۔ بس یہی اصل معرفت ہے۔ اس نکتے کی وضاحت کے لئے انھوں نے ایک روز ہمیں اُس راجہ کا قصّہ سنایا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ معرفت کے اعلیٰ ترین مدارج پر فائز تھا۔ ایک شخص کو یہ بات غلط نظر آئی۔ اس نے سوچا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی دنیادار راجہ اس مقام سے بھی آشنا ہو۔ سو راجہ کے پاس پہنچ کر اس نے اپنی اُلجھن بیان کی۔ راجہ نے دربان سے کہا کہ پانی سے لبالب بھرا ہوا ایک پیالہ اس شخص کی ہتھیلی پر رکھ دیا جائے۔ پھر راجہ نے کہا کہ اس شخص کو بازار سے گزارا جائے اور اگر پیالے میں سے ایک قطرہ بھی چھلکے تو اس کا سر قلم کر دیا جائے سو یہ

شخص روانہ ہوا اور گھنٹہ بھر کے بعد واپس دربار میں آیا تو راجہ نے اُس سے پوچھا کہ اس نے بازار میں کیا کچھ دیکھا۔ اُس شخص نے کہا راجہ میں تو اس پیالے میں ڈوبا ہوا تھا مجھے تو بازار نظر ہی نہیں آیا۔ اس پر راجہ بولا! اے شخص تو صرف چند لمحوں کے لئے پیالے میں غرق ہوا اور میں تو سدا سے اس میں ڈوبا ہوا ہوں۔

و۔ع۔خ ہمیں اکثر مولانا رُوم اور فریدالدین عطّار کے اشعار سناتے۔ شمس کی مادری زبان فارسی تھی۔ اس لئے اسے ان اشعار کو سمجھنے میں دقّت نہیں ہوتی تھی۔ میرے لئے فارسی ایک اکتسابی زبان تھی لہٰذا بعض اوقات مجھے شعر کو سمجھنے میں دقّت محسوس ہوتی۔ البتّہ سنسکرت اور عربی سے ہم دونوں نابلد تھے۔ لہٰذا جب و۔ع۔خ سنسکرت کا کوئی اشلوک پڑھتے یا عربی کا کوئی مقولہ بولتے تو ساتھ ہی اس کا ترجمہ بھی کرتے۔ انھوں نے الہامی کُتب کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ اور وہ اکثر ان کا ذکر بھی کرتے۔ "پُرانے عہد نامہ" میں تخلیقِ کائنات کی تمثیل کو وہ نئے نئے زاویوں سے بیان کرتے اور "غزل الغزلات" کے حصّے کو شاعری قرار دیتے۔ ویدوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان میں موجود شاعری ان دُعاؤں پر مشتمل ہے جو برکھا اور دُودھ اور پُتر کے حصول کے لئے تھیں۔ البتہ وہ اُپنشدوں کے بہت قائل تھے کہ ان سے فلسفے کے چھ مکاتب نے جنم لیا تھا۔ قرآنِ حکیم کے مطالعہ پر وہ بہت زور دیتے کہتے کہ کائنات اور اس کے اسرار کو سمجھنے کے لئے قرآنِ حکیم کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

اس سنگت کے تقریباً بیس برس بعد جب مَیں نے لاہور سے اوراق نکالا تو و۔ع۔خ کے کچھ خطوط "رادھے شیام کے نام" شائع کئے۔ لیکن اس سلسلے میں اصل کام ڈاکٹر انور سدید نے کیا۔ وہ و۔ع۔خ کی زندگی کے آخری ایّام میں انھیں ملے لیکن جلد ہی انھوں نے و۔ع۔خ کی بیاض اور خطوط تک رسائی حاصل کر لی اور و۔ع۔خ سے اجازت لے کر انھیں "رادھے شیام کے نام" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ ویسے و۔ع۔خ کا نام ۱۹۵۰ء کے فوراً بعد ہی دانشوروں کے حلقے میں عام ہونے لگا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۰ء تک (جب وہ فوت ہوئے) متعدّد نامور لوگ ان سے وزیر کوٹ جا کر ملے اور روشنی حاصل کی۔ ان میں مولانا صلاح الدین احمد، حمید احمد خاں، آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد، قیوم نظر، وجیہہ الدین احمد،

حفیظ جالندھری، کمار پاشی، غلام الثقلین نقوی اور متعدد دوسرے ادبا شامل تھے۔

(۳۳)

و۔ع۔خ کے اُپدیشوں نے ہمیں بیک وقت توڑا اور جوڑا تھا۔ توڑنے کی صورت یہ تھی کہ بچپن سے لے کر جوانی تک ہم نے کائنات اور زندگی کے بارے میں جو تصوّرات جمع کر رکھے تھے وہ ایک ہی ضرب میں پاش پاش ہو گئے تھے اور جوڑنے کی صورت یہ تھی کہ ہم ایک بلند تر سطح پر ایک نئے تصوّر کو تشکیل دینے میں کامیاب ہونے لگے تھے۔ ہم ایک ہی وقت میں بے چین اور دُکھی بھی تھے اور شانت اور خوش بھی۔ شمس نے کہ فطری طور پر زیادہ حسّاس اور دُوربین تھا، اِن اثرات کو مجھ سے کہیں زیادہ قبول کیا تھا۔ میں نے شمس کے بارے میں "ٹوٹا ہوا تارہ" کے عنوان سے جو مضمون ۱۹۴۸ء میں لکھا اس میں شمس کی یافت اور نایافت، کرب اور مسرّت، دونوں کو بیان کیا۔ مثلاً و۔ع۔خ کے اثرات کے تحت شمس جس رُوحانی تجربے سے گزرا اس کی صُورت یہ تھی:

"کہنے لگا۔ اب سے چند لمحات پہلے میں یہاں، اس سبزے پر بیٹھا تھا۔ چاروں طرف مکمل سکوت طاری تھا۔ کائنات نے گویا دم سادھ لیا تھا۔ نہر کے اِس کنارے پر سے ایک فاختہ اُڑی اور اُن درختوں کے اُوپر سے اُدھر کو گھوم گئی اور مجھے یکایک محسُوس ہوا کہ کائنات کی ہر شے، درخت، پانی، زمین اور آسمان گھومنے لگے ہیں، گھومنے لگے ہیں اور میں پھیل رہا ہوں تم شاید یقین نہ کرو کہ مَیں نے خود کو ایک نقطہ سے اُبھر کر چاروں اطراف میں اس برق رفتاری سے پھیلتے ہوئے دیکھا ہے کہ مَیں چند لمحوں میں آکاش سے زیادہ وسیع ہو گیا تھا۔ کوئی شے باقی نہیں رہی تھی نہ زمین تھی نہ آسمان، نہ چرند، نہ پرند، نہ درخت، نہ کھیت، صرف "مَیں" باقی رہ گیا تھا۔ خیالات کی پرواز تک رُک گئی تھی —— صرف اپنے پھیلاؤ اور لامحدود وسعت کا ایک بے پایاں احساس باقی رہ گیا تھا۔"

جب دوسرے روز ہم و۔ع۔خ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شمس نے اپنے اس تجربے کو بیان کیا تو و۔ع۔خ مسکرائے اور کہا کہ یہ "انو بھاؤ" ہے۔ مگر قبل از وقت ہوا ہے!

اس وقت تو ہم و-ع-خ کے اس لطیف اشارے کو گرفت میں نہ لے سکے لیکن بعد کے واقعات نے بتایا کہ ان کا خدشہ کس قدر درست تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ "حضوری" کے لئے پہلے تیاری بہت ضروری ہے۔ اگر انسان رُوحانی تجربے کو برداشت کرنے کے قابل نہ ہو تو وہ اس کی تاب نہ لاکر ٹوٹ پھوٹ بھی سکتا ہے۔ کوہِ طُور کا واقعہ اس کی ایک مثال ہے کہ تجلّیٔ ذات کی تاب نہ لاکر حضرت موسٰی علیہ السّلام بے ہوش ہو گئے۔ دوسری طرف جب حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم معراج کے موقع پر ذاتِ باری کے روبرو آئے تو انھوں نے اپنے ہوش و حواس، اپنی ذات، اپنے وجود کو برقرار رکھا۔ کیونکہ وہ رُوحانی طور پر اس "عظیم تجربے" کے لئے تیار تھے۔ قبل از وقت "انوبھاؤ" کی مثالیں جابجا موجود ہیں۔ سوامی رام تیرتھ نے ۲۹ برس کی عمر میں خودکشی کر لی کہ "روشنی" کے نظّارہ نے انھیں اندر سے بھسم کر دیا تھا۔ دوسری طرف گوتم زندگی کے مختلف مدارج سے گزر کر آہستہ آہستہ اس تابناک لمحے کی طرف آئے۔ لہٰذا بھسم نہ ہوئے۔ شمس آغا کو جب روحانی تجربہ ہوا تو اس کی عمر شاید بائیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ بلکہ میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ یہ ایک ادھورا رُوحانی تجربہ تھا۔ اگر تجربہ بھرپور ہوتا تو شمس کی عمر اتنی چھوٹی تھی کہ وہ اس تابناک لمحے سے باہر آ ہی نہ سکتا۔ تاہم اس کے گہرے اثرات اس کی شخصیت پر مرتسم ہوئے۔ اور وہ زندگی کے باقی چند سال ایک بے پتوار کشتی کی طرح ڈولتا پھرا۔

اس تجربے سے قبل شمس کو محبّت کا تجربہ بھی ہوا تھا۔ چونکہ اس وقت مجھے شمس کے ہاں رُوحانی تجربہ اور محبّت کے تجربہ کا باہمی رشتہ معلوم نہ ہو سکا۔ اس لئے مَیں نے "ٹوٹا ہوا تارہ" بس اس رشتہ کو پوری طرح گرفت میں نہ لیا۔ تاہم آج کہ چالیس برس کے فاصلے سے اس پر ایک نگاہ ڈالتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ روحانی تجربے نے شمس پر مادے کی دُنیا کی بے معنویت کو اس حد تک آشکار کر دیا تھا کہ وہ بعض اوقات جذباتی رشتوں کو بھی مسترد کر دیتا تھا۔ سو وہ المناک صورتِ حال پیدا ہوئی جس سے نجات پانے کے لیے اس نے خودکشی کا پروگرام وضع کیا۔ اُن دنوں وہ بے حد دکھی تھا۔ شریانوں میں دوڑتا ہوا لہو اسے ایک بامقصد زندگی بسر کرنے پر اکساتا، اسے تخلیق کی طرف راغب کرتا۔ (یہ تخلیق کاری اِزدواجی زندگی کے بجائے ادب کے معاملے میں فعّال ہوئی اور شمس نے تھوڑے ہی عرصے میں ایسے شاہکار افسانے تخلیق کر لئے، جو آج بھی زندہ ہیں۔)

دوسری طرف روشنی کی ایک جھلک پا کردہ مادی زندگی اور اس سے منسلک حیاتیاتی سطح کی تخلیق کاری کو بے معنی اور لاحاصل سمجھنے لگا تھا ۔ وہ دراصل چکّی کے دو پاٹوں میں آگیا تھا اور بالآخر جب یہ پاٹ ایک دوسرے کے قریب آئے تو وہ ان میں پس کر رہ گیا۔

اُن دنوں مَیں ہمہ وقت شمسؔ کے ہمراہ رہتا۔ نتیجہ یہ کہ اس کے دُکھ نے مجھے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پوری زندگی اور کائنات مجھے بھی بے معنی ABSURD نظر آنے لگی۔ چنانچہ جب اس نے خودکشی کا پروگرام وضع کیا تو مَیں نے بھی اس میں شریک ہونے کا ارادہ کر لیا۔ تاہم مَیں شاید اندر سے اس کے لئے پوری طرح تیار نہیں تھا۔ وجہ یہ کہ میرے لئے کائنات کا اسرار ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ میرے لئے تو ابھی اس اسرار MYSTERY کی ابتدا ہی ہوئی تھی۔ بعد ازاں مَیں زندگی بھر اس اسرار کے اندر سفر کرتا رہا اور آج بھی کر رہا ہوں اور یہ اسرار ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ مگر شمسؔ کے لئے اسرار ختم ہو گیا تھا۔ اُسے محسوس ہوتا کہ اس نے کائنات کے راز کو پالیا ہے۔ اور اب اس کے لئے زندہ رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔ میں اُس سے بحث کرتا اور کہتا کہ خودکشی ضرور کریں گے ۔ مگر ابھی نہیں ۔ دس برس کے بعد! —— مگر شمسؔ کو بڑی عجلت تھی ۔ وہ جلد از جلد روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ انہیں دنوں اس نے وزیر کوٹ میں پہلی بار خودکشی کی کوشش کی۔ اس نے زہر پی لیا تھا۔ مگر مَیں اُس کے ساتھ کمرے میں مقفل ہو گیا۔ اسے فرسٹ ایڈ مہیا کی جس سے زہر خارج ہو گیا اور وہ بچ گیا۔ مگر وہ مجھ سے شکایت کرتا رہا کہ مَیں اس کے راستے میں رکاوٹ تھا۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ وہ کسی روز چپکے سے چلا جائے گا اور دُور پہاڑوں میں جا کر خود کو ختم کرلے گا۔ اور پھر وہ منحوس دن آپہنچا۔ ہم دونوں پہلی بار مولانا صلاح الدین احمد سے ملنے گئے تھے۔ شمسؔ کو انہیں اپنے ناول کا مسوّدہ دینا تھا۔ یہ کام ہو گیا تو وہ یکایک کھِل اُٹھا جیسے اس نے اپنے شانوں پر سے کوئی بھاری بوجھ اتار دیا تھا۔ (افسوس کہ جب ۱۹۴۷ء میں مولانا صلاح الدین احمد کی لائبریری نذر آتش ہوئی تو یہ مسوّدہ بھی جل کر راکھ ہو گیا۔) اگلے روز یعنی ۳ دسمبر ۱۹۴۵ء کو وہ غائب ہو گیا۔ چند روز بعد دہلی سے اس کا آخری خط آیا۔ تب سے اب تک مکمل خاموشی ہے۔ پورے چالیس برس پلک جھپکنے میں گزر گئے ہیں۔

(۳۴)

۱۹۴۵ء کا پورا سال مَیں اور شمسؔ اکٹھے رہے تھے ۔ بے معنویّت کے کرب سے خود کو نجات دلانے

کے لئے میں نے سوچا کہ ہمیں سفر کرنا چاہیئے۔ چنانچہ جب گرمیاں آئیں تو ہم ایک روز کانگڑہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ ارادہ تھا کہ ہم کُلّو کی وادی کی سیر کریں گے۔ مگر امرتسر اسٹیشن پر شمس دوسرے پلیٹ فارم پر اخبار لینے گیا تو گاڑی چل پڑی۔ شمس نے بھاگ کر گاڑی پکڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ سو میں اور میرا بھتیجا نثار شمس کے بغیر ہی کانگڑہ جا پہنچے۔ ہمارے ساتھ ہمارا پٹھان باورچی بھی تھا۔ اُن دنوں کانگڑہ میں کوئی ہوٹل نہیں تھا جہاں ہم رات گزار سکتے کسی نے کہا کہ کانگڑہ کے بڑے مندر میں چلے جاؤ اور مندر کے مسافر خانے میں آرام کر لو۔ ہم نے مندر پہنچ کر ایک کمرہ کے لئے درخواست کی۔ مندر کے محافظ کو شک پڑا کہ شاید ہم ہندو نہیں ہیں۔ سو اس نے لال انگارہ آنکھوں سے ہمیں گھورتے ہوئے پوچھا کہ کیا ہم ہندو ہیں؟ نثار بولا ہاں ہاں ہم ہندو ہیں۔ محافظ نے پوچھا۔ اگر ہندو ہیں تو بولو تمہاری جات کیا ہے؟ میرا تو رنگ فق ہو گیا۔ مگر نثار نے کمال خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی توجہ میرے بیگ کی طرف مبذول کرائی جس پر WAZIR AGA لکھا تھا۔ لفظ آغا AGA پر انگلی رکھ کر بولا: یہ ہے ہماری جات AGA یعنی اگروال AGARWAL مندر والے کے ہونٹوں پر موہوم سا تبسّم نمودار ہوا۔ اور وہ ہمیں کمرے میں بٹھا کر چلا گیا۔ ہم نے فوراً نہانے کا سامان اُٹھایا اور مندر کے غسلخانے میں جا کر دیر تک غسل کرتے رہے۔ مگر مندر کے محافظ کا شک ابھی دور نہیں ہوا تھا۔ اگلی صبح وہ دوبارہ آ گیا اور اس بار ہم سے استفسار کرنے کے بجائے اس نے وہی سوال ہمارے پٹھان باورچی جبّار خان سے کر دیا۔ پھر کیا تھا۔ پٹھان باورچی آپے سے باہر ہو گیا۔ کہنے لگا! کافر کا بچّہ! تم ہمیں ہندو بولتی ہے۔ اللہ پاک کی قسم ہم تمہیں قتل کر دے گا۔ ـــــ قتل تو وہ کیا کرتا۔ البتہ دوسرے ہی لمحے ہم اپنا سامان اٹھائے مندر سے بھاگ رہے تھے کیونکہ مندر والے کے شور مچانے پر اب مندر کے باہر خاصا بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔

مندر سے نکل کر ہم واپس ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ جہاں شمس صبح کی گاڑی سے آ چکا تھا۔ چنانچہ ہم نے سامان اٹھایا اور اپنے سفر کے پہلے پڑاؤ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہمارا پہلا پڑاؤ کانگڑہ شہر سے چند کوس دُور ایک نواب صاحب کا پہاڑی بنگلہ تھا ہم نواب صاحب کے نام والد صاحب سے ایک تعارفی چٹھی بھی لائے تھے۔ خیال تھا کہ نواب صاحب کے جاگیر کے باغات میں گھومیں گے اور شکار بھی کریں گے۔ مگر جب ہم نواب صاحب کے ہاں پہنچے تو ایک ایسا واقعہ

پیش آیا کہ نہ صرف ہمارا شکار کا پروگرام فسخ ہوگیا بلکہ اس سارے علاقے ہی سے دل متنفر ہوگیا۔ ہوا یہ کہ ہم نواب صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ انھیں ملنے ایک اطالوی آگیا۔ نواب صاحب نے اس سے ہمارا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ PRISONER OF WAR ہے۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ نواب صاحب کی کوٹھی سے چند سو گز کے فاصلے پر ہی اطالوی قیدیوں کا ایک کیمپ تھا اور یہ اطالوی اس کیمپ ہی سے آیا تھا۔ میں نے نواب صاحب سے کہا کہ اطالوی جنگ جو نہیں ہیں، اور میدانِ جنگ میں معمولی سی ناسازگار صورتِ حال کو سامنے پاتے ہی ہزاروں کی تعداد میں ہتھیار ڈال دیتے ہیں بعد ازاں انگریز بہادر ان قیدیوں کو ہندوستان بھیج دیتا ہے جو بجائے خود ہزاروں میلوں پر پھیلا ہوا ایک قید خانہ ہے۔ اس صورتِ حال سے لطف لینے کے لئے پچھلے دنوں کسی ظریف نے ایک بڑا سا پوسٹر چھاپ کر لندن کی دیواروں پر چسپاں کر دیا تھا۔ پوسٹر کے الفاظ کچھ یوں تھے:

JOIN THE ITALIAN ARMY AND SEE INDIA FREE.

لطیفہ سُن کر نواب صاحب تو محظوظ ہوئے البتّہ اطالوی ہونقوں کی طرح ہمیں بِٹ بِٹ دیکھتا رہا۔ اسی دوران نواب صاحب کے کسی نوکر نے اطلاع دی کہ ان کے باغات میں کوئی جنگلی جانور گھس آیا ہے۔ نواب صاحب نے اپنی بندوق اٹھائی اور لپک کر جائے کے باغات میں داخل ہوگئے۔ اس سے پہلے کہ ہم ان کا ساتھ دیتے اطالوی نے میری بندوق اٹھائی اور وہ بھی ان کے پیچھے لپکتا چلا گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد نواب صاحب تو آگئے مگر اطالوی واپس نہ آیا۔ نواب صاحب سخت پریشان تھے۔ کہنے لگے کہ ایک جنگی قیدی کے ہاتھ میں بندوق کا آجانا نہ صرف خلافِ قانون ہے بلکہ حد درجہ خطرناک بھی ہے۔ ہمارے تو پسینے چھوٹ گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ بارے کوئی آدھ گھنٹے کے بعد جب یہ اطالوی واپس آیا تو ہماری جان میں جان آئی۔ شمسؔ نے بے اختیار ہو کر اقبالؔ کا مصرع پڑھا: ع

حمیّت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

اور مطلع صاف ہوگیا۔ مگر ایک ہی دن میں دو ناخوشگوار واقعات نے ہمیں سخت بددل کر دیا تھا۔ چنانچہ ہم نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ میں نے شمسؔ سے کہا کہ کُلّو کی سیاحت کا پروگرام

منسوخ کرتے ہیں اور اس کے بجائے کشمیر چلتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے لاہور پہنچ کر کشمیر جانے والی بس میں اپنی سیٹیں بُک کرائیں اور اگلے ہی روز کشمیر کے لئے روانہ ہو گئے۔

(۳۵)

شمس کے لئے کشمیر یاترا کا یہ پہلا موقع تھا، جب کہ مَیں ایک بار پہلے بھی کشمیر جا چکا تھا۔ یعنی ایم اے کرنے کے فوراً بعد مگر اُس وقت میرے دو بھائی میرے ساتھ تھے — ایک برادرِ کلاں دوسرا برادرِ خورد! —— میری بدقسمتی کہ مَیں بیک وقت کلاں بھی تھا اور خورد بھی۔ سو مجھے ہمہ وقت دوہرا کردار ادا کرنا پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ سیاحت بتدریج سفر میں تبدیل ہوتی چلی گئی مگر اِس بار میں اپنے دوست کے ہمراہ تھا اور ہم عمری اور ذہنی ہم آہنگی نے بہت سے مسائل حل کر دئے تھے۔

لاہور سے کشمیر جانے والی بس علی الصّبح روانہ ہوئی۔ دوپہر تک ہم جمّوں سے گزر کر کُد پہنچ گئے اور شام تک بانہال جا پہنچے۔ بانہال ایک چھوٹی سی جگہ ہے جس کے چاروں طرف خشک پہاڑ ہیں۔ رات ہم نے بانہال میں گزاری اور اگلی صبح بس سامنے کے بہت بلند پہاڑ کی چوٹی کی طرف رینگنے لگی جب ہم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو دیکھا کہ ہر طرف برف کے بڑے بڑے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ وہاں ایک خستہ حال طویل سرنگ تھی۔ جس کی چھت جگہ جگہ سے ٹپک رہی تھی۔ ہماری بس اس سرنگ میں سے بخیر و عافیت گزر کر پہاڑ کے دوسری طرف پہنچی تو سکھ ڈرائیور نے بس روک دی اور مسافروں سے کہا کہ وہ بس سے اُتر کر کشمیر کا نظارہ کریں۔ ہم جلدی جلدی بس سے اُترے اور پھر ایک نظر سامنے کی طرف دیکھا۔ سامنے ایک سبز رنگ کا طویل و عریض پیالہ تھا جس کے بلند و بالا کنارے برف سے لدے کھڑے تھے۔ پیالے کی تہہ میں ندیوں، دھان کے کھیتوں اور درختوں نے توسوں اور لکیروں میں کوئی پُر اسرار سی کہانی لکھ دی تھی اور پورا منظر ایک جیتے جاگتے تصویری شاہکار کی طرح ہماری نظروں کے سامنے اُبھر آیا تھا۔ اس ناقابلِ بیان حُسن کو دیکھ کر ہماری آنکھیں خیرہ اور زبانیں گنگ تھیں۔ پھر اس سناٹے میں ایک آواز گونجی یہ شمس کی آواز تھی وہ کہہ رہا تھا: OUT OF HELL INTO HEAVEN.

واقعی بانہال کی بدصورتی کے فوراً بعد کشمیر کے حُسن کا نظارہ جہنم سے جنّت میں قدم رکھنے ہی کے مترادف تھا۔ بس دوبارہ روانہ ہوئی اور سبز رنگ کے پیالے کے اندر اُترتی چلی گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس سڑک پر آگئی جس کے دونوں طرف صدیوں پرانے بلند و بالا درخت پاسبانوں کی طرح کھڑے تھے۔ یہ سڑک سیدھی سرینگر کی طرف جاتی ہے۔ مگر فی الحال ہماری منزل سرینگر نہیں تھا۔ ہمیں اچھابل جانا تھا جہاں مُغلوں کا ایک قدیم باغ اور سرائے نما ایک ہوٹل تھا سو ہم نے بس کو خیرباد کہا۔ مٹن پہنچے اور پھر وہاں سے تانگہ میں سوار اچھابل جا پہنچے۔ اس کے بعد ہم پورا ایک ماہ اچھابل میں مقیم رہے۔

(۳۶)

اُن دنوں اچھابل ایک گاؤں سا تھا جس کے چاروں طرف دھان کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ اُن کھیتوں میں خوبصورت کشمیری عورتیں لمبے لمبے پھرن پہنے کام کرتی دکھائی دیتی تھیں جب کہ کشمیری مرد اپنے گھروں کی کھڑکیوں میں بیٹھے گلابی چائے پیتے مسافروں کو بے معنی نظروں سے گھورتے رہتے تھے۔ مُغل باغ میں چھوٹی چھوٹی ندّیاں تھیں جن میں ٹراؤٹ مچھلیاں تیرتی ہوئی نظر آتیں مگر کسی کشمیری کو جرأت نہیں تھی کہ وہ ان میں سے کوئی مچھلی پکڑ سکتا۔ یہ سب مہاراجہ کشمیر کی ملکیّت تھیں اور ان دنوں مہاراجہ کشمیر، اہلِ کشمیر کے لئے مجسم TERROR تھا۔ لوگ بے حد غریب اور بہت ڈرے ہوئے تھے۔ دوسرے سیّاح تو صرف چند روز اچھابل میں قیام کرنے اور سیر کرنے، بادام کھانے اور گھڑسواری کرنے کے بعد واپس چلے جاتے مگر ہم اچھابل میں رہنے کے لئے گئے تھے۔ اردگرد کے قابلِ دید مقامات مثلاً اننت ناگ (جہاں سے دریائے جہلم نکلتا ہے) اور روائلو کی وادی (جو لدّاخ کے راستے میں ہے) کو دیکھنے کے لئے ہم گاہے گاہے گھوڑوں پر سوار طویل سفر بھی کرتے مگر زیادہ تر اچھابل میں رہنا ہی اچھا لگتا تھا۔ چند ہی روز میں ہم اچھابل کے باسیوں سے مانوس ہوگئے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ وہ ہم سے مانوس ہوگئے اور پھر انھوں نے ہمارے لئے اپنے گھروں کے دروازے وا کردئے اور ہم بلا روک ٹوک ان کے گھروں میں آنے جانے لگے۔ ہمارے لئے ان کے گھروں کے

اندر جانا ایک اتنا کربناک تجربہ تھا کہ اسے بیان کرنا بھی مشکل ہے۔ میں نے دیہاتوں اور شہروں میں غربت کے مناظر پہلے بھی دیکھے تھے اور خود بھی غربت کا مزہ چکھا تھا۔ مگر غربت کو اس کی ننگی حالت میں دیکھنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ ان کے گھروں میں کچھ بھی تو نہیں تھا۔ سوائے غربت کے جو در و دیوار سے جھانک رہی تھی۔ پھر ہمیں محسوس ہوا کہ غربت تپ دق کی طرح ان کے جسموں میں بھی سرایت کر گئی تھی۔ اور اب ان کی آنکھوں میں سے ہمیں گھور رہی تھی۔ ان کی شخصیتیں بالکل ٹوٹ چکی تھیں۔ خودی یا خودداری کا نام و نشان تک باقی نہیں تھا۔ جب ہم کسی گھر میں داخل ہو کر اس کے مکینوں کے پاس فرش پر بیٹھ جاتے تو ان کی ممنونیت کا والہانہ اظہار قابلِ رحم ہوتا کیونکہ اس اظہار میں بخشیش کی طلب بھی شامل ہوتی۔ اس سے پہلے میں نے بعض افراد کو تو اس قسم کی حالت میں دیکھا تھا مگر پورے معاشرے کو اس طرح ٹوٹا ہوا نہ پایا تھا۔ تاہم اچھابل کے قیام کے دوران ہمیں یہ احساس بھی بار بار ہوا کہ ہوا چلنا شروع ہو گئی ہے اور ساکن پانی کی سطح پر سلوٹیں پڑنے لگی ہیں اور اب وہ دن شاید زیادہ دُور نہیں جب یہ پسے ہوئے کشمیری ایک زبردست قوّت بن کر اٹھیں گے اور بقول فیض اپنے آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا ڈالیں گے۔

ہم نے سفر تو اس لئے اختیار کیا تھا کہ ہم بے معنویّت کے احساس سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے مگر اچھابل کے تجربات نے ہمیں توڑ کر رکھ دیا اور بے معنویّت کا احساس مزید گہرا ہونے لگا۔ بالخصوص شمس کی حالت تو غیر تھی۔ انہیں دنوں اس نے دو تین افسانے لکھے جن میں اس نے اپنے ان کربناک تجربات کو بیان بھی کیا۔ مگر چند افسانے یا نظمیں لکھ کر ہم صرف ایک حد تک ہی تزکیۂ باطن میں کامیابی حاصل کر سکتے تھے۔ دراصل المیّہ بہت بڑا تھا۔ معاشرتی سطح کی عدم مساوات نے پوری کائنات کی بے معنویّت کو ہم پر آشکار کر دیا تھا۔ اعمال، عقائد، نظریات ——— اِن سب کو ہم اتنے فاصلے سے دیکھنے لگے تھے کہ ہمارے لئے ان کا جواز تلاش کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ جب میں نے صورتِ حال کو بگڑتے دیکھا تو سوچا کہ ہمیں اچھابل کے قیام کو قطع کر دینا چاہیئے۔ سو ایک صبح ہم نے اپنا سامان سمیٹا، ایک تانگہ کرایہ پر لیا اور پہلگام کے لئے روانہ ہو گئے۔

(۳۷)

پہلگام پہنچے تو وہاں منظر ہی دوسرا تھا۔ اچھابل کے حُسن میں ایک آشنا ضبط تھا۔ یہ حُسن اس کنواری لڑکی کا سا تھا جو بھڑکیلے لباس اور چمکتے ہوئے زیورات کے بغیر اپنے فطری انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ جبکہ پہلگام کا حُسن اس الھڑ مٹیار کا سا تھا جس کی نئی نئی شادی ہوئی ہو اور جس کی پازیب ہمہ وقت چھنکتی رہتی ہو۔ جنگلات سے ڈھکے ہوئے برف پوش پہاڑ تیز رفتار سر پٹکتی ہوئی دونوں ندّیوں کے کناروں پر آ کر رک گئے تھے۔ آگے ان ندّیوں کا سنگم تھا۔ اردگرد کے برف پوش پہاڑ دن میں کئی رُوپ بدلتے۔ علی الصّبح وہ یوگیوں کی طرح سمادھی لگائے نظر آتے۔ دوپہر کے قریب جب ہوا تیز چل رہی ہوتی تو ان پر ہریالی کی لہریں سی نمودار ہو جاتیں۔ شام کو غروبِ آفتاب کے وقت ان کی برف گلابی ہو جاتی۔ تمتماتے ہوئے رخساروں کے مانند! اور پورا پہلگام سونے کی ایک ڈلی کی طرح چمک اٹھتا۔

پہلگام کا منظر ہی نہیں اس کے باسی بھی اچھابل والوں سے مختلف تھے۔ اچھابل میں سیّاح کم اور کشمیر کے اصل باشندے زیادہ نظر آتے۔ پہلگام میں اصل باشندے تعداد میں کم تھے جب کہ سارے پہلگام کو دُودھیا سفید خیموں نے ڈھانپ رکھا تھا جن میں زیادہ تر بمبئی کے امیر کبیر کریہہ المنظر سیٹھ اور ان کی نازک اندام خوبصورت بیویاں رہ رہی تھیں۔ یہ لوگ سارا دن اپنے خیموں کے اندر رہتے مگر شام کے قریب بن سنور کر باہر نکل آتے اور ندّیوں کے ساتھ دُور دُور تک بکھر جاتے۔ چند روز اس صورتِ حال کو دیکھنے کے بعد میں نے ایک قطعہ لکھ کر شمس کے حوالے کیا اور پھر ہم جتنا عرصہ پہلگام میں رہے بمبئی کے سیٹھوں اور سیٹھانیوں کو دیکھتے ہی اس قطعے کو گنگنانے لگتے۔ قطعہ یہ تھا:

قلّۂ کوہ سے جب کھیل رہے ہوں بادل
جب فضاؤں میں ہوں نمناک ڈھلانیں عُریاں
تیز ندّی پہ ہو جب شام کی سُرخی کا نزول
سرد خیموں سے نکل آتے ہیں جن اور پریاں (۱۹۴۵ء)

پہلگام کی یہ صُورتِ حال مستقل نوعیّت کی تھی۔ مگر پھر ایک روز ہمیں وہاں زبردست ہلچل نظر آئی اور کم از کم ایک دن کے لئے پہلگام کے باسیوں کے معمولات میں فرق آ گیا۔ ہوا یہ کہ انھیں دنوں پنڈت جواہر لعل نہرو انگریز کی قید سے آزاد ہوئے تھے اور اب وہ تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے کشمیر کی یاترا کر رہے تھے۔ ایک روز امرناتھ کی طرف جاتے ہوئے وہ پہلگام میں بھی رُکے اور ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ نجانے اتنے ڈھیر سارے لوگ کہاں سے آ گئے تھے۔ شیخ عبداللہ نے تمہیدی کلمات کہے۔ پھر نہرو نے گھنٹہ بھر تقریر کی جس کا لُبِ لباب یہ تھا کہ وہ ان فلک بوس پہاڑوں سے روحانی قوّت حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں۔ جلسہ سے پہلے انھوں نے فرمائش کی کہ اقبال کی نظم "سارے جہاں سے اچھا" سے جلسے کا آغاز کیا جائے۔ یہ نظم تین موٹی موٹی بدصورت بنگالی عورتوں نے گا کر سنائی مگر جب انھوں نے نظم کا مصرع: "ہم بُلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا" گایا تو پنڈت نہرو نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور بے اختیار ہنس پڑے۔ بس پھر کیا تھا سارا جلسہ زعفران زار میں تبدیل ہو گیا اور تینوں بنگالی عورتیں شرم سے پانی پانی ہو گئیں۔

(٣٨)

پہلگام میں رہتے ہوئے ہمیں بمشکل دو ہفتے گزرے ہوں گے کہ شمس بیمار پڑ گیا۔ یہ بیماری جسمانی نوعیت کی نہیں تھی۔ بس یہ تھا کہ وہ گھنٹوں گم صُم سامنے کے پہاڑوں کو ایک تار دیکھتا رہتا۔ اندر کے روگ نے اس کے ہونٹوں کو مقفّل کر دیا تھا۔ پھر وہ میرے بغیر ہی ندّیوں کے کنارے دُور دُور تک جانے لگا۔ اس کی حالت ایک بے پتوار کشتی کی سی تھی جسے ہوا جدھر چاہتی اڑائے لئے پھرتی۔ ایک روز وہ امرناتھ کی جانب روانہ ہو گیا۔ مگر پھر راستے سے واپس آ گیا۔ پھر ایک روز جب وہ گئی رات تک واپس نہ آیا تو میں انتہائی فکرمند ہو گیا۔ رات دس بجے کے قریب وہ خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کر میں دھک سے رہ گیا۔ میں نے پہلے کبھی اس کی یہ حالت نہیں دیکھی تھی۔ کہنے لگا میں اس سامنے والے درختوں سے لدے پہاڑ کی چوٹی پر گیا تھا۔ وہاں میری ملاقات ایک لکڑہارے سے ہوئی۔ میں

آگے جانا چاہتا تھا مگر اس نے مجھے واپس ہونے پر مجبور کیا۔ کہا کہ آگے جان کا خطرہ ہے ـــــ بعد ازاں جب بھی میں نے اس واقعہ پر غور کیا ہے تو میں ہر بار اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ لکڑہارا باہر کی زندگی میں کہیں نہیں تھا۔ خود شمس کے وجود کا ایک حصّہ مجسّم ہو کر اس کے سامنے آگیا تھا اور پھر اس کے راستے میں سینہ تان کر کھڑا ہو گیا تھا۔ مگر یوں لگتا ہے جیسے شمس کی زندگی میں یہ لکڑہارا پہلی اور آخری بار ہی نمودار ہوا ــــ کیونکہ اس کے بعد اس کے راستے میں مجھے کوئی رکاوٹ نظر نہیں آئی۔ ہم چند روز سری نگر میں گزارنے کے بعد واپس وزیر کوٹ پہنچے۔ بے معنویّت کے جس احساس سے نجات پانے کے لئے ہم گئے تھے اس میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ بالخصوص شمس کی حالت تو بد سے بدتر ہوتی چلی گئی تھی۔ چنانچہ جلد ہی اس کی کربناک زندگی کا آخری دَور شروع ہوا جو بالآخر اس کی گمشدگی پر منتج ہوا۔ (اس کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔)

(۳۹)

شمس چلا گیا تو میں کچھ مدّت کے لئے "ہونے اور نہ ہونے" کے جان لیوا عالم میں بُری طرح گرفتار رہا۔ سینے پر جیسے منوں بھاری کوئی شے آگری تھی اور میں لمحہ بہ لمحہ اس کے بوجھ تلے پِستا جارہا تھا۔ میں نے گھر والوں کو اتنا تو بتا دیا کہ شمس اچانک غائب ہو گیا ہے مگر انھیں غائب ہونے کے پس منظر سے آگاہ نہ کیا۔ اس کی متعدّد وجوہ تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ میں شمس کی والدہ یعنی اپنی بہن کو صدمہ پہنچانا نہیں چاہتا تھا اور ہر چند کہ مجھے علم تھا وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا تاہم میں نہیں چاہتا تھا کہ میری بہن اُمّید کا دامن چھوڑ دے۔ مگر اس راز کو اپنے سینے میں دفن کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں خود مرقد کے کنارے پتّھر کے ایک کتبے میں تبدیل ہو گیا۔ سارے کومل احساسات اور جذبات پتھرا گئے۔ کسی کام میں جی نہ لگتا۔ سوچ بھی مفلوج ہو گئی تھی۔ یوں لگتا جیسے درخت، انسان، پرند سب مٹّی کے بنے ہوئے ہیں اور اگر میں نے ان میں سے کسی کو ہاتھ لگایا تو وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا۔ رات کو میں جب ستاروں پر ایک نظر ڈالتا تو وہ بھی مجھے مٹی کی ڈلیاں نظر آتے۔ دُکھ جب حملہ آور ہوتا ہے تو انسان احتجاج کرتا ہے جو رونے دھونے اور چیخنے چلّانے کی صُورت ہے یا پھر وہ بے حس ہو جاتا ہے جو

پتّھر میں تبدیل ہو جانے کی کیفیّت ہے ۔ میری صورت یہ تھی کہ مَیں بے حس ہو گیا تھا ۔ اُن دنوں مَیں نے کئی نظمیں لکھیں جن میں مَیں نے اپنے اندر کی اس کیفیّت کو گرفت میں لینے کی کوشش کی تھی ۔ ان نظموں میں سے دو کی آخری لائنیں یہ تھیں :

دُور سارس کی دُکھ بھری آواز !
میری تنہائیوں پہ روتی ہے
جانے کیوں سازِ دل کی ہر آواز
خود بخود بے قرار ہوتی ہے
پھر بھی مَیں یوں کھڑا ہوں غم بردوش
جیسے پتّھر کا سرد بُت ، خاموش !

سوچتا ہوں جیوں کہ مر جاؤں
خامشی زیست کے دھندلکوں کی
خامشی موت کے محلکوں کی
کس کو سینے سے اپنے چمٹاؤں !

پیچ در پیچ سینکڑوں راہیں
یوں اُلجھتی رہیں تو کیا ہوگا !
گر مَیں مرگ و حیات کے مابین
یوں لٹکتا رہا تو کیا ہوگا !

(۴۰)

شمس کی گم شدگی کے چند روز بعد جب میری حالت ذرا سنبھلی تو میں نے مولانا صلاح الدین احمد کو خط لکھ کر اس حادثے کی اطلاع دی اور پھر میرے اور مولانا کے درمیان چار پانچ خطوط کا تبادلہ

ہوا۔ مولانا بہت کچھ جاننا چاہتے تھے۔ اپنے آخری خط میں انھوں نے لکھا کہ میں لاہور آ کر ان سے ملوں یا پھر وہ خود وزیر کوٹ آجائیں گے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ابھی وزیر کوٹ آئیں کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ ایسی صورت میں اس واقعہ کا سارا پس منظر سامنے آجائے گا۔ سو میں ایک روز خود ہی لاہور جا پہنچا اور مولانا سے مل کر انھیں شمس کی زندگی اور اس کے پس منظر کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ شمس کے یوں اچانک چلے جانے کو مولانا نے بھی بہت محسوس کیا تھا۔ دوسری طرف جب میں نے اس راز کو اُگل دیا تو میرے سینے پر پڑا ہوا بوجھ بھی سرکنے لگا۔ اس بوجھ کو اُتارنے میں مولانا کی شخصیت کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ان کی شخصیت میں مجھے ایک عجیب سی توانائی کا احساس ہوا۔ یہ توانائی اس نوعیت کی تھی جو زندگی اور کائنات کو قبول کرنے سے جنم لیتی ہے۔ میرے لئے مولانا سے ملاقات ایک انوکھا تجربہ تھا۔ پہلی بار میں ایک ایسے شخص سے مل رہا تھا جو زندگی کو ایک بیش بہا نعمت سمجھتا تھا اور اس پُراسرار کائنات کو بنظرِ حیرت دیکھنے پر مائل تھا۔ آج بھی مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اگر مولانا سے میری ملاقات نہ ہوتی تو میں اس مثبت زاویۂ نگاہ سے متعارف نہ ہو سکتا اور قنوطیت اور بے معنویت کی دلدل میں دھنستا ہی چلا جاتا۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ پر چھائے ہوئے قنوطیت کے بادل مولانا سے پہلی ملاقات کے بعد بھی ایک طویل مدت تک چھائے رہے مگر اب ان میں بڑے بڑے شگاف پڑنے لگے تھے۔ مولانا سے ہر نئی ملاقات کے بعد میں محسوس کرتا کہ بادل مزید پھٹ گئے ہیں اور میں زندگی کی طرف ایک قدم اور بڑھ آیا ہوں۔

(۴۱)

میرے لئے ۱۹۴۶ء کا سال ذہنی CONVALASCENCE کا دور تھا۔ میں بڑی تیزی سے اپنی ذات کی کال کوٹھڑی سے باہر آ رہا تھا۔ رُوحانی طور پر خود کو مجتمع کرنے کے لئے میں نے سب سے پہلے قرآنِ حکیم کا مطالعہ کیا۔ میں عربی سے نابلد تھا۔ لہٰذا میں نے قرآن کے تراجم پڑھے۔ مجھے ایک عجیب سی کشادگی کا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے میں کسی گھنے گھر تے جنگل سے نکل آیا ہوں اور اب کسی وسیع و بے کنار میدان میں کھڑا ہوں جس پر ایک لامحدود آسمان جھکا ہوا ہے۔ یکایک تناظر بہت وسیع ہو گیا۔ فاصلوں کا احساس جاگا۔ اتنی بڑی کائنات میں اپنا وجود محض ایک موہوم سا نقطہ نظر آنے لگا۔ جب میرا وجود

سمٹا تو ظاہر ہے کہ اس وجود سے منسلک دُکھ اور کرب بھی سمٹا اور میں خود کو صحرا کے ایک جھونکے کی طرح محسوس کرنے لگا ـــــ قرآن حکیم کے مطالعہ کے کچھ مدت بعد میں نے عہد نامہ قدیم کا مطالعہ کیا پھر بدھ مت اور تاؤ مت کے بارے میں کچھ کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد و۔ع۔خ کی عطا کردہ سوامی رام تیرتھ کی کتاب "اِن وڈز آف گاڈ ریلائزیشن[لہ]" کی کئی جلدیں پڑھ ڈالیں۔ یہ کتاب ان تقاریر پر مشتمل تھی جو اس صدی کے آغاز میں سوامی رام تیرتھ نے امریکہ میں کی تھیں۔ اس کتاب کے مندرجات کا مجھے پہلے سے علم تھا کیونکہ و۔ع۔خ کے اُپدیشوں میں سوامی رام تیرتھ کا زاویۂ نگاہ بار بار بیان ہوا تھا۔ مگر جب میں نے خود سوامی رام تیرتھ کی ان تقاریر کو پڑھا تو "نقطہ" پھیل کر پوری کائنات میں تبدیل ہوتا نظر آنے لگا۔ مگر مستقل طور پر نہیں۔ دراصل اُن دنوں میں دو انتہاؤں کے درمیان گھڑی کے ایک پنڈولم کی طرح ڈول رہا تھا۔ کبھی کائناتِ اصغر MICROCOSM میں سمٹ جاتا، کبھی کائناتِ اکبر MACROCOSM میں تبدیل ہو جاتا۔ یوں لگتا جیسے ڈولنے کا ایک مستقل عالم میرا نوشتۂ تقدیر بن چکا ہے۔ جب میں نے مولانا صلاح الدین احمد سے اپنی اس نفسی کیفیت کو بیان کیا تو انھوں نے کہا کہ یہ تو بڑی مُبارک بات ہے۔ ان کے خیال میں تشویشناک بات "ٹھہرنا" یا منجمد ہونا یا کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں گھومتے چلے جانا ہے۔ جب آدمی تغیر کی زد میں آ جائے، ذہنی طور پر فعّال ہو اور اس کے ساتھ ہی اس کی نظریں بھی متجسس ہوں تو ایسی صورت میں پوری کائنات اس کے سامنے ایک کھُلی کتاب کی طرح آ جاتی ہے۔ پھر وہ چاہے تو ساری زندگی اس کتاب کا مطالعہ کرتا رہے اور لحظہ بھر کے لئے بوریت یا ذہنی کشمکش کا شکار نہ ہو۔ مولانا کی ان باتوں نے میرے زخموں پر پھاہے کا کام کیا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں جس قسم کی کیفیات کا اسیر ہوں ان کا نفسیاتی تجزیہ کرنا بہت ضروری ہے۔ خود مولانا بھی ان دنوں نفسیات کے مُطالعہ پر بہت زور دے رہے تھے۔ ان کا مؤقف یہ تھا کہ انسان اپنے بدن کی قید میں ہے اور بدن اسے اپنے قوانین کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ انسان اگر لحظہ بھر کے لئے اپنے بدن سے باہر آ

لہ SWAMI RAM TIRTHA: IN WOODS OF GOD REALIZATION.

کر اس کی کارکردگی کا جائزہ لے تو اسے سکونِ قلب کے قیمتی لمحات ارزانی ہو سکتے ہیں۔ مگر مولانا اس کے علاوہ اُردو ادب کے فروغ و ارتقا کے لئے بھی نفسیات کے مطالعہ کو ناگزیر قرار دے رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں بطورِ خاص نفسیات کا مطالعہ کروں اور پھر اس کی روشنی میں "ادبی دنیا" کے لئے کچھ مضامین سپردِ قلم کروں۔ میں نے مولانا سے کہا کہ مجھے تو صرف انگریزی میں تھوڑا بہت لکھنے کا تجربہ ہے اُردو میں اپنے خیالات کا اظہار کیسے کر سکوں گا۔ مگر مولانا مجھ سے متفق نہیں تھے۔ کہنے لگے اپنی زبان تو انسان کی گھُٹّی میں ہوتی ہے۔ بس شروع کرنے کی دیر ہے چند ہی روز میں روانی آجائے گی۔ چنانچہ میں نے نفسیات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اُن دنوں فرائڈ کے نظریات کا بہت شہرہ تھا۔ خود فرائڈ کو وفات پائے ابھی چند سال ہی ہوئے تھے، مگر اُس کے نظریات نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ شروع شروع میں مجھے فرائڈ کے نظریات کی تہہ تک پہنچنا قدرے دشوار محسوس ہوا۔ سو میں نے فرائڈ کے نظریات کی اُن توضیحات کو پڑھنا شروع کیا جو بہت سے لوگوں نے کی تھیں۔ پھر میں فرائڈ کی کتابوں کی طرف متوجّہ ہوا مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سارے مطالعہ کے بعد جب میں نے لکھنا شروع کیا تو نفسیات کے بارے میں مضامین لکھنے کے بجائے بعض دوسرے موضوعات کو سمجھنے کے لئے اس علم کو بالواسطہ طور پر استعمال کیا۔ ۴۷-۱۹۴۶ء میں میں نے متعدّد مضامین لکھے ایک مضمون کا عنوان تھا: "شباب، تسلسل اور خودکشی"! میں نے اس مضمون میں شمس کا نام لئے بغیر اس کے اِقدامِ خودکشی کا نفسیاتی تجزیہ کیا تھا اور ضمناً خود اپنے محسوسات کا بھی جائزہ لے لیا تھا۔ ایک اور مضمون "قانون اور اس کا پس منظر"! تھا۔ مولانا نے یہ مضمون پڑھا تو بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے ضروری نہیں کہ آیندہ "ادبی دُنیا" صرف ادبی موضوعات تک ہی خود کو محدود رکھے۔ اس بات کا اظہار انھوں نے "ادبی دُنیا" کے اداریہ میں بھی کیا اور لکھا کہ آئندہ ادبی دنیا، غیر ادبی موضوعات کو بھی خوش آمدید کہے گا۔ اس کے بعد میں نے "لذّت اور صوفیانہ تصوّرات" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور صوفیانہ تصوّرات کے EROTIC CONTENTS کا بطورِ خاص تجزیہ کیا۔ اپنے اس مضمون میں میں نے سوامی رام تیرتھ کے ہاں دبی ہوئی جنسی خواہشات کو بھی نشان زد کیا تھا۔ مضمون خاصا

متنازع فیہ تھا مگر چونکہ اُردو والوں کے لئے سوامی رام تیرتھ کا نام ایک بڑی حد تک اجنبی تھا اور اس کے نظریات سے بھی انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لیے مضمون زیادہ زیرِ بحث نہ آسکا۔ تیسرا مضمون ادبی تھا۔ گویا یہ میرا پہلا ادبی مضمون تھا۔ عنوان تھا "میری پسندیدہ نظمیں" یہ مضمون بھی "ادبی دنیا" میں شائع ہوا۔ منجملہ دوسری نظموں کے مَیں نے اس میں فیض کی نظم "تنہائی" کا بطورِ خاص ذکر کیا تھا۔ اس لئے کہ میری ادبی زندگی کا آغاز ہی اس نظم کے مطالعہ سے ہوا تھا۔ کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ میں نے یہ سارے مضامین "نصیر آغا" کے قلمی نام سے لکھے تھے۔ اسی طرح مَیں نے نظمیں نصرت آرا نصرت کے نام سے شائع کرائی تھیں۔ دراصل مَیں اُن دنوں ادب کے معاملے میں زیادہ سنجیدہ نہیں تھا۔ مضامین تو مَیں نے مولانا صلاح الدین احمد کی فرمائش پر لکھے تھے اور نظمیں اپنے گھر کے دُکھ سے نجات پانے کے لیے۔ البتہ مَیں نے ماہ نامہ ساقی میں جو نظمیں لکھیں وہ محض تفننِ طبع کے لئے تھیں۔ پس منظر اس کا یہ تھا کہ مَیں نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ مدیر حضرات نئے شعرا کو گھاس نہیں ڈالتے۔ البتہ جب صنفِ نازک کی کوئی تحریر اِن کے سامنے آتے تو رعایتی نمبر دے کر شائع کر دیتے ہیں۔ میرے دوست کو مجھ سے اتفاق نہیں تھا۔ میں نے کہا چلیئے اس کا تجربہ کرتے ہیں۔ چنانچہ مَیں نے قلم برداشتہ ایک بے معنی آزاد نظم لکھ کر نصرت آرا نصرت کے فرضی نام سے شاہد احمد دہلوی مدیر "ساقی" کو بھیج دی۔ چند دنوں کے بعد شاہد احمد دہلوی کا خط آیا کہ نظم "ساقی" میں شائع ہو رہی ہے۔ میں نے اپنے دوست کو بتایا تو وہ حیران رہ گیا۔ اس کے بعد میں نے "ساقی" کو مزید چند بے معنی نظمیں ارسال کیں اور وہ بھی "ساقی" میں شائع ہو گئیں۔ اسے اتفاق کہئے کہ ان میں ایک اچھی با معنی نظم بعنوان "دھرتی کی آواز" بھی تھی۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ اس نظم نے اہلِ نظر کو چونکا دیا تھا چنانچہ جب حلقہ اربابِ ذوق نے ۱۹۴۷ء کی بہترین نظموں کا انتخاب شائع کیا تو اس میں یہ نظم بھی شامل تھی۔ اب مَیں نے سوچا کہ مذاق اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ لہٰذا یہ سلسلہ بند ہونا چاہئے۔ سو مَیں نے ایک روز بے چاری نصرت آرا نصرت کا گلہ گھونٹ کر اس مذاق کو ختم کر دیا۔

---

(۳۲)

اسی دوران ملک کے سیاسی حالات ایک طوفان کی صورت اختیار کر رہے تھے ہندی مسلمانوں کے ہاں ایک طرف تو انگریز کی غلامی سے نجات پانے، دوسری طرف ایک الگ ملک کے قیام کے لئے جو تحریک چند سال پہلے شروع ہوئی تھی، اب اپنے آخری مراحل میں داخل ہو گئی تھی۔ میں نے پہلے کبھی سیاست میں عملی طور پر حصہ نہیں لیا تھا اور نہ اب لیا مگر میں یہ تمام عرصہ ملکی سیاست میں دلچسپی ضرور لیتا رہا۔ انہیں دنوں فسادات شروع ہو گئے اور میں نے وزیر کوٹ سے باہر نکلنا ترک کر دیا۔ زیادہ سے زیادہ سرگودھا تک جاتا۔ وزیر کوٹ کے ارد گرد سکھوں کے متعدد دیہات تھے۔ لہٰذا خطرہ تھا کہ کہیں فسادات یہاں بھی شروع نہ ہو جائیں مگر ہمارے علاقے میں سکھوں اور مسلمانوں کے تعلقات آخر تک کشیدہ نہ ہوئے۔ پھر جب نقلِ مکانی کا زمانہ آیا تو یہاں کے لوگوں نے انہیں بچشم نم رخصت کیا۔ مگر ملک کے دوسرے حصوں میں صورتِ حال مختلف تھی۔ اس کی اطلاع ہمیں ریڈیو اخبار کے ذریعے یا پھر وزیر کوٹ کے قریب سے بہنے والی نہر کے ذریعے ملتی۔ ہوتا یوں کہ فسادات تو کہیں پچاس میل شمال مشرق کی طرف ہوتے مگر لاشیں ہم تک پہنچ جاتیں۔ پہلی بار جب ایسا ہوا تو میری طبیعت اس قدر خراب ہو گئی کہ میں تین روز تک کھانا نہ کھا سکا۔ ہوا یوں کہ شام کے قریب میں نہر کنارے سیر کر رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ شام خاصی گہری ہو چکی تھی۔ مغرب میں صرف ہلکی سی روشنی باقی تھی۔ مجھے ڈر بھی لگا مگر میں چلتا رہا۔ پھر اچانک میں نے دیکھا کہ میرے ساتھ ساتھ نہر کے پانی پر کوئی چیز بہتی جا رہی ہے۔ غور کیا تو وہ کسی عورت کی لاش تھی۔ نجانے ہم کتنی دیر سے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ میں اگر اپنے خیالات میں غرق نہ ہوتا تو بہت پہلے مجھے اس کی موجودگی کا علم ہو جاتا۔ مگر جس وقت ہوا تو میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ انسانی بربریت کا ایسا نمونہ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ انسانی جسم کی اس طور بے حرمتی بھی ہو سکتی ہے اس بات کا مجھے سان گمان تک نہ تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں خود دو حصّوں میں بٹ گیا ہوں۔ ایک حصّہ تو نہر کے کنارے رواں ہے۔ اور دوسرا نہر کے پانی پر۔ مگر یہ تو ابھی ابتدا تھی۔ اس کے بعد ایک ماہ تک تقریباً ہر روز نہر کوئی نہ کوئی بے گور و کفن لاش اٹھائے ہمارے قریب سے گزرتی رہی۔

(۴۳)

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی رات ہم نے جاگ کر کاٹی۔ آدھی رات کے وقت ریڈیو پاکستان سے پہلا اعلان نشر ہوا۔ ہم نے سُنا تو ہمارے چہرے کِھل اُٹھے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو ہمارے بیشتر اساتذہ کا خیال تھا کہ انگریز ابھی مزید بیس تیس برس تک ہندوستان کو آزادی نہیں دے گا۔ مگر پھر جب دوسری جنگِ عظیم نے انگلستان کو سپر طاقت کے درجے سے نیچے گرا دیا تو اس کے لئے ہندوستان پر قبضہ برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ یوں دیکھئے تو ہندوستان کو آزادی دلانے میں یہاں کی سیاسی تنظیموں کا اس قدر ہاتھ نہیں تھا جتنا ہٹلر اور اُس کے رفقا کا۔ مگر اب کہ آزادی مل گئی تھی تو ہمیں آم کھانے سے غرض تھی نہ کہ پیڑ گننے سے۔ سو ہم میں سے کسی نے سیڑھی منگائی۔ پھر وہ مکان کی چھت پر چڑھا اور وہاں اس نے پاکستان کا جھنڈا نصب کر دیا اور ہم سب نے فلک شگاف نعروں سے ایک نئے دَور کا سواگت کیا۔

مگر ہماری یہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ کیونکہ دوسرے ہی روز پورے پنجاب میں فسادات کی آگ پوری طرح بھڑک اُٹھی۔ روزِ حشر کا سا عالم تھا اور یہ روزِ حشر پورے دو ماہ تک قائم رہا۔ قافلے رواں تھے لوگ کٹ رہے تھے اور آسمان آنسو بہا رہا تھا۔ اس سال مون سون کا آغاز تاخیر سے ہوا تھا یعنی ۱۴ اگست کے بعد۔ لہٰذا بے وقت کی بارشوں نے صورتِ حال کو اور بھی خراب کر دیا۔ میں یہ ساری مدّت وزیر کوٹ ہی میں رہا۔ پھر جب اکتوبر کے مہینے میں لاہور گیا تو وہاں نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ جگہ جگہ جلے ہوئے مکانات کا ملبہ پڑا تھا۔ میں اپنے عزیزوں سے ملنے اندرون موچی دروازہ گیا اور ان سے بڑی دیر تک لاہور کے جلنے کی داستان سُنتا رہا۔ پھر میں مولانا صلاح الدین احمد سے ملنے گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مولانا کا آبائی گھر ان فسادات میں جل کر راکھ ہو گیا تھا اور گھر کے ساتھ ہی ان کا کتب خانہ بھی نذرِ آتش ہو چکا تھا۔ مگر جب میں مولانا سے ملا تو انہیں پہلے ہی کی طرح ہشّاش بشّاش پایا۔ مصافحہ کرتے ہوئے انھوں نے میرا ہاتھ حسبِ معمول اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور دیر تک نہ چھوڑا۔ میں نے کتب خانے کے جل جانے کا افسوس کیا تو مولانا نے ایک

فلک شگاف قہقہہ لگایا اور پھر فارسی کا یہ شعر پڑھا۔ ع:

تنم بسوخت دلم سوخت استخوانم سوخت
تمام سوختم و ذوقِ سوختن باقیست

(۴۴)

مگر حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی اندر سے راکھ ہو گیا تھا۔ میرا نہ تو گھر جلا تھا نہ کُتب خانہ مگر اس برصغیر کے باسیوں کے بارے میں جب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ بالائی سطح کی ساری تہذیبی برتری کے باوجود اپنے وجود میں پتھر کے زمانے سے بھی پہلے کے "وحشی انسان" کو چھپائے ہوئے ہیں تو میرے اندر جیسے کوئی شے جل کر راکھ ہو گئی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ وحشی انسان تو اُس دیو کی طرح ہے جسے بوتل میں قید کر دیا گیا تھا۔ سو جب کبھی بوتل کا ڈھکن کھُلتا ہے تو یہ دیو بوتل سے نکل کر پورے معاشرے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے۔ میں نے برصغیر کی تاریخ پر نظر ڈالی تو مجھے یہ دیو وقفے وقفے سے سرگرمِ عمل ہوتا نظر آیا۔ پھر میں نے اس کرۂ ارض کی تاریخ پر نظر ڈالی تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ دیو تو ہر جگہ اور ہر زمانے میں سر اٹھاتا رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انسان کے اندر پاگل پن کی کوئی نہ کوئی رمق موجود ہے۔ جب کبھی ہوا تیز ہوتی ہے تو یہ رمق بھڑک کر شعلے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مجھے انسانوں سے ڈر محسوس ہونے لگا اور بے معنویت کا وہ احساس جو شمس کی معیّت میں تصوّف اور ویدانت کا مُطالعہ کرنے کے بعد مجھ پر چھا گیا تھا۔ اب دوبارہ پر پُرزے نکالنے لگا۔ تاہم اب اس احساس کی نوعیت جذباتی کم اور فلسفیانہ زیادہ تھی۔ اُن دنوں میں نے زندگی میں پہلی بار ڈائری لکھنا شروع کی اور ملک میں ہونے والے واقعات اور ان سے پھوٹنے والے اپنے محسوسات کو بڑے التزام سے قلم بند کرتا رہا۔ مگر افسوس کہ بعد ازاں یہ ڈائری ضائع ہو گئی۔ البتہ اس کا ایک ورق میرے پاس آج بھی محفوظ ہے جس میں کائنات کی خوبصورتی کے پس منظر میں انسانی پاگل پن کے نقوش صاف اُبھر آئے ہیں:

"یکم دسمبر ۱۹۴۷ء: رات کا منظر تو مجھے عمر بھر بھول نہیں سکے گا اور اگر کبھی

زندگی کی بہترین گھڑیاں گننے کی فرصت میسّر آئی تو میں ان چند لمحات اور ان سے وابستہ تصوّرات کو اسی طرح تازہ اور شاداب حالت میں پاؤں گا۔ رات تاریک تھی اور سرد۔ میرے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا اور ایک طرف دن بھر کا تھکا ہارا ریڈیو چپ چاپ مضمحل انداز میں پڑا تھا جیسے اپنے ہی افکار کی تُندی کے ہاتھوں اس قدر مجبور ہو کہ اگر آج اس سے قوّتِ اظہار چھن گئی تو پھر شاید اس کی زبان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گُنگ ہو کر رہ جائے گی —— لیمپ جل رہا تھا، رات تاریک تھی اور ریڈیو چپ اور تنہا! اس وقت نجانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے کمرے کی وہ کھڑکی کھول دی جس کا رُخ مشرق کی طرف ہے اور جس میں سے دن کو درخت اور دُور دُور تک بچھے ہوئے کھیت صاف نظر آیا کرتے ہیں۔ پھر میں نے لیمپ بجھا دیا اور وہ تاریکی جو باہر گم صم کھڑی تھی، چشم زدن میں لپک کر کمرے کی تمام اشیا پر مسلّط ہو گئی۔ پھر میں نے ریڈیو کھول دیا اور نغمے کی ایک لطیف اور پُراسرار سی لَے میرے کانوں کو آہستہ آہستہ مَس کرنے لگی۔ میں اپنی چارپائی پر نیم دراز ہو گیا۔ اس طور کہ کھُلی ہوئی کھڑکی میرے روبرو تھی اور درختوں کے ہیولے مجھے نظر آرہے تھے —— اب تاریکی تھی، نغمے کی ہلکی سی لے اور چاروں طرف ٹھٹھکی ہوئی خاموشی! اور پھر یکایک درختوں اور کھیتوں کے اُس پار مشرقی اُفق پر ہلکی سی روشنی نمودار ہوئی اور ننھی مُنّی بدلیوں کے کنارے سیمیں ہو گئے۔ پھر آہستہ آہستہ جیسے نغمے کے طلسماتی اثر سے مدہوش سولھویں رات کے چندرما نے بدلیوں کی پٹاری سے اپنا سر نکالا۔ درخت ذرا اور نمایاں ہو گئے۔ بدلیاں کچھ اور سیمیں ہو گئیں، نغمہ کچھ اور میٹھا ہو گیا اور کائنات کی حسینہ نے ایک بھرپور انگڑائی لے کر ایسی مخمور نگاہوں سے میری طرف دیکھا کہ فرطِ طرب سے میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے سوچا۔ یہ دنیا ہزار بدنما اور ناپاپ سہی، انسانی فطرت ہزار سنگ دل اور بے مروّت اور نظامِ عالم ہزار پُرانا اور پامال سہی، قدرت آج بھی کس فراخ دلی سے اپنے حُسنِ ازل

کی تجوریوں کا مُنہ کھولے ہوئے ہے اور ہمیں ان سے مُٹھیاں بھر لینے کی صلائے عام دے رہی ہے مگر ہم ہیں کہ اپنی چھوٹی چھوٹی دشمنیوں اور رنجشوں کے دھاگے میں اسیر ننّھے ننّھے مقاصد کی ڈور سے بندھے ہوئے، سسکتے اور بلکتے چلے جا رہے ہیں"۔

میرے لئے ۱۹۴۷ء کا آخری حصہ ایک انتہائی کربناک زمانہ تھا، گو اس کرب کا تعلق میرے شخصی غم سے کم اور ملکی صورتِ حال اور اس کے نتیجے میں ہونے والے فسادات سے زیادہ تھا۔ یا شاید یوں تھا کہ میرا شخصی سطح کا احساسِ زیاں، اجتماعی احساسِ زیاں سے ہم آہنگ ہو کر ایک کربناک صورتِ حال میں تبدیل ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے بے معنویت کے جس احساس سے ایک حد تک چھٹکارا حاصل کیا تھا، وہ ۱۹۴۷ء کے آخری مہینوں میں دوبارہ مجھے اپنی لپیٹ میں لینے لگا مگر ۱۹۴۸ء کے طلوع ہوتے ہی میں ایک بار پھر ذہنی طور پر صحت مند ہونے لگا۔ تاہم اس بار صحت مند ہونے کی رفتار نسبتاً زیادہ تیز تھی۔ دوسرے اس کی نوعیت بھی تبدیل ہو رہی تھی۔ پہلے جب میں نے صحت کی طرف قدم بڑھایا تھا تو اس میں اندر کے روگ سے نجات پانے کی ایک گہری طلب موجود تھی۔ اب "نجات" کا مسئلہ نہیں تھا۔ اب تو میں اپنے اردگرد کو چھو کر، دیکھ کر، سونگھ اور چکھ کر اس سے محبّت کا رشتہ استوار کر رہا تھا۔ اب میری آنکھوں میں چمک آ رہی تھی اور اردگرد کی ہر شے مجھے جیسے پکارنے اور اپنی طرف بلانے لگی تھی۔ یہ نہیں کہ میں نے کائنات کے بارِ گراں کو محسوس کرنا ترک کر دیا تھا۔ یہ احساس اپنی جگہ موجود تھا۔ مگر اب میں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچنے لگا تھا کہ میں "کُل" کا ایک گونگا بہرا یا بے حس جزو نہیں ہوں بلکہ اپنی ذات کو "کُل" کی ہمہ گیریت سے بچانے پر قادر ہوں۔ تصوّف نے مجھے ME اور NOT ME کے فرق کو زائل کرنے کی تلقین کی تھی جس کے نتیجے میں زندگی میں میری شرکت کے امکانات کم ہو گئے تھے۔ اب مجھے اپنے اور اپنے ماحول کے درمیان ایک نئے رشتے کا احساس ہوا تو وہ "مکالمہ" جاری ہو گیا جو مجھے آج بھی بے حد عزیز ہے۔ میں نے دیکھا کہ کرن، بادل، برگ، بھونرا، تتلی، گندم کا خوشہ اور مالٹے کے پھول —— یہ سب قطروں، خوشبوؤں،

رنگوں اور ذائقوں کے ذریعے مجھ سے "ہم کلام" ہونے کی کوشش میں تھے۔ یکایک مجھ پر کائنات اور زندگی کے بے پناہ حُسن کا ایک سُہانا احساس چھا گیا۔ مَیں طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھنے کے لئے سحر خیزی میں مبتلا ہوا اور پھر ہر شام نہر کنارے غروبِ آفتاب کے دلکش مناظر میں کھو جاتا پہلے مجھے سب کچھ بے معنی نظر آتا تھا، اب ہر شے معنی سے لبریز تھی۔ نئے نئے مفاہیم کی ایک پوری دنیا وجود میں آ گئی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ ایک ایسے عجیب سے احساس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا جو زراعت کے تجربات نے مہیا کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ فطرت کا سب سے بڑا مقصد ہی زندگی کی تجدید یا تسلسل تھا اور وہ اس کے لئے تمام جانداروں کو آلۂ کار بنا رہی تھی۔ اسے جو اقدام زیادہ ضروری محسوس ہوتا وہ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے والے کو زیادہ "لذت" بطور رشوت یا معاوضہ عطا کرتی اور پھر جب وہ آلۂ کار بن جاتا تو اپنی اس "شرارت" پر مسکرانے لگتی۔ خوشبو اور رنگ اور لمس اور آواز اور ذائقہ——— یہ سب اس کے ہتھیار تھے اور بھونرے، تتلیاں، پرندے، مویشی اور انسان یہ سب اس کے کارکن جن کا سب سے بڑا فرض نسل کو آگے بڑھانا تھا تاکہ زندگی کی جے ہو اور تسلسلِ حیات برقرار رہے۔ کیوں؟ مگر اب میری ذہنی حالت ایسی تھی کہ مَیں "کیوں" کے بکھیڑے میں پڑنے کے بجائے محض فطرت کی "شرارت" سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پھر نجانے کیسے مَیں نے محسوس کیا کہ مَیں خود بھی "آلۂ کار" بننے کے لئے ذہنی اور نفسیاتی طور پر آمادہ ہو گیا ہوں۔ پہلے جب کبھی مَیں نے اس تماشے پر ایک نظر ڈالی تھی تو مجھے فطرت کا سارا رویہ "سنگدلانہ" "آمرانہ" اور توہین آمیز دکھائی دیتا تھا۔ مگر اب مجھے فطرت کی ہر بات برمحل، بامعنی اور باوقار نظر آنے لگی۔

(۴۶)

اُن دنوں مَیں بیک وقت شانت بھی تھا اور ذہنی طور پر متجسس بھی! ——— شانت اس اعتبار سے کہ مَیں اب اپنی زندگی کی گاڑی کو تھرڈ گیئر THIRD GEAR میں چلا رہا تھا اس سے پہلے مَیں کچھ عرصہ "آؤٹ آف گیئر" ہونے کے باعث ڈانواں ڈول بھی رہا۔ مگر پھر

مَیں جلد ہی گاڑی کو ٹاپ گیئر میں لے آیا تھا۔ یہ مجبُوری بھی تھی۔ گاڑی جب کیچڑ میں پھنس جائے یا اسے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنا ہو تو لازم ہے کہ وہ ٹاپ گیئر میں آ کر اپنی تمام تر مخفی قوتوں کو بروئے کار لائے۔ اسی طرح جب انسان کسی بحرانی دَور سے گزر رہا ہو تو اندر کی قوّت اس کی مدد کو آ جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ از خود ٹاپ گیئر میں چلا جاتا ہے۔ مگر میں کافی عرصے تک اعصابی تناؤ اور ذہنی تشنّج میں مبتلا رہنے کے بعد اب پہاڑ سے نیچے اُتر آیا تھا۔ اور ہموار زمین پر تھرڈ گیئر میں اپنی گاڑی چلا رہا تھا۔ چنانچہ اردگرد کے وہ مناظر جو بحرانی کیفیت میں مبتلا ہونے کے باعث میری نظروں سے اوجھل تھے۔ اب قطار اندر قطار میرے سامنے آ گئے اور مَیں ان سے ہم کلام ہونے لگا۔ پھر جب مجھے اردگرد کی قُربت نصیب ہوئی تو میرے اعماق سے ایک اور جذبہ اُبھرا جو بچپن کے ایّام میں تو خاصا توانا تھا مگر جو اس کے بعد نامساعد حالات کے باعث میرے اندر ہی کہیں سر چھپا کر بیٹھ گیا تھا۔ لیکن اب کہ ماحول نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو یہ جذبہ بھی متحرک ہو گیا اور میرے دل میں پیار کی ایک زبردست لہر موجزن ہو گئی۔ مجھ پر سے بے رُخی قنوطیّت اور مردم بیزاری کے سارے چھلکے اُتر گئے اور میں اشیا، افراد حتّٰی کہ جانوروں اور پودوں تک کے لئے اپنے دل میں محبّت کی ایک لہر سی محسوس کرنے لگا۔ ممکن ہے یہ بھی ایک حد تک تصوّف کے مطالعہ ہی کی دین ہو کہ تصوّف میں عشقِ حقیقی کے لئے عشقِ مجازی کو بطور زردبان استعمال کرنے کی بار بار تلقین کی گئی ہے مگر میرا خیال ہے کہ میرے دل میں جو محبّت موجزن ہوئی تھی وہ زیادہ تر اس لئے تھی کہ میں اپنی گاڑی تھرڈ گیئر میں لے آیا تھا اور اب مجھے زندگی کی وہ خوبصورتی صاف نظر آنے لگی تھی جو ٹاپ گیئر کے شورانگیز ماحول نے میری نظروں سے اوجھل کر رکھی تھی۔

(۴۷)

جن دنوں میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتا تھا تو میرے والد نے ہوسٹل کا خرچ بچانے کے لئے مجھے اپنے ایک عزیز کے ہاں بھجوا دیا تھا جو اُن دنوں موچی دروازے میں رہتے

تھے۔ مرزا انور علی ان کا نام تھا۔ انتہائی شریف اور مرنجاں مرنج انسان تھے اور بے حد غریب بھی! انار کلی کی ایک دکان میں سیلزمین تھے تینتس ۳۳ روپے ماہوار تنخواہ تھی۔ بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا تھا پھر جنگ کے آخری دنوں میں انھیں ایک اور دکاندار نے ساٹھ ۶۰ روپے ماہوار کی پیش کش کر دی تو ہمارے لئے اتنا مشکل مرحلہ تھا کہ ہم نے ساری رات جاگ کر کاٹی مگر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ مرزا صاحب کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ نئے مالک کے پاس تو وہ چلے جائیں مگر سابقہ مالک کو منہ کیسے دکھائیں گے۔ میری نظروں میں یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ زندگی جہد للبقار کا نام ہے۔ سو میں نے انھیں مجبور کیا کہ وہ نئی ملازمت قبول کر لیں۔ کئی روز تک ذہنی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد انھوں نے بادل نخواستہ نئی نوکری قبول کر لی۔ اور یوں ان کی مالی حالت نسبتاً بہتر ہو گئی۔ میں چار برس ان کے گھر میں رہا—— خون کے علاوہ ہم میں سب سے بڑا رشتہ غربت کا تھا جو خاصا توانا رشتہ ہے۔ شدہ شدہ میں ان کے گھر کا ایک فرد بن گیا۔ چنانچہ چار برس کے بعد جب میں نے لاہور چھوڑا تو ایک شدید احساسِ زیاں دونوں طرف تھا۔ لاہور سے واپس وزیر کوٹ آنے کے بعد میں اپنے مسائل اور الجھنوں میں اس بُری طرح مبتلا ہوا کہ اپنے اس عزیز کے ہاں جانے کا بہت کم وقت مل سکا۔ بس سرسری سی ملاقات ہوتی رہی۔ لیکن اب میں پانچ برس پر پھیلے ہوئے ایک طویل بحرانی دَور سے جب میں باہر آیا تو مجھے اپنے یہ عزیز بھی یاد آ گئے۔ اور پھر میں بطورِ خاص انھیں ملنے لاہور گیا۔ ان دنوں وہ موچی دروازہ چھوڑ کر آسٹریلیا بلڈنگ کے ایک مکان میں منتقل ہو چکے تھے—— ان کے بچّے بھی بڑے ہو گئے تھے۔ لڑکا کالج میں پڑھ رہا تھا اور بڑی بیٹی نے میٹرک میں قدم رکھا تھا۔ صفیہ اس کا نام تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ بس اسی لمحے میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کر لیا۔

(۴۷)

لاہور کے ساتھ میری بہت سی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ اس لئے کالج سے فارغ ہونے کے بعد میں اگرچہ چند بار لاہور گیا بھی تو صرف کسی ضروری کام کے سلسلے میں یا پھر مولانا

صلاح الدین احمد سے ملنے کے لئے! مگر اب یکایک مجھے لاہور بے حد عزیز ہوگیا تھا۔ اور میں لاہور کے لئے بے پناہ کشش محسوس کرنے لگا تھا۔ اب میرا حلقۂ احباب بھی وسیع ہو رہا تھا گو یہ حلقہ لاہور کے بجائے سرگودھا شہر میں نسبتاً زیادہ مضبوط تھا۔ اُن دنوں سرگودھا میں غلام جیلانی اصغر سے میری ملاقات ہوئی جو LOVE AT FIRST SIGHT کے مترادف تھی۔ جلد ہی ہم میں دوستی کا ایک مضبوط رشتہ استوار ہوگیا جو نہ صرف آج تک قائم ہے بلکہ روز بروز زیادہ پختہ ہو رہا ہے۔ انھیں دنوں حمید صاحب سے بھی میرے مراسم قائم ہوئے۔ حمید صاحب کا ادب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن بے حد خوش باش اور HAPPY GO LUCKY انسان تھے۔ ہمہ وقت ہنستے رہتے۔ چونکہ میں تازہ تازہ دُکھوں سے لبریز ایک طویل بن باس سے لوٹا تھا اور ہر شئے کو سینے سے لگاکر بے اختیار ہنسنا چاہتا تھا، اس لئے حمید صاحب مجھے بہت اچھے لگے۔ افسوس کہ حمید صاحب زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکے۔ زیادہ ہنسنا بھی اتنا ہی خطرناک ہے جتنا رونا! انشا اپنی سکت سے زیادہ ہنسے تھے۔ دُکھی ہو کر مرے۔ حمید صاحب اتنا ہنسے کہ عمرِ طبعی تک بھی نہ پہنچ سکے۔

لاہور میں مولانا صلاح الدین احمد سے طویل ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا اور ان ہی ملاقاتوں کے دوران مجھے حامد علی خاں، عاشق حسین بٹالوی، اقبال احمد اور متعدد دوسرے حضرات سے ملنے کے مواقع ملتے رہے۔ ان دنوں مولانا انار کلی بازار کے عقب میں رہائش پذیر تھے۔ وہیں "ادبی دُنیا" کا دفتر تھا۔ مگر یہ محض نام کا دفتر تھا۔ کیونکہ فسادات میں جب مولانا کا گھر اور کتب خانہ جلا تھا تو "ادبی دُنیا" بھی بند ہوگیا تھا۔ اُدھر میرے اندر ہر شئے کو محبّت کے دھاگوں میں پرو لینے کا جذبہ پروان چڑھ رہا تھا۔ سو ایک روز "ادبی دُنیا" بھی نوکِ سوزن پر آگیا۔ میں مولانا کے پیچھے پڑگیا کہ "ادبی دُنیا" کو دوبارہ جاری کریں مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ "ادبی دُنیا" دوبارہ جاری نہ ہوا تو میں خود نامکمل رہ جاؤں گا—— میرے لئے "ادبی دُنیا" ایک ذی رُوح کی حیثیت میں اُبھر آیا تھا جس کی کشش نے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا۔ مگر مولانا اپنی جگہ مجبور تھے۔ "ادبی دُنیا" کے لئے سرمایہ کہاں

سے لاتے۔ سرمایہ میرے پاس بھی نہیں تھا۔ مگر طلب بہت شدید تھی۔ تب ایک روز میں نے اپنے "ذاتی خزانہ" کا نصف حصہ یعنی مبلغ دو ہزار روپے مولانا کی میز پر رکھ دیے اور کہا کہ میری طرف سے "ادبی دُنیا" کے لئے یہ ایک حقیر تحفہ ہے۔ مگر مولانا رقم قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ کہنے لگے آپ کے پاس اتنی کم رقم ہے اور پھر چند ماہ کے بعد آپ کو اپنی شادی کے لئے بھی رقم درکار ہو گی۔ اس لئے میں اسے قبول نہیں کروں گا۔ مگر میں نے اصرار کیا اور کہا کہ "ادبی دُنیا" کا اجراء میرا ایک سہانا خواب ہے۔ آپ اس خواب کے راستے میں مزاحم نہ ہوں۔ بالآخر مولانا مان گئے۔

دسمبر ۱۹۴۸ء میں "ادبی دُنیا" کے نئے دَور کا پہلا شمارہ منصۂ شہود پر آیا۔ میں نے نصیر آغا کے نام سے "ادبی دُنیا" میں نظمیں اور مضامین لکھے تھے۔ مگر اب میں پہلی بار اپنے اصل نام سے ادبی دنیا میں نمودار ہوا۔ اس وقت میرے لئے سب سے اہم موضوعٔ "محبت" تھا۔ میں اس میں مبتلا بھی تھا اور اس کی ماہیت جاننے کا آرزومند بھی! چنانچہ میں نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان ہی "محبت کا تدریجی ارتقا" تھا۔ مولانا یہ مضمون پڑھ کر بے حد خوش ہوئے۔ اور پھر انھوں نے "ادبی دنیا" کے اداریہ میں اس کی تعریف میں پورا پیراگراف بھی لکھا۔ مگر میں اس مضمون سے مطمئن نہیں تھا۔ چنانچہ نصیر آغا کے نام سے لکھے گئے مضامین کے علاوہ اپنے نام سے لکھے گئے اس پہلے مضمون کو بھی میں نے اپنی کسی کتاب میں شامل نہیں کیا۔

اب میری زندگی کا ایک دَور تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ اور میں ذہنی اور احساسی طور پر ایک نئے دَور کے در پر دستک دینے لگا تھا۔ جب ریل گاڑی کے آنے میں صرف چند لمحے باقی ہوں تو انسان جلدی جلدی اپنے سامان کو سمیٹتا ہے اور یہی کچھ میں بھی کر رہا تھا۔ مگر میرا سامان تو میری ذات کے اندر بکھرا پڑا تھا۔ ٹوٹی ہوئی طناب، پھٹا ہوا خیمہ اور ان گنت نقوشِ پا! نقوشِ پا میں سب سے نمایاں شمس آغا کے نقوش تھے جو کسی ترتیب میں نہیں تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی زندگی کے نئے دَور میں داخل ہوتا اور میری ذہنی حالت یکسر تبدیل ہو جاتی۔ میرے لئے ان نقوشِ پا کو یکجا کرنا بہت ضروری تھا۔ سو میں نے کئی راتیں جاگ کر شمس کی زندگی کے مدّوجزر اور پھر اس کی گمشدگی کے بارے میں ایک مضمون لکھا

اس کا عنوان تھا "ٹوٹا ہوا تارا"۔ یہ مضمون ۱۹۴۹ء کے آغاز میں "ادبی دُنیا" کے کسی شمارے میں شائع ہوا۔ اور بڑی دلچسپی سے پڑھا گیا۔ بے شمار لوگوں نے مجھے خطوط لکھے اور شمس کے بارے میں مزید معلومات کا مطالبہ کیا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ چند ہی افسانے لکھ کر شمس کس طرح ایک متھ MYTH بن گیا تھا۔ کئی سال بعد جب مولانا نے شمس کے افسانوں کا مجموعہ "اندھیرے کے جگنو" شائع کیا تو اس مضمون کو بھی کتاب میں شامل کیا۔ خود مجھے بھی یہ مضمون بہت عزیز تھا۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء کے بعد جب میری کتاب "شامِ دوستاں آباد" شائع ہوئی تو یہ مضمون اس کتاب میں بھی شامل تھا۔

(۴۸)

۱۸ اپریل ۱۹۴۹ء کو میری شادی ہوئی۔ گھر کی شادی تھی اس لئے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہ تھی۔ سب لوگ وزیر کوٹ میں جمع ہو گئے تھے۔ لہٰذا برات نے محض گھر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کیا۔ گھر کے بیشتر لوگ ناخوش تھے کیونکہ اس شادی نے ان کے خوابوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ بالکل فلمی منظر تھا۔ دراصل گھر میں واحد ایم اے پاس ہونے کے باعث میری قیمت بہت زیادہ تھی۔ سب چاہتے تھے کہ میں کسی امیر کبیر گھرانے میں شادی کروں اور میرے لئے بھاری جہیز کے حصول کے علاوہ زندگی میں دنیاوی طور پر آگے بڑھنے کے امکانات روشن ہو جائیں۔ مگر دوسری طرف میں دولت اور شہرت اور دنیاوی ترقی کو پرکاہ سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔ میرے نزدیک میرے سسرال والوں کی غربت کوئی ایسا گناہ نہیں تھا جسے ہدفِ طنز بنایا جاتا بلکہ میں تو اس بات ہی کو ان کی سب سے بڑی خوبی قرار دے رہا تھا۔ بہر حال شادی ہو گئی۔ پہلی ملاقات پر میں نے اپنی بیوی کو ایک خوبصورت بیاض بطور اوّلین تحفہ دی۔ اس بیاض میں میری بہت سی رُومانی نظمیں تھیں۔ اس سے بہتر تحفہ کا میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بعد کی زندگی میں مجھے کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں یہ بیاض دکھائی دیتی رہی پھر گُم ہو گئی۔

قیام

۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۹ء

پھر ایک دن ہوا نے کہا میں تو تھک گئی
خوشبو کا بوجھ میری کمر کو جھکا گیا

۱

شادی ہوئی تو مجھے یوں لگا جیسے ایک طویل بن باس کے بعد ”جنّتِ گم شدہ“ میں واپس آیا ہوں۔ بچپن کے ایام میں مسرّت کے لمس سے مَیں بارہا آشنا ہوا تھا مگر پھر جب مَیں سفر میں مبتلا ہوا اور نامساعد حالات، ذہنی اور جذباتی خلفشار نیز حادثات و واقعات کی زد میں آ گیا تو مجھے مسرّت کے لمحات کبھی کبھار ہی میسر آئے۔ مگر جب ۱۹۴۹ء میں میری شادی ہوئی تو پہلی بار مسرّت ایک تند و تیز موج کی طرح مجھ سے آ ٹکرائی اور مَیں پوری طرح شرابور ہو گیا۔ ویسے تو شادی کے لفظ ہی میں مسرّت مضمر ہے اور اکثر لوگوں کے لئے یہ تجربہ انتہائی پُرمسرّت ہوتا ہے۔ مگر میرا معاملہ یہ تھا کہ ایک طرف مَیں نے اپنے گاؤں کے نقوش اور آثار میں اپنے پُرمسرّت بچپن کا گاؤں دریافت کر لیا تھا اور دوسری طرف مجھے ایک ایسی ہستی کی قُربت میسّر آئی تھی، جس پر میرے خواب مرتکز ہو گئے تھے۔ لہٰذا مسرّت بھی بے پایاں تھی۔ اب تقریباً سینتیس ۳۷ برس کے فاصلے سے اپنے ان احساسات کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ میری بے پناہ مسرّت دراصل سفر کے بعد ”قیام“ کی مسرّت تھی۔ نہ صرف یہ کہ میرے پاؤں کا چکّر رک گیا تھا اور ذہنی خلفشار سے مجھے نجات مل گئی تھی بلکہ مجھے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ ڈولتے ہوئے سمندری جہاز کو لنگر مہیّا کر دیا گیا ہے اور اب

اس کے بے مُہار ہونے کا خدشہ باقی نہیں رہا۔

"قیام" یعنی لنگر انداز ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اب میں اپنے پاؤں کے نیچے "دھرتی" کے لمس سے آشنا ہو رہا تھا۔ میرے جدِّ امجد حضرت آدمؑ کے لئے آسمان سے زمین پہ گرنا ایک کربناک تجربہ ہوگا۔ کیونکہ انھیں زمین پر بطور سزا گرایا گیا تھا۔ مگر میرے لئے زمین کے لمس سے آشنا ہونا ایک انتہائی مسرت انگیز تجربہ تھا کیونکہ یہ میرے طویل سفر کا حاصل تھا۔ شادی سے پہلے ہی میں اپنے ارد گرد کے ماحول کو از سرِ نو دریافت کرنے لگا تھا اور ارد گرد کی اشیا، مظاہر اور افراد کے لئے بے پناہ محبت اور کشش محسوس کر رہا تھا۔ مگر شادی کے بعد تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے ایک لڑکی سے نہیں بلکہ اس کرّۂ ارض، اس سرسبز و شاداب دھرتی سے شادی رچائی ہے۔ میں زراعت کو بطور پیشہ اختیار کر چکا تھا مگر اب مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی کہ زمین سے میرا رشتہ کاروباری نوعیت کا ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ اصلاً جذباتی نوعیت کا تھا۔ ان دنوں میں خود بھی کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ کھُرپا ہاتھ میں لئے گھنٹوں پنیری میں سے گھاس نکالتا یا پودوں کی نرسری میں پیوند کرنے اور فاضل شاخوں کو تراشنے میں منہمک رہتا۔ پھر میں کھیتوں میں نکل جاتا اور فصلوں کے اُگنے، نشوونما پانے اور بالآخر بیج میں ڈھل جانے کے عمل کا مشاہدہ کرتا۔ میرے لئے یہ زندگی بے جان اشیا کا ایک کارخانہ نہیں تھا بلکہ "زندوں" کی ایک بستی تھی جس میں کیڑے مکوڑے، بھونرے، پرندے، مویشی، پودے اور درخت ایک سماج یا برادری کے طور پر رہ رہے تھے۔ ان کی آپس میں لڑائیاں بھی ہوتی تھیں اور شادیاں بھی مگر اصل بات یہ تھی کہ ان میں سے ہر ایک کا وجود دوسرے کے وجود کا دستِ نگر تھا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ ان کے مقابلے میں انسانوں کا سماج خاصا کمزور، بے بنیاد اور سیماب پا ہے۔ جلد ہی مجھ پر یہ بات بھی منکشف ہوئی کہ انسان —— پرندوں، درختوں اور مویشیوں کے اس سماج کے لئے ایک شکار خور PREDATOR کی حیثیت رکھتا ہے۔ ارد گرد کے پورے ماحول کے لئے وہ اجنبی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پرندے اور جانور بالعموم ایک دوسرے سے نہیں ڈرتے تھے بلکہ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں مگر جب کسی انسان

کو دیکھتے ہیں تو خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ میں خود سے پوچھتا کہ انسان سے وہ خوف زدہ کیوں ہیں؟ جواب ملتا کہ ایک تو اس لئے کہ انسان نے ان کے ساتھ محبّت کا رشتہ نہیں جوڑا۔ دوسرے اس لئے کہ انسان "ننگا" ہونے کے باعث یعنی پَر، اُون یا گھنے بالوں سے محروم ہونے کی وجہ سے خاصا کریہہ المنظر ہے۔ وہ اسے دیکھتے ہی پریشان ہو جاتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں ان کے لئے اجنبی نہیں رہوں گا۔ سو میں نے ان کی طرف محبّت اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ پہلے تو انھوں نے مجھ پر اعتبار نہ کیا، مگر پھر آہستہ آہستہ وہ مجھ سے مانوس ہونے لگے۔ میں اکثر درختوں کے کسی نہ کسی جھنڈ میں جا بیٹھتا۔ پہلے تو ایک دم سناٹا چھا جاتا۔ پرندوں کی چہکار تک بند ہو جاتی پھر وہ چہچہانے لگتے۔ اس کے بعد درختوں سے زمین پر اتر آتے۔ پھر میرے قریب آنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بعض اوقات چڑیاں میری چھڑی پر آ کر بیٹھ جائیں اور جنگلی جانور مثلاً خرگوش، گیدڑ، نیولے بے جھجک میرے قریب سے گزر جاتے۔ مگر جانوروں اور پرندوں ہی سے نہیں میں درختوں اور فصلوں سے بھی معانقہ کر رہا تھا۔ میں پودوں کو سہلاتا، درختوں کے تنوں سے لپٹ جاتا اور ان کے لئے پیار کی ایک لہر سی اپنے بدن میں موجزن پاتا۔ شروع شروع میں تو یہ محبّت یک طرفہ تھی۔ پھر میرے ہاتھوں کو محسوس ہوا کہ دوسری طرف سے بھی موہوم سے پیغامات مجھ تک پہنچ رہے ہیں۔ شدہ شدہ میرے اور پودوں، درختوں کے درمیان ایک انوکھا رشتہ وجود میں آ گیا۔ میں محسوس کرتا کہ وہ میرے ہاتھوں کے لمس اور قدموں کی چاپ کو پہچاننے لگے ہیں۔

مگر دھرتی کے لئے میرے دل میں محبّت کا جو طوفان اٹھا تھا۔ وہ دائرہ در دائرہ پھیل رہا تھا۔ شام کو جب میں سیر کے لیے نہر کنارے جاتا تو دوسرے دیہات بھی میرے "اپنے" ہو جاتے۔ دُور تک پھیلے ہوئے کھیت ایک دوسرے میں مدغم ہو کر سبز رنگ کی ایک چادر سی بن جاتے اور میں اس چادر کو اوڑھ لیتا۔ پھر میں اور پھیلتا اور دُور مغرب کی طرف کھڑی "کرانہ" کی پہاڑیوں اور اُفق پر جھکے ہوئے بادلوں کو بھی خود میں سمیٹ لیتا۔ آخر آخر میں تو مجھے یوں لگتا جیسے میں خود "دھرتی" ہوں اور آسمان کو حیرت سے دیکھ رہا ہوں۔ ع:

رانجھا رانجھا آکھدی میں آپے رانجھا ہوئی!

۴

دھرتی سے میری وابستگی کی یہ ابتدا تھی۔ یہ وابستگی نہ صرف آج تک باقی ہے بلکہ اس نے ادب اور زندگی کے بارے میں میرے تصوّرات پر بھی گہرے اثرات مرتسم کئے ہیں۔ (ان کا ذکر آگے آئے گا) دراصل مَیں اپنی زندگی کے ہر دَور میں دھرتی کو ازسرِ نو دریافت کرتا رہا ہوں اور چونکہ دھرتی کے ہر نئے رُوپ کے ساتھ آسمان کا ایک نیا رُوپ بھی طلوع ہوتا رہا ہے — اس لئے مَیں یہ سارا عرصہ دھرتی کی وساطت سے پوری کائنات کو سمجھنے کے لئے کوشاں رہا ہوں۔ مگر آغازِ کار میں جب دھرتی کے مادی وجود نے اپنی خوشبو، لمس اور آواز سے مجھ پر جادو کیا تو مَیں حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔ ہر چند مَیں پچھلے ستائیس[۲۷] برس سے اسی دھرتی پر فروکش تھا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ متعارف تو اس سے مَیں آج ہوا ہوں۔ اصل بات شاید یہ تھی کہ میں دو حصّوں میں بٹ گیا تھا اور اب میری ذات کا ایک حصّہ حیران ہو کر اپنے کٹے ہوئے حصّہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بظاہر اس سے جُدا تھا لیکن بباطن اس سے جڑا ہوا تھا۔ اور دونوں کی باہمی کشش کا راز بھی شاید یہی تھا۔ اس سے پہلے مَیں خود کو اکیلا اور نامکمل محسوس کرتا رہا تھا۔ اور اس لئے تصوّف اور ویدانت کی طرف مائل ہوا تھا کہ ان کے مطالعہ سے مجھے اپنی "اکائی" کا اثبات مہیّا ہو سکتا تھا لیکن اب میں دو حصّوں میں تقسیم ہوا تو اس نئے احساس کے اثبات کے لئے مجھے کسی اور "بوطیقا" کی تلاش ہوئی اور یہ بوطیقا مجھے مشرقِ بعید کے فلسفے کی صورت میں ملی۔ اُن دنوں لن یوٹانگ کی کتاب "دی امپارٹنس آف لِونگ THE IMPORTANCE OF LIVING" دن رات میری تحویل میں رہتی۔ لن یوٹانگ مجھے بتا رہا تھا کہ یہ زندگی اور اس کے مظاہر مایا یا سراب نہیں اصل حقیقت ہیں اور دیکھو کہ یہ حقیقت کتنی رنگین، متنوّع، خوشبودار اور لذت آگیں ہے۔ ویدانت اور تصوف کے زیرِ اثر میں نے اپنی آنکھیں بند کر کے (گویا سمادھی یا مراقبے میں مبتلا ہو کر) چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی کی یکسر نفی کر دی تھی۔ مگر اب مشرقِ بعید کے فلسفے کے زیرِ اثر میں آنکھیں کھول کر، گویا ساتوری SATORI میں مبتلا ہو کر، ہر شے کا اثبات کر رہا تھا۔ یہ نہیں کہ آنکھیں بند کر کے میں نے "جوہر" کو دریافت کرنے کی کوشش کی تھی اور اب آنکھیں کھول کر میں "وجود" میں اُلجھ گیا تھا۔ فرق دراصل زاویۂ نگاہ کا تھا۔ تصوّف اور ویدانت نے

وجود (BEING) کو اہمیت دی تھی جب کہ مشرقِ بعید کے فلسفے نے موجود BECOMING کو ورنہ دونوں جوہر کی تلاش ہی پر منتج ہو رہے تھے۔ اس وقت مجھے اس مسئلے کی باریکیوں کا ادراک کچھ زیادہ تو نہ ہوا، البتہ اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ وجود اور موجود میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہی شے جسے تصوف "وجود" کہتا ہے، مشرقِ بعید کا فلسفہ "موجود" کا نام دیتا ہے۔ تصوف اور ویدانت انکار سے اقرار کی طرف بڑھتے ہیں جب کہ مشرقِ بعید والے اقرار سے آغاز کرتے ہیں۔ اور ان کا خاتمہ کلام بھی اقرار ہی پر ہوتا ہے۔ سو اب کہ میں موجود BECOMING کو قریب سے دیکھ رہا تھا تو مجھے لن یوٹانگ کے زاویۂ نگاہ میں بے پناہ کشش محسوس ہوئی اور میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں اور مظاہر کو بھی اسی دلچسپی سے دیکھنے لگا جس سے بڑے بڑے مظاہر حیات کو۔

دراصل میرے رویّے کی یہ ساری تبدیلی شادی کے تجربے سے منسلک تھی۔ مجھے ایک ایسی ہستی کی رفاقت میسّر آئی تھی جو مجھ سے جسمانی طور پر الگ ہونے کے باوجود الگ نہیں تھی اور اب میں حیرت زدہ ہو کر اس نئی ہستی کو دیکھ رہا تھا جو گویا میری ہی پسلی سے برآمد ہو کر میرے سامنے ایک متوازی قوّت کے طور پر اُبھر آئی تھی۔ اس واقعہ کے تقریباً اکتیس ۳۱ برس بعد جب میں نے اپنی طویل نظم "آدھی صدی کے بعد" لکھتے ہوئے زندگی کے اس دَور میں غوّاصی کی تو ایسے بہت سے احساسات اور امیجز از خود اُبھرتے چلے آئے جو میرے اس نئے نویلے تجربے سے منسلک تھے اور موجود سے میری والہانہ شیفتگی کی غمازی کر رہے تھے مثلاً:

میں ندّیوں کے جھرمٹ میں محصور
پلکوں کی ٹھنڈی سلاخوں کے پیچھے
کھڑا تھا
پیازی سے گالوں کے
بلّور میں
میرا چہرہ چُھپا تھا
چمکتی ہوئی سُرخ بندیا

مرا نام جپتی تھی

خُوشبو

گلابی لبادوں سے باہر نکل کر

مجھے سونگھتی تھی

لبوں سے ٹپکتے ہوئے بول

مصری کی ڈلیاں تھے

کانوں میں گُھل کر

میرے تن کی شریانوں

ننّھی رگوں تک کو

میٹھی تمازت سے مسحور کرتے تھے

چاروں طرف۔۔۔

ریشمیں ڈوریاں، ندّیاں

مجھ کو تھامے کھڑی تھیں

مرے سامنے

ایک بانکا، سجل، تیز دریا تھا

دریا

جو ریشم کا دھاگا تھا

سوزن تھا

اپنے ہی دونوں کناروں کو

پیہم رفو کر رہا تھا

زمیں کے اُدھڑتے ہوئے چاک کو

سی رہا تھا!

(۱۹۸۰ء)

سو یہ "رفو کرنا" ہی میری زندگی کے اس دَور کا امتیازی وصف تھا۔ میں نے زندگی کو جب قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ ان گنت ٹکڑوں اور قاشوں میں بٹی ہوئی ہے اور یہ ٹکڑے ایک دوسرے کی کششِ ثقل سے متاثر ہونے کے بجائے ایک دوسرے پر غرّا رہے ہیں۔ سو میرے نزدیک ان ٹکڑوں کو جوڑنا (اس طور کہ وہ اپنی انفرادیّت کو بھی قائم رکھیں اور کُل سے منسلک بھی ہو جائیں) پرمسرت زندگی کے لئے اساسی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سے قبل تصوف اور ویدانت کے مطالعہ نے مجھے بتایا تھا کہ مسرّت "دُکھ" سے "نجات" حاصل کرنے میں ہے۔ بُدھ نے تو دُکھ کو بنیادی تنازعہ ہی قرار دے ڈالا تھا۔ مگر اب کہ مَیں مسرّت کی بے پناہ لہروں میں شرابور ہوا تو میں نے دیکھا کہ میری یہ مسرّت دکھوں کو منہا کر دینے سے وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ ایک دھڑکتی ہوئی مجسّم کیفیت کے رُوپ میں اُبھری تھی۔ گویا زندگی کے لاتعداد دُکھ تو اب بھی اپنی اپنی جگہ موجود تھے مگر مسرّت ان دُکھوں کے باوجود ایک ذی روح کی طرح مجھے ملنے چلی آئی تھی۔ مسرّت کے اس مثبت پہلو سے میں پہلے نا آشنا تھا۔ سو مَیں اس کا تجزیہ کرنے کی طرف مائل ہوا۔ سوچا معلوم تو کروں کہ مسرّت جس کے لئے ایک عالم پاگل ہو رہا ہے۔ اپنی ماہیّت کے اعتبار سے کیا ہے؟ کیا دنیا اور اس کے لوازم کو ترک کر کے اس کی زیارت ہوتی ہے یا ان سے متعارف ہو کر۔ اگر متعارف ہو کر تو کیا ان کے تابع مہمل ہو کر؟ پھر یہ کہ کیا مسرّت دائرہ در دائرہ پھیلتی ہے؟ اگر پھیلتی ہے تو کہاں تک؟ آرٹ، محبّت، فلسفہ، عام زندگی، فرد اور سماج کا رشتہ — ان سب منطقوں میں مسرّت کی کی نوعیّت کیا ہے؟ — عجیب صورتِ حال تھی! پہلے میں مسرّت کے حصول کے لئے کوشاں تھا مگر اب میں مسرّت کی ماہیّت دریافت کرنے کے درپے تھا۔ یوں میں اس تازہ موضوع کی طرف راغب ہوا اور مَیں نے کئی برس اس موضوع کے سلسلے میں سوچنے، پڑھنے اور اپنے احباب سے تبادلہ خیالات کرنے میں گزار دئے۔ نتیجۃً اس کتاب کی صُورت میں برآمد ہوا جو جنوری ۱۹۵۴ء میں "مسرّت کی تلاش" کے نام سے شائع ہوئی۔

(۳)

اس کتاب کا دیباچہ مولانا صلاح الدین احمد کے بڑے صاحب زادے وجیہہ الدین احمد

نے لکھا تھا۔ وجیہہ میرے ہم عمر تھے۔ نفسیات میں ایم۔ اے کر چکے تھے۔ بعد ازاں مقابلے کا امتحان پاس کر کے "دوسری طرف" چلے گئے، مگر آغازِ کار میں وہ اُردو ادب کے بہت اچھے طالب علم تھے۔ "ادبی دُنیا" میں انھوں نے ادب کی نفسیاتی توجیہات پر مبنی جو مضامین لکھے وہ آج بھی قابل مُطالعہ ہیں۔ وجیہہ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ بالخصوص تاریخِ تہذیب کا انھوں نے دقتِ نظر سے مُطالعہ کر رکھا تھا۔ ان کا اسلوبِ تحریر پختہ اور جاذبِ نگاہ تھا۔ سو جب انھوں نے کتاب کا دیباچہ لکھا تو اس میں ان پہلوؤں کو بھی سمیٹ لیا جن تک میری نظر نہ جا سکی تھی۔

میں نے یہ کتاب والد صاحب کے نام معنون کی تھی۔ جب مجھے اس کا پہلا نسخہ ملا تو شام ہو رہی تھی۔ کتاب کا نسخہ بذریعہ ڈاک آیا تھا اور گاؤں میں ڈاک شام کو پہنچتی تھی۔ یہ میری پہلی کتاب تھی۔ مجھے اس بات کا سان گمان بھی نہیں تھا کہ میں کبھی کسی کتاب کا مصنّف بھی بن سکوں گا۔ سو میں تا دیر اسے اُلٹتا پلٹتا اور سہلاتا رہا۔ بعد ازاں مجھے بائیس سے زیادہ کتابیں لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی مگر جو خوشی اس پہلی کتاب کو چھو کر ملی بعد کی کسی بھی کتاب کی اشاعت پر نہ مل سکی۔ اُس وقت یہ حالت تھی کہ کتاب حاصل کرنے کے تین چار روز بعد میں سرگودھا گیا تو بازار میں سے گزرتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے لوگ مجھے غور غور سے دیکھ رہے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں: "دیکھو یہ وہ شخص ہے جس نے "مسرت کی تلاش" لکھی ہے!" بہرحال کتاب ملی تو میں نے اس کا مجموعی تاثر لینے کے لئے اسے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ پھر اس پر "والد صاحب کی نذر" کے الفاظ لکھ کر سو گیا۔ اگلی صبح پانچ بجے اُٹھ کر میں والد صاحب کے کمرے میں گیا۔ ان کا یہ معمول تھا کہ صبح چار بجے بیدار ہوتے۔ کچھ دیر یوگ کی ورزشیں کرتے پھر مراقبے میں چلے جاتے۔ پانچ بجے کے قریب مراقبے سے باہر آتے تو ملازم انھیں چائے کی ایک پیالی پیش کر دیتا پھر وہ آٹھ بجے تک مطالعہ کرتے رہتے یا اگر کوئی آجاتا تو اس سے گفتگو کرتے۔ چائے بھی ان کے کمرے ہی میں تیار ہوتی تھی۔ سردیوں میں بالخصوص علی الصبح ان کے کمرے میں جا کر آگ تاپنا اور ان کی باتیں سننا مجھے بہت مرغوب تھا۔ بہرحال اس روز پانچ بجے ہی ان کے کمرے میں جا پہنچا۔ انھیں سلام کیا اور اپنی کتاب ان کی خدمت میں پیش کر دی

انھوں نے کتاب کا عنوان پڑھا۔مصنّف کا نام دیکھا، کتاب کو کھولا، دیکھا کہ کتاب ان کے نام معنوَن کی گئی تھی۔پھر انھوں نے ابواب کی فہرست پر ایک نظر ڈالی۔جس میں پورے دو باب مسرت اور فلسفہ کے موضوع پر تھے۔مُسکرائے اور کہا: "یہ تم نے کب لکھی؟" میں نے کہا: "میں نے کب لکھی ہے یہ تو آپ ہی کا عطیّہ ہے۔آپ ہی نے لکھی ہے۔" وہ پھر مسکرائے اور اسی وقت کتاب کا مُطالعہ شروع کر دیا۔دوپہر تک انھوں نے کتاب پڑھ ڈالی۔مجھے بُلایا اور پھر میری اتنی حوصلہ افزائی کی کہ میں کِھل اُٹھا۔انھوں نے کتاب کے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھا تھا۔اس کے بعد وہ تقریباً ایک ماہ تک ہر روز مجھ سے اس کتاب کے ان نکات کے بارے میں باتیں کرتے رہے جنھیں میں نے محض چھُو کر چھوڑ دیا تھا لیکن جن میں سے ہر نکتے پر ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی تھی۔

(۴)

میری زندگی میں "مسرت کی تلاش" اور میری بیٹی مینا کا پہلا نقرئی قہقہہ ایک ساتھ آئے تھے۔
مینا (جس کا اصل نام وقار النساء ہے) ۵ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو پیدا ہوئی تھی۔جب "مسرت کی تلاش" چھپی تو اُس کی عمر سوا سال کے لگ بھگ ہوگی۔سردیوں کے دن تھے میں صبح سویرے اپنے بستر میں جاگ رہا تھا۔چاروں طرف مکمّل سکوت تھا اور پھر اس سکوت میں مجھے ایک ننّھے سے قہقہے کی آواز سنائی دی۔بالکل جیسے مندر میں گھنٹی بج اٹھی ہو۔میں نے اپنی بیوی صفیہ کو آواز دی اور پوچھا: "یہ کون ہنسا؟" صفیہ ہنسی اور کہا: "یہ مینا تھی"! مجھے محسوس ہوا، میں تو ایسے ہی زندگی بھر مسرّت کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔مسرّت تو معصومیّت میں لپٹی ہوئی اس ننّھی منّی سی ہنسی کا نام ہے جو بے انت کائنات کے مقابلے میں ایک متوازی قوّت کے رُوپ میں اُبھر آتی ہے۔یکایک مجھے محسوس ہوا جیسے مسرّت کی تلاش پر اصل دیباچہ تو مینا نے لکھا ہے۔بس اسی لمحے کتاب اور مینا کا قہقہہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو گئے اور میں مسرّت کے ایک گہرے احساس کو دبائے بستر سے نکل کر باہر مردانے کی طرف تقریباً بھاگتے ہوئے گیا۔وہاں پہنچتے ہی میں نے اپنا نیلا پیڈ نکالا اور پھر قلم برداشتہ

نظم لکھ ڈالی جو بعد ازاں "حیاتِ نو" کے نام سے شائع ہوئی اور جو مجھے آج بھی بے حد عزیز ہے۔ نظم یہ تھی:

نقرئی سکوں میں ڈھلتے ہوئے یہ شام و سحر
ایک بے نور اداسی کی گپھا میں چُپ چاپ
نرم بوندوں کی طرح گرتے چلے جاتے تھے

○

ہر نئی شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں
اک ستارہ ابھر آتا تھا فلک پر چُپ چاپ
دو ستارے میری آنکھوں میں بھی لہراتے تھے

○

ہر شبِ تیرہ کے انجام پہ دونوں آنسو
میری آنکھوں کے جھروکوں سے نکل کر چُپ چاپ
میرے گالوں پہ لڑھکتے ہوئے کھو جاتے تھے

○

آج میں اک نئی جھنکار سے جاگ اٹھا ہوں!
قہقہہ ـــــ ننھی سی گڑیا کا در آیا چُپ چاپ
اور میں خوابِ گراں بار سے جاگ اٹھا ہوں

(۱۹۵۴ء)

(۵)

واقعی میں ایک "خوابِ گراں بار" سے جاگ اٹھا تھا۔ ۱۹۵۴ء سے قبل میں اپنے ماحول کو اس کی فطری حالت میں دیکھ رہا تھا۔ میرے لئے یہ سارا ماحول جنگلی گلاب کی ان جھاڑیوں پر مشتمل تھا جن کی کبھی تراش خراش نہ کی گئی ہو۔ مگر ۱۹۵۴ء کے طلوع ہوتے ہی "دھرتی" سے میرے تعلقِ خاطر

میں ایک نئے بُعد کا اضافہ ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ گو فطرت کا بھی ایک اپنا حُسن ہے لیکن تہذیبی اقدار کا، نیز انسان کے بطون میں چھپی ہوئی سیدھی سڑک اختیار کرنے کی جبلّت کا ایک اپنا تقاضا بھی ہے۔ گویا اب مجھے ماحول گڈمڈ حالت میں درکار نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے ہر چیز کی مخصوص ہیئت دکھائی دینے لگے اور مختلف ہیئتوں FORMS کی حدِ فاصل زیادہ شوخ ہو جائے۔ غالباً باہر کی دنیا میں ہیئت کی تلاش اور اسے نمایاں کرنے کی یہ خواہش میرے باطن کی اس آرزو ہی کی صدائے بازگشت تھی کہ میں اپنی ہیئت، اپنی انفرادیّت کو انبوہ سے الگ کر کے دیکھوں۔ چنانچہ سب سے پہلے تو میں اپنے ماحول کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ کھیت پگڈنڈیوں سے اَٹے پڑے تھے۔ انسانی قدم مسافت کے معاملے میں خاصے بخیل تھے۔ فاصلے کو کم کرنے کے لئے ہر کھیت کو اس طور کاٹ دیتے کہ اس کی ہیئت ہی تبدیل ہو جاتی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ جب ایک بار کوئی قدم کسی کھیت کو دو نیم کرتا تو اس کے بعد سینکڑوں قدم بھیڑ چال کے تحت اس کے پیچھے پیچھے بڑھے چلے آتے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک نئی پگڈنڈی وجود میں آجاتی۔ زراعت کے لئے کھیت کی ہیئت کا یوں ٹوٹنا بہت مُضر تھا۔ چنانچہ میں نے پگڈنڈیوں کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کیا۔ اپنی زمین میں ایک خاص پیٹرن کو ملحوظ رکھ کر کچّی سڑکیں بنانی شروع کیں۔ پھر میں پانی کے کھالوں کی طرف متوجّہ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ یہ کھال نہر سے نکلتے ہی ایک شرابی کے سے انداز میں چلنے لگتے، پھر ایک سانپ کی طرح لہراتے ہوئے آگے کو بڑھتے۔ یہ گویا چھوٹے چھوٹے دریا تھے اور اس لئے سیدھی لکیر میں سفر کرنے سے گریزاں تھے۔ مگر پانی تو زراعت کے لئے خُونِ گرم کا درجہ رکھتا ہے اور بل کھا کر گزرنے سے اس کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور کھیت سیراب ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ سو میں نے کھالوں کو سیدھا اور پھر تنگ کرنے کا آغاز کیا تاکہ پانی کی رفتار تیز ہو۔ جلد ہی سڑکوں کے علاوہ کھالوں کا بھی ایک پیٹرن اُبھر آیا۔ پھر میں کھیتوں کی طرف متوجّہ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ کوئی کھیت بڑا تھا کوئی چھوٹا نیز کوئی بھی کھیت نشیب و فراز سے محفوظ نہیں تھا۔ اچھی زراعت کے لئے کھیتوں کو ایک سائز میں لانا اور ان کو ہموار کرنا بہت ضروری ہے۔ مگر یہ سارے کام ایک دن میں تو ہو نہیں سکتے تھے۔ یہ مہینوں اور سالوں کا معاملہ تھا۔ میں صبح پانچ بجے اُٹھتا جلدی جلدی ناشتہ کر کے اور فل بوٹ پہن کر کھیتوں میں نکل جاتا۔ وہاں لوگ پہلے سے

موجود ہوتے۔ میں فیتہ ہاتھ میں لئے کھیتوں اور سڑکوں اور کھالوں کے بل نکال نکال کر انھیں سیدھا کرنے کے عمل میں جُتا رہتا۔ نجانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی کہ میں ۱۲۰ درجہ حرارت میں بھی سر پر سولا ہیٹ رکھے، سارا سارا دن کھیتوں میں کام کرتا رہتا۔ جلد ہی اٹھڑ دھرتی کے نین نقش سنورنے، پھر شوخ سے شوخ تر ہونے لگے اور میرے قطعۂ زمین کے اندر سے زرعی فارم کی ہیئت لپک کر باہر آگئی۔ انھیں دنوں میں نے ایک بار لاہور میں زوبی کو کام کرتے دیکھا تھا۔ وہ چند روز ادبی دنیا کے دفتر میں بھی آتا رہا تاکہ مولانا صلاح الدین احمد صاحب کا مجسمہ بنا سکے۔ پہلے تو اس کے ہاتھ تا دیر مٹّی کے ایک بڑے سے گولے کو سہلاتے، تھپتھپاتے رہے اور پھر یکایک اس گولے پر مولانا کے چہرے کے نقوش ابھرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے چکنی مٹّی کا گولہ مولانا کے چہرے میں تبدیل ہو گیا۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے مولانا کا چہرہ مٹّی کے گولے کے اندر کہیں موجود تھا۔ زوبی نے تو فقط فاضل مٹّی کو ہٹا کر مولانا کا چہرہ دریافت کر لیا تھا۔ تخلیقی عمل کے اس طریقِ کار نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اور ادب اور آرٹ کے سلسلے میں مجھ پر اس بات کو واضح کیا کہ فن کار کوئی نئی چیز تخلیق نہیں کرتا بلکہ چیزوں کے درمیان ایک نیا ربط دریافت کرتا ہے۔ اس کی بہترین مثال تشبیہ ہے جو دو چیزوں کے درمیان اس رشتے کو سطح پر لاتی ہے جو ہر چند کہ پہلے سے موجود تھا لیکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ کافی عرصہ تک تخلیقی عمل کا یہ پیٹرن مجھ پر مسلط رہا لیکن ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ جب میں نے اپنی کتاب "تخلیقی عمل" لکھی تو عملِ تخلیق کا ایک بالکل نیا رُوپ مجھ پر منکشف ہوا۔ مگر اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ بہرحال زمین کو ہیئت مہیّا کرنے کے اس عمل میں مجھے محسُوس ہوا کہ میرا قطعۂ زمین بھی مٹّی کا ایک گولا ہی تو ہے اور میں بھی زوبی کی طرح اُس زرعی فارم کو تلاش کر رہا ہوں جو نہ جانے کب سے اس کے اندر چُھپا بیٹھا ہے۔

(۶)

کھیتوں کی نوک پلک سنوارنے کے بعد میں گاؤں کی طرف متوجّہ ہوا۔ گاؤں کیا تھا بس ملبے کا ایک ڈھیر تھا۔ احاطوں کی دیواریں ڈھے گئی تھیں اور دیواروں کے مسمار ہوتے ہی لوگوں نے صحنوں میں راستے

بنا لئے تھے۔ تخلیئے کا کوئی تصور تک موجود نہیں تھا۔ ہر کسان کے پاس ایک کچا کوٹھا تھا۔ جس میں بیل، بکری، بھینس، کتا اور اس کا کنبہ رہائش پذیر تھے۔ بچوں کے آگے شب و روز "تماشہ" ہوتا رہتا تو وہ قبل از وقت ہی بلوغت کی خوشبو سونگھ لیتے اور پھر اخلاقیات کا منہ چڑانے لگتے۔ کسان کے پاس اور کوئی شے باعثِ عزت نہیں رہی تھی۔ لے دے کے ایک "ناک" ابھی باقی تھی جس کے تحفظ کے لئے وہ ہمہ وقت بے چین رہتا۔ چنانچہ اس خدشے کے پیشِ نظر کہ کہیں سماج میں ناک نہ کٹ جائے وہ اپنی بیٹی کی شادی دس بارہ برس کی عمر ہی میں کر دیتا۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں اس کے ہاں چاند سا بیٹا یا بیٹی پیدا ہو جاتی اور پھر چندا ماموں ہر دوسرے سال التزام کے ساتھ طلوع ہونے لگتے۔ تیس۳۰ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے فاقہ مستوں کی ایک پوری قطار وجود میں آجاتی۔ لڑکی کے بالوں میں چاندی کی لکیریں نمودار ہونے لگتیں، چہرے کا گوشت ڈھلک جاتا، آنکھوں کی چمک بجھ جاتی اور وہ بڑی بوڑھیوں میں شمار ہونے لگتی۔

گاؤں کو ہیئت مہیا کرنے کے لئے میں نے سب سے پہلے چار دیواریاں تعمیر کروائیں۔ میں نے سوچا چار دیواری وجود میں آجائے تو چادر خود بخود آجائے گی۔ چار دیواری کا مطلب یہ تھا کہ ہر گھر دوسرے گھروں سے الگ ہو جائے اور اپنی انفرادیت، اپنے وجود کا اعلان کرنے لگے۔ دراصل ہمارے گاؤں میں غربت نے نشیب و فراز پیدا نہیں کئے تھے بلکہ نشیب و فراز کو مٹا دیا تھا اور ان کے ساتھ ہی شخص اور گھر کی انفرادیت بھی مٹ گئی تھی۔ میں خود نشیب و فراز کے حق میں نہیں تھا۔ اور شہروں میں غریب اور امیر کے ہر لمحہ بڑھتے ہوتے فرق کو ناپسند کرتا تھا۔ چنانچہ اپنی متعدد نظموں کے علاوہ میں نے اپنی پہلی کتاب "مسرت کی تلاش" میں بھی برملا لکھا تھا کہ

> "دولت کی ناروا تقسیم نے انسان کو طبقوں اور گروہوں میں تقسیم کر کے اور یوں جنگ، قحط، بادشاہت اور سرمایہ داری کو معرضِ وجود میں لا کر فرد اور سماج کو ایک ایسی غلط روش پر گامزن کر دیا ہے کہ آج انسان اس کے خلاف پورے عزم اور شدت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔"

مگر میں مفلسی کے "ہمہ اوست" کا نہیں بلکہ خوش حالی کے "ہمہ اوست" کا قائل تھا کیونکہ میرے نزدیک مفلسی اصلاً ایک بیماری ہے اور جس طرح شدید بیماری کے دوران انسان کی نظر لمحۂ موجود پر مرتکز ہو جاتی ہے اور وہ باقی سب کچھ بھول جاتا ہے بالکل اسی طرح جب غربت کی وبا معاشرے میں پھیل جاتی ہے تو فرد اپنے ماضی اور مستقبل —— دونوں سے کٹ کر محض لمحۂ حاضر میں رہنے لگتا ہے۔ برسوں بعد جب میرے گاؤں میں خوشحالی آئی تو مجھے اپنی اس بات کی صداقت کا احساس ہوا کیونکہ خوش حالی کے آتے ہی ایک طرف تو کسانوں نے اپنے بچّوں کو سکول بھیجنا شروع کیا (گویا وہ مستقبل کے خوابوں میں مبتلا ہوئے) اور دوسری طرف انھوں نے اپنے بزرگوں کی قبروں کو نشان زد کرنا اور پھر انھیں پختہ کرنا شروع کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے ماضی سے مربوط ہونے لگے تھے۔ روس میں جب غربت اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور ردِ عمل کے طور پر خلقِ خدا نے ایک نیا معاشی نظام قائم کیا تو اس میں اوّل اوّل غربت کی مساوات ہی قائم ہوئی تھی جس کے نتیجے میں ماضی اور اس کی اقدار، بالخصوص مذہب سے بے اعتنائی کا رویّہ پروان چڑھا تھا اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ غریبی میں خُدا یاد آتا ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ انتہائی غربت میں انسان خدا کو بُھول جاتا ہے اور بے بس سا ہو کر تُند و تیز موجوں پر بہنے لگتا ہے البتہ جب خوشحالی آ جائے تو اُسے فوراً اپنے بزرگوں، پیروں، فقیروں، پاک ہستیوں اور خدائے بزرگ و برتر کی یاد آ جاتی ہے تاکہ خوش حالی کو زمانے کی دست برد سے محفوظ رکھنے میں ان ہستیوں کا کرم شاملِ حال ہو سکے۔

مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ کم از کم ہمارے گاؤں کی حد تک غربت کی مساوات کا زمانہ تھا اور سب لوگ بے چہرہ زندگی گزار رہے تھے۔ میرے نزدیک بے چہرگی کو ختم کرنے کا واحد طریق یہ تھا کہ گاؤں میں خوش حالی لائی جائے۔ مگر سوال یہ تھا کہ خوشحالی آئے تو کیسے آئے۔ خوشحالی آسمان سے اُترنے والی برکھا نہیں تھی کہ اپنے وقت پر از خود آ جاتی۔ یہ تو زمین سے اُگنے والی شئے تھی۔ اور اس کے لئے ہَل کی اَنّی، بیل کا زور اور کسان کے عزم کا یکجا ہونا نیز کسانوں میں مقابلے کی فضا کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ سو میں نے اعلیٰ کارکردگی کے لئے تین انعامات کا اعلان کیا۔ ایک انعام کھیت سے زیادہ سے پیداوار حاصل

کرنے والے کے لئے تھا۔ دوسرا اُس کے لئے جس کے بیل دوسروں سے زیادہ صحت مند ہوں اور تیسرا انعام اس کے لئے تھا جس کا گھر سب سے زیادہ صاف ستھرا قرار پائے۔ سال بھر کی کارکردگی کے بعد انعامات کا اعلان ہوا۔ میں بھاگم بھاگ سرگودھا پہنچا اور وہاں کے ڈپٹی کمشنر (غالباً اُن دنوں نیاز احمد ڈپٹی کمشنر تھے) کو جلسۂ تقسیمِ انعامات کے لئے گاؤں لے آیا۔ اُس روز اِرد گرد کے دیہات سے بھی ہزاروں لوگ وزیرکوٹ میں جمع ہوئے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے ایک طویل تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ محنت میں برکت ہے نیز یہ کہ کسان آپس کے لڑائی جھگڑوں سے پرہیز کریں۔ انعام بظاہر بالکل معمولی تھے لیکن باعثِ عزت بہت تھے۔ پہلا انعام ایک سو روپے کی رقم اور ایک کلف لگی سفید پگڑی پر مشتمل تھا۔ پگڑی کیا تھی پورا ایک تھان تھا جو ڈپٹی کمشنر نے اپنے دستِ خاص سے انعام پانے والے کسانوں کے سروں کے گرد لپیٹا تھا۔ ان انعام یافتہ کسانوں کے لئے سو روپے کی رقم بھی بہت تھی، لیکن پگڑی کا حصول ایک اتنا بڑا اعزاز تھا کہ خوشی سے ان کے چہرے سُرخ ہو گئے تھے اور ان کی چال میں ایک انوکھا وقار آ گیا تھا۔ میں سرگودھا کے صحافیوں کو بھی جلسے میں لے آیا تھا۔ ان میں میر عبدالرشید اشک کا نام اس لیے بھی قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے اپنے اخبار "شعلہ" کے ایک شمارہ کا غالب حصّہ اس خبر کی ترسیل کے لئے مختص کر دیا تھا۔ وزیرکوٹ کی تاریخ میں یہ پہلا جلسۂ تقسیمِ انعامات تھا۔ مگر آخری ہرگز نہیں اس کے بعد آٹھ دس برس تک یہ جلسہ ہر سال بڑے التزام کے ساتھ منعقد ہوتا رہا تاآنکہ سب کسانوں کی پیداوار ایک اونچی سطح پر آ کر رُک گئی اور ان میں سے کسی ایک کسان کی کارکردگی کو بطورِ خاص نشان زد کرنا ممکن نہ رہا۔ سو میں نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ مگر مقصد حاصل ہو گیا تھا۔ خوش حالی کی ایک لہر سی پورے گاؤں میں پھیل گئی تھی اور خوش حالی کے آتے ہی کسانوں کے ہاں احساسِ ملکیت جاگ اٹھا تھا اور دھرتی سے ان کا گہرا رشتہ وجود میں آ گیا تھا۔ آج صورت یہ ہے کہ وزیرکوٹ کے باسیوں میں سے بیشتر نے اپنے مکانات پختہ کر لئے ہیں، بجلی آ گئی ہے۔ گھروں میں ٹیپ ریکارڈر، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ بھی نظر آ رہے ہیں۔ گھروالیوں کے لباس شوخ اور تنگ ہونے لگے ہیں۔ بچّوں میں تعلیم بڑھ رہی ہے اور اسلام سے لگاؤ بھی بہت ہو گیا ہے۔ وزیرکوٹ کی مسجد جو پہلے ویران تھی اب ایک نئے رُوپ میں اُبھر آئی ہے اور اس میں محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے نماز پڑھتے نظر آتے ہیں۔ ایک نیا امام باڑہ بھی تعمیر ہوا ہے

عاشورہ کے روز آٹھ دس ہزار افراد کا ہجوم ہو جاتا ہے۔

(۷)

اُن دنوں میں نے گاؤں میں تعمیر اور صفائی کی جو مہم شروع کی اس کا ایک پس منظر بھی تھا، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ پہلے ایک انقلابی تبدیلی خود میرے گھر میں آئی اور پھر اس کے اثرات پورے گاؤں پر مرتسم ہوئے۔ دراصل میری حیثیت تو محض ایک ایجنٹ کی سی تھی جس نے گھر کے اندر کے انقلاب کو پورے گاؤں میں پھیلا دیا تھا۔ شادی سے پہلے ہمارے گھر کی کوئی شے بھی اپنے مقام پر نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی کباڑ خانہ ہے جس میں کوئی چیز بھی ثابت و سالم نہیں ہے۔ میری والدہ کو گھر کی صفائی دُھلائی کا مطلق شوق نہیں تھا اور یہی حال گھر کی دوسری مستورات کا بھی تھا۔ چنانچہ ہر طرف کوڑے کرکٹ کے ڈھیر دکھائی دیتے۔ کھانا بھی ڈھنگ سے کھانے کا کوئی دستور نہیں تھا۔ بس یہ ہوتا کہ بڑی خالہ ہانڈی لے کر صحن کے عین درمیان بیٹھ جاتیں اور ان کے گرد گھر کے لوگ پیڑھیاں بچھا کر اور زمین پر رکابیاں رکھ کر کھانا کھاتے۔ دُور سے یوں لگتا جیسے گڑ کی بھیلی پر مکھیاں جمع ہو گئی ہیں۔ بس میرے والد کا کمرہ صاف شفاف ہوتا کہ انھیں گندگی سے چڑ تھی۔ میری والدہ کی خوشی صفائی دُھلائی میں نہیں تھی۔ وہ تو اس بات پر خوش ہوتیں کہ ان کے بچّے اور پھر بچّوں کے بچّے ان کے گرد آ بیٹھیں اور وہ اپنی اس "مملکتِ خداداد" کو نشوونما پاتے دیکھ سکیں۔ میری بیوی لاہور ایسے بڑے شہر سے آئی تھی۔ یہ تو خیر کوئی "وصفِ خاص" نہیں تھا۔ کیونکہ لاہور بجائے خود صدیوں سے گندگی کے ایک ڈھیر پر بیٹھا چلّہ کاٹ رہا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ ایک نیا کلچر لے کر آئی تھی۔ لاہور میں میرے سُسرال والوں کا گھر غربت میں شرابور تو تھا، مگر انتہائی صاف شفّاف اور ٹک سک سے درست تھا۔ افرادِ خانہ بھی صفائی کے دلدادہ تھے۔ میری بیوی جب گاؤں میں آئی تو اپنے ساتھ صفائی کا جنّ بھی لائی اور اس جنّ نے کچھ ہی دنوں کے بعد پَر پرزے نکالنے شروع کر دئیے اس کا آغاز تو اس کمرے سے ہوا جو ہمیں عطا کیا گیا تھا اور جسے اب اہلِ خانہ حیرت زدہ ہو کر دیکھ رہے تھے، بلکہ جب کوئی مہمان آتا تو وہ اسے بھی اس کمرے میں لا کر بٹھاتے پھر ایک رجحانِ

نقل کے تحت گھر کی دوسری مستورات نے بھی اپنے اپنے کمروں کو صاف کرنا شروع کیا۔ آخر آخر میں بڑی بوڑھیاں بھی بادلِ نخواستہ اس مہم میں شامل ہوگئیں۔ البتہ بڑی خالہ نے صفائی کی اس مُہم کو سخت ناپسند کیا اور میری بیوی کو اس گناہِ کبیرہ کا ذمہ دار قرار دے کر اس پر طنز و مزاح کے سارے حربے استعمال کرنے شروع کر دئے۔ بڑی خالہ سے سب لوگ ڈرتے تھے کیونکہ وہ انتہائی سخت مزاج تھیں۔ خاوند سے علیحدگی اور پھر اکلوتی بیٹی کی وفات نے انھیں مردم بیزار بنا دیا تھا۔ انھیں میری بیوی کی صفائی پسندی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ کہتیں کہ اس کم بخت نے لاہور سے نئی نئی باتیں لاکر ہمارے گھر کا ستیا ناس کر دیا ہے۔ میری والدہ سے ہر روز جھگڑا کرتیں اور کہتیں: "شہر سے بہو تو لے آئی ہو مگر دیکھ لینا اس کی صفائی پسندی گھر کا صفایا کر دے گی"۔ جب دیکھا کہ صورتِ حال زیادہ بگڑنے لگی تو میں نے گھر کی حویلی سے باہر ایک چھوٹا سا مکان تعمیر کرا لیا۔ سستا زمانہ تھا اس کی تعمیر پر کم و بیش چار پانچ ہزار روپے خرچ ہوئے مگر مجھے سکونِ قلب میسر آ گیا۔ کیونکہ خالہ کی چیختی ہوئی آواز اب ہم تک پہنچ نہیں سکتی تھی۔ دوسری طرف میری بیوی کو ایک نیا گھر میسر آیا تو اس کی صفائی پسندی اپنے انتہائی مراحل میں داخل ہوگئی۔ وہ سارا سارا دن گھر کی صفائی میں جُتی رہتی۔ شدہ شدہ ہمارا نیا گھر اپنی صفائی اور خوبصورتی کی بنا پر پورے علاقے میں مشہور ہوگیا۔ وزیر کوٹ کے علاوہ دوسرے دیہات کی عورتیں بھی اسے دیکھنے کے لئے آتیں، سارے گھر میں گھومتیں۔ ایک ایک چیز کو ہاتھ لگاتیں اور پھر کہتیں: گھر کیا ہے تاج محل ہے تاج محل!

(۸)

"مسرت کی تلاش" ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی مگر اس میں شامل مضامین اس سے بہت پہلے لکھے جا چکے تھے۔ اوپر میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شادی کے بعد مسرت کی جو موج مجھ سے آ کر ٹکرائی تھی، اس کی ماہیئت دریافت کرنے کے لئے میں نے یہ سارے مضامین سپردِ قلم کئے تھے۔ مگر اسی دوران میرا ذہن ایک متوازی لکیر پر بھی گامزن ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ مسرت اپنے اظہار کے لئے تبسم زیرِ لب سے لے کر خندۂ دنداں نما تک کو بروئے کار لا رہی تھی۔ یہ سب ہنسی کی تدریجات تھیں۔ مگر سوال یہ تھا کہ خود ہنسی کیا ہے؟ نیز کیا ہمارے ادب میں ہنسی کا کوئی

تدریجی ارتقا بھی ہوا ہے یا نہیں؟ انھیں دنوں یہ دیکھنے کے لئے کہ مَیں کس حد تک اس نئے موضوع کی پرکھ کے قابل ہوں مَیں نے ایک مضمون (جو غالباً اُردو نثر میں طنز و مزاح کی روایت کے بارے میں تھا) لکھ کر حلقۂ اربابِ ذوق لاہور کی ایک محفل میں پیش کر دیا۔ اس پر سخت تنقید ہوئی۔ مگر مولانا نے اس کی تعریف کی اور مجھے مشورہ دیا کہ اس شاداب موضوع پر ایک مبسوط مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کے لئے پیش کر دوں۔ مجھے مولانا کی یہ تجویز پسند آئی اور مَیں نے چپکے چپکے اس پر کام کرنا شروع کر دیا۔

جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ اس موضوع پر تو اُردو میں کام ہی نہیں ہوا تھا۔ لے دے کر ایک رشید احمد صدیقی کی کتاب "طنزیات و مُضحکات" تھی۔ جس میں نہ تو مزاح اور اس کے اماثل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور نہ ہنسی کے محرکات ہی کو زیرِ بحث لایا گیا تھا۔ ویسے وہ ایک دلچسپ کتاب تھی۔ بالخصوص رشید احمد صدیقی کا اسلوبِ تحریر نہایت تازہ اور خوبصورت تھا اور انھوں نے اُردو کے بعض مزاح اور طنز لکھنے والوں کا عمدہ تجزیہ بھی کیا تھا۔ مگر کتاب میں اُردو کے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کے حوالے سے مختلف اَدوار کی معاشرتی اور تہذیبی صورتِ حال کو گرفت میں لینے کی کوشش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے لئے یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا کیونکہ مغرب میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا تھا جب کہ اہلِ مشرق نے ہنسی کا تجزیہ کرنے یا مزاح، طنز، تحریف اور بذلہ سنجی WIT کے مزاج کو دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کم از کم میرا تاثر یہی تھا، مگر مَیں نے سوچا ممکن ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے مسلمان مفکّرین اور اطبّا نے اس سلسلے میں کچھ کام کیا ہو لہٰذا مَیں اس سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی کے بہت سے اساتذہ سے ملا۔ حتیٰ کہ مولوی محمد شفیع صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا مگر ہر جگہ مجھے یہی بتایا گیا کہ ایسا کوئی کام مشرق یا مشرقِ وسطیٰ میں سرانجام نہیں دیا گیا۔ لامحالہ مجھے ہنسی کے محرکات کا تجزیہ کرنے نیز مزاح اور اس کے اماثل کا مزاج دریافت کرنے کے لیے مغرب کے علما اور مفکّرین کی تخلیقات پر انحصار کرنا پڑا۔

۹

جب پنجاب یونیورسٹی نے مجھے "اُردو ادب میں طنز و مزاح" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مقالہ لکھنے کی

اجازت دے دی تو مجھے ایسے اساتذہ کی تلاش ہوئی جو اس موضوع کے سلسلے میں میری رہنمائی کر سکتے مگر وہاں تو مطلع ہی صاف تھا۔ میں جب ان سے ہنسی کے بارے میں ارسطو، کانٹ، شوپن ہاور، تھامس ہابز، برگساں اور فرائڈ کے نظریات کے بارے میں سوالات کرتا تو وہ مجھے یوں غور غور سے دیکھتے جیسے میرا دماغی توازن ہی درست نہیں تھا۔ ان کے نزدیک اُردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت کو کھوجنا اور متقدمین کے ہاں ہجویات اور مُضحکات کے وہ نمونے تلاش کرنا ہی اصل کام تھا جو کرم خوردہ کتابوں میں محفوظ پڑے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں ہنسی کی تھیوری کے کھڑاگ میں نہ پڑوں اور نہ مزاح اور اس کے اماثل کا تجزیہ کروں۔ بس سیدھی لکیر پر بڑھتا چلا جاؤں۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کے علاوہ دوسرے بزرگوں کا بھی یہی حال تھا۔ میں نے جب اپنے تھیسس کا پہلا باب مکمل کیا جس میں ہنسی کی تھیوری کو موضوع بنایا گیا تھا اور پھر اسے حلقہ اربابِ ذوق کی ایک نشست میں پیش کیا تو نوجوانوں نے اسے پسند کیا اور کہا کہ اُردو ادب میں اس طرح کا کام پہلی بار ہوا ہے۔ مگر مولانا عبدالمجید سالک نے کہ اس نشست کے صدر تھے، مجھے بہت ڈانٹا اور کہا کہ اگر سارا مقالہ اسی قسم کی "خرافات" پر مشتمل ہے تو پھر کم از کم پی۔ ایچ ڈی کا خواب دیکھنا ترک کر دوں۔ میں بہت ڈرا کیونکہ بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ مولانا سالک ہی کو میرا بیرونی ممتحن مقرر کیا جائے گا۔ میری خوش قسمتی کہ ایسا نہ ہوا اور رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر صادق کو ممتحن مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر صادق نے کچھ اس قسم کے اعتراضات کر کے مقالہ واپس کر دیا کہ اس میں درج بعض انگریزی الفاظ میں ٹائپ کی غلطیاں رہ گئی ہیں وغیرہ۔ چنانچہ مجھے چھ ماہ کے بعد دوبارہ یہ مقالہ پیش کرنا پڑا۔ البتہ رشید احمد صدیقی صاحب نے پنجاب یونیورسٹی کو لکھا کہ اس مقالے پر طالب علم کو فوری طور پر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری دے دی جائے۔ تاہم مقالے کے بارے میں مجھے رشید احمد صدیقی صاحب کے تاثرات نہ مل سکے۔ اس کے تقریباً دس برس بعد جب میں بمبئی گیا تو کرشن چندر کے ہاں مجھے سلمیٰ صدیقی نے بتایا کہ جب رشید صاحب نے میرا مقالہ پڑھا تو بہت خوش ہوئے تھے پھر کئی روز تک اس کا ذکر کرتے رہے تھے۔ گو دس برس کی تاخیر سے یہ تاثرات مجھ تک پہنچے لیکن جب پہنچے تو میں کھِل اٹھا جیسے مجھے کوئی خزانہ مل گیا تھا۔

(۱۰)

مگر ذکر ان ایّام کا تھا جب میں اس مقالے کی تیاری کر رہا تھا۔ جب اساتذہ نے میری رہنمائی نہ کی تو میں اپنے دوستوں کی طرف متوجّہ ہوا۔ دوستوں میں سے وجیہہ الدّین نے بطورِ خاص میری مدد کی اور مجھے آرتھر کوئسلر ARTHUR KOESTLER کی کتاب "اِن سائٹ اینڈ آؤٹ لُک" INSIGHT AND OUTLOOK لا کر دی اور کہا کہ ہنسی کے سلسلے میں یہ ایک بالکل نیا اور انوکھا کام ہے۔ قبل ازیں میں ارسطو کی اس بات سے واقف ہو چکا تھا کہ ہنسی کسی ایسی کمی یا بدصُورتی کو دیکھ کر معرضِ وجود میں آتی ہے جو درد انگیز نہ ہو اور ہابز HOBBES کے اس نظریے سے بھی کہ ہنسی کچھ نہیں سوائے اس احساسِ برتری کے جو دوسروں کی کمزوریوں اور خامیوں کو سامنے پا کر وجود میں آتا ہے۔ نیز کانٹ KANT کے اس خیال سے بھی کہ ہنسی اس وقت نمودار ہوتی ہے جب کوئی چیز ہوتے ہوتے رہ جائے اور ہماری توقعات اچانک ایک بُلبلے کی طرح پھٹ کر ختم ہو جائیں۔ علاوہ ازیں ایسٹ مین EASTMAN نے ہنسی کے بارے میں ان دونوں نظریات کی جو توضیح کی تھی وہ بھی مجھے بہت اچھی لگی تھی اور ہنسی کے بارے میں میرے ذہن میں لگے جالوں کو دُور کرنے میں مددگار ثابت ہوئی تھی —— ایسٹ مین نے لکھا تھا کہ بچّے کو ہنسانے کے دو آسان طریق ہیں: پہلا یہ کہ آپ ہنسیں اور جب بچّہ آپ کی طرف متوجّہ ہو جائے تو اپنے چہرے کے خطوط کو یوں سکیڑیں کہ آپ کی صورت خوفناک دکھائی دے۔ اس پر بچّہ ہنس دے گا۔ دوسرا طریق یہ ہے کہ آپ اپنے ہاتھ میں کوئی ایسی چیز پکڑ کر بچّے کے قریب لے جائیں جسے وہ پسند کرتا ہو۔ مگر جب بچّہ ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنے لگے تو مسکرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیں۔ بچّہ اسے زندگی کا سب سے بڑا لطیفہ قرار دے گا۔ ایسٹ مین کا کہنا تھا کہ ارسطو کے نظریّے کی توثیق بچّے کے پہلے "ردِّ عمل" سے اور کانٹ کے خیال کی توثیق بچّے کے دوسرے ردِ عمل سے ہوتی ہے۔ لٰہذا دونوں نظریے اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔

مگر مجھے ذاتی طور پر ہنسی کے بارے میں برگساں BERGSON اور آرتھر کوئسلر کے نظریات نے زیادہ متاثر کیا۔ برگساں نے ہنسی کو ایک معاشرتی رویّہ قرار دیا تھا اور یوں

اس کی کارکردگی کے تناظر کو بہت وسیع کر دیا تھا۔ مثلاً اس کا خیال تھا کہ ہنسی دراصل معاشرتی سطح کی ایک سرزنش ہے جو اس فرد کو اپنا ہدف بناتی ہے جو سوسائٹی کی لکیر سے ذرا بھی بھٹکے اور اور اس غرض سے بناتی ہے کہ وہ پھر سے اس لکیر میں شامل ہو جائے۔ گویا سوسائٹی کا گلہ بان ان تمام افراد کو ہنسی کی لاٹھی سے ہانک کر دوبارہ اپنے گلّے میں شامل کرتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے سوسائٹی کے گلّے سے الگ ہو کر بھٹک رہے تھے۔ میں برگساں کے اس نظریے سے واقف ہوا تو مجھے اس کے مضمرات کا فوری طور پر احساس ہوا اور میری نظروں کے سامنے ہنسی کے حوالے سے پورے اُردو ادب کا معاشرتی پس منظر آئینہ ہوتا چلا گیا۔

آرتھر کوئسلر کا نظریہ دوسری طرح کا تھا اس نے انسان کے دو بڑے طبعی رجحانات کا ذکر کیا تھا ایک تشدّد اور مدافعت کا رجحان جس کے لیے اس نے SELF - ASSERTIVE کی ترکیب وضع کی تھی۔ دوسرا پھیلاؤ اور آفاقیت کا رجحان جسے اس نے SELF-TRASCENDING کا نام دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہنسی انسان کے پہلے رجحان کی زائیدہ ہے، جب کہ "المیّہ" اس کے دوسرے رجحان کا۔ اس کی صورت مجھے کچھ یوں نظر آئی کہ اگر آپ کسی اونچے مینار پر چڑھ کر زمین پر ایک نظر ڈالیں تو آپ کو نشیب کی ہر شئے مضحکہ خیز حد تک چھوٹی نظر آئے گی۔ سو آپ کے اندر ایک احساس بہجت جنم لے گا جس کا عضویاتی اظہار ہنسی یا تبسّم کی صورت میں ہو گا۔ مگر اسی مینار سے اگر آپ آسمان کی طرف دیکھیں تو آپ پر کائنات کی وسعت اور عظمت کا احساس غالب آجائے گا اور آپ اوپر اُٹھ کر اسے چھُونے کے ایک غیر شعوری اقدام کے مرتکب ہونے لگیں گے۔ آرتھر کوئسلر کا کہنا تھا کہ یہ "اُوپر اٹھنا" ایک تخلیقی عمل ہے۔ مجھے آرتھر کوئسلر کے اس نظریے میں بڑے امکانات نظر آئے۔

(۱۱)

۱۹۵۶ء میں مجھے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل گئی۔ اس وقت میں عمر کے چونتیسویں [۳۴] برس میں تھا۔ اسی سال سلیم پیدا ہوا۔ مولانا نے لطف لیتے ہوئے کہا۔ ع :

اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

واقعی میرے لیے وہ سال بہت اچھا تھا!

(۱۲)

"مسرت کی تلاش" نے جہاں مجھے ایک طرف مسرت کی ماہیت دریافت کرنے اور مسرت کے عضویاتی مظاہر کو سمجھنے کی ترغیب دی تھی وہاں دوسری طرف مجھے زندگی کی بظاہر چھوٹی چھوٹی چیزوں سے لطف کشید کرنے کی طرف بھی مائل کیا تھا۔ عام حالات میں تو انسان کی نظریں ایک چھوٹے سے دائرے ہی میں مقید رہتی ہیں۔ ہائیڈگر HEIDEGGAR نے اسے INTENTIONALITY کہا ہے یعنی جب نظر ایک نقطہ پر مرتکز ہو جاتی ہے اور باقی سب کچھ شعور کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس کا مثبت پہلو تو یقیناً یہ ہے کہ انسان "نقطہ" کے اندر کی کائناتِ اصغر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے مگر اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ وہ روایتی پروفیسر کی طرح اپنے اردگرد کی پوری دنیا سے منقطع ہو جاتا ہے اور یوں اشیاء، مظاہر اور معمولات سے مسرت کشید کرنے کے عمل سے محروم ہو جاتا ہے۔ مجھے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ میرے چاروں طرف اشیا کا ایک میلہ سا لگا ہے اور ان میں سے ہر چیز یقیناً اس قابل ہے کہ اس کی معیت میں چند لمحات گزارے جائیں، بس یہی وہ رویہ تھا جس سے میری انشائیہ نگاری کو تحریک ملی اور چونکہ میں آج بھی اپنے اردگرد کے ماحول کو حیرت زدہ ہو کر دیکھ رہا ہوں اور میرے لئے ہر نئی شے، کیفیت یا خیال کے پاس چند لمحے ٹھہرنا باعثِ مسرت ہے۔ اس لئے میں تا حال انشائیہ نگاری سے تائب نہیں ہوا۔ مگر جن ایام کا ذکر مقصود ہے وہ میرے لئے انکشاف و عرفان کا زمانہ تھا۔ میں نیا نیا اپنی دنیا سے متعارف ہوا تھا۔ لہٰذا اسے مشروب کی طرح پی جانا چاہتا تھا ان دنوں میں نے جو انشائیے لکھے اور جو بعد ازاں "خیال پارے" میں یکجا ہوئے، بنیادی طور پر اشیا اور مظاہر سے لطف اندوز ہونے ہی کے اقدامات تھے۔ ہر نئی کیفیت یا منظر مجھے روک لیتا تھا۔ اس طور کہ میں محسوس کرتا کہ اس کے باعث میری زندگی کسی نہ کسی حد تک تبدیل ضرور ہو گئی ہے۔ مثلاً اسی زمانے کا ایک واقعہ جس کی میں نے بائیس برس بعد شام

دوستاں آباد" میں بازآفرینی کی، میرے اندر ہونے والی اس تبدیلی ہی کا غمّاز تھا۔ قندِ مکرّر کا لطف لینے کے لئے میں اسے دوبارہ پیش کرتا ہوں:

"یہ آج سے کم و بیش بیس۲۰ برس پہلے کا واقعہ ہے۔ ان دنوں مجھے شکار کا شوق جنون کی حد تک تھا اور میں ہر تیسرے چوتھے روز اپنے گاؤں سے کئی میل دُور ایک جھیل پر مرغابی کے شکار کے لئے جایا کرتا تھا۔ دسمبر جنوری کی منجمد کرنے والی سردی میں رات کے پچھلے پہر بیدار ہونا اور بندوق کاندھے سے لٹکائے میل ہا میل پیدل سفر کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ میں پَو پھٹنے سے پہلے ہی جھیل کنارے جا پہنچا اور ایک جھاڑی کی اوٹ میں کھڑے ہو کر مرغابیوں کا انتظار کرنے لگا۔ ایسے وقت میں مرغابیاں جیٹ ہوائی جہازوں کی طرح آتی ہیں اور جھیل کے صاف شفاف رَن وے پر لینڈ کرتی چلی جاتی ہیں۔ جب وہ نیچے آ رہی ہوں تو انھیں بندوق کا نشانہ بنانا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ مگر نہ جانے کیا بات ہوئی کہ اس روز قدرت کے یہ جیٹ ہوائی جہاز قدرے تاخیر سے آئے تاہم وہ بڑی تعداد میں آئے اور ان کے پَروں کی جھنکار ایک سرمدی نغمے کی طرح ساری فضا پر چھا گئی۔ تب نیل سروں کی ایک ڈار نے میرے نہایت قریب آ کر پانی میں اُترنے کے لئے اپنے زاویے کو ذرا سا تبدیل کیا اور اُبھرتے سُورج کی ایک نٹ کھٹ شعاع نے اس پر زرد رنگ کی پچکاری چھوڑ دی اور پوری ڈار ایک نقرئی جالر میں تبدیل ہو کر جھیل کی سطح سے جا ٹکرائی۔ معاً مجھے محسوس ہوا کہ چاروں طرف ایک سحرطراز روشنی پھیل رہی ہے۔ جھیل کی سطح چاندی کا ایک تھال سا بن گئی ہے جس پر مرغابیاں سونے کی ڈلیوں کی طرح جا بجا بکھر گئی ہیں۔ ایسا دل رُبا منظر میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی عنکبُوت کے سُنہری جال میں جکڑ دیا گیا ہوں اور بندوق کی لبلبی دبانے کی مجھ میں سکت ہی باقی نہیں رہی۔ تب میں سوچنے لگا کہ قدرت نے آج کس فراخ دلی سے میرے سامنے رنگ و نُور کی ایک چادر سی پھیلا دی ہے اور میں ہوں کہ اس نورانی چادر کو خون سے داغ دار کرنے

کا ارادہ رکھتا ہوں۔ بس وہ دن اور آج کا دن، میں نے پھر کبھی کسی پرندے کو بندوق کا نشانہ نہیں بنایا۔ نشانہ بنا ہی نہیں سکا۔ مجھے شکار کا بے حد شوق تھا اور اس لئے میں نے متعدد بار اس واقعہ کو بھلا دینے کی کوشش کی تاکہ میں اپنے مشغلے کو جاری رکھ سکوں لیکن کہاں؟ کیونکہ ہر بار جب میں بندوق کو چھوتا تو میری چشمِ تصور کے سامنے وہی سحر طراز روشنی اُمڈتی چلی آتی جس پر مرغابیوں کی ایک ڈار سنہری جھالر کی طرح چمک رہی ہوتی اور میں گھبرا کر بندوق یوں پرے پھینک دیتا جیسے میرے ہاتھوں نے لوہے کی تپتی ہوئی سلاخ کو چھو لیا ہو۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ میں نے شکار اور شکار کے ساتھ ساتھ اُس روز کے دل رُبا منظر کو بھی اپنے ذہن سے خارج کر دیا۔ مگر لاشعور سے شاید یہ واقعہ پوری طرح محو نہ ہو سکا۔ کیونکہ پچھلے دنوں ایک نظم لکھتے ہوئے جب یہ چند مصرعے نوکِ قلم سے ٹپکے تو مجھے برسوں پرانے اس واقعہ کی یاد دلا گئے یہ گویا اس بات کا ثبوت تھا کہ لاشعور نے اس واقعہ کو فراموش نہیں کیا تھا۔"

جب آنکھ کھُلی میری

جب آنکھ کھُلی میری
دیکھا کہ ہر اک جانب
زرتار سی کرنوں کا
اک زرد سمندر تھا

اور زرد سمندر میں
چاندی کی پہاڑی پر
میں پیڑ تھا سونے کا
شاخوں میں میری ہر سُو
جھنکار تھی پتّوں کی
اُڑتی ہوئی چڑیوں کی

یا آگ کی ڈلیوں کی
اک ڈار سی آئی تھی
اور مجھ میں سمائی تھی
قدموں کے تلے میرے
زنجیر تھی لمحوں کی
میرے زرّہ بکتر سے
جو کوندا لپکتا تھا
تاروں کے جھروکوں تک
پل بھر میں پہنچتا تھا
میں جسم کے مرقد سے
باہر بھی تھا اندر بھی
میں خود ہی پہاڑی تھا
اور خود ہی سمندر بھی!

(۱۳)

ہر چند میں ابتدا میں زندگی کو ایک "کُل" کی حیثیت میں دیکھتا رہا تھا اور کائنات کی یکتائی کا احساس مجھ پر غالب تھا۔ مگر پھر آہستہ آہستہ مجھے محسوس ہوا کہ "کُل" تو اجزا کا مرکب ہے اور ان میں سے ہر جُز کا ایک اپنا وجود اور انفرادیّت ہے۔ لہٰذا جُز سے صرفِ نظر کرنا مناسب نہیں۔ لیکن انفرادیّت کا احساس تقابل کے بغیر وجود میں کیسے آسکتا تھا؟ اگر کائنات بین بجز نُور کچھ نہ ہوتا تو نُور کی پہچان کیسے ہوتی؟ سو بنیادی بات شاید یہ تھی کہ "ایک" نے اپنا اظہار "دو" میں بٹ کر کیا تھا۔ نتیجتاً دونوں حصّے ایک دوسرے کے لئے آئینہ بن گئے تھے۔ دراصل جیسا کہ میں نے اُوپر کہیں لکھا ہے، "دو" میں بٹنے کا یہ احساس میری ازدواجی زندگی کی دین بھی تھا۔ بے شک ابتدا میں تو کچھ عرصے کے لئے مجھے محسوس ہوا تھا کہ ہم "دو" نہیں بلکہ ایک ہیں یعنی فراقِ منزل و گام

کا کوئی قضیہ موجود نہیں ہے مگر پھر جلد ہی تعینات کی صورت وجود میں آ گئی اور ایک دو میں بٹا ہوا نظر آنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ "ثنویت" کے اس تصور سے بھی میں اسی موقع پر آشنا ہوا جس نے آگے چل کر میری کتاب "اردو شاعری کا مزاج" کے لئے ایک بنیاد مہیا کرنا تھی۔ انھیں دنوں میں نے بعض ایسی نظمیں بھی لکھیں جن میں لاشعوری طور پر "میں اور تو" کی ثنویت ابھر آئی تھی۔ دراصل بات صرف دو میں بٹ جانے کی نہیں تھی بلکہ ایک نئے جذباتی رشتے کی تھی۔ ایک دو میں بٹ تو گیا تھا مگر اب دونوں حصے ایک نئی جذباتی سطح پر ایک دوسرے کے مقابل آ گئے تھے اور ایک دوسرے کی کشش کو محسوس کر رہے تھے۔ یہ کشش میری نظم "میں اور تو" میں بطورِ خاص نمایاں تھی :

اک البیلی پگڈنڈی ہے
افتاں خیزاں، گرتی پڑتی، ندی کنارے اُتری ہے !

ندی کنارے، باہیں کھولے، اک البیلا پیڑ کھڑا ہے !
پیڑ نے رستہ روک لیا ہے
پگڈنڈی حیران کھڑی ہے
جسم چرائے، آنکھ جھکائے
دائیں بائیں دیکھ رہی ہے !

جانے کب سے باہیں کھولے، رستہ روکے پیڑ کھڑا ہے
جانے کب سے
جسم چرائے آنکھ جھکائے، پگڈنڈی حیران کھڑی ہے !

پگڈنڈی اور پیڑ کی نفسیاتی توجیہہ سے قطع نظر، دیکھنے کی بات صرف یہ تھی کہ ہرچند پیڑ اور ندی دونوں کو اپنے الگ الگ وجود کا احساس تھا۔ مگر دونوں مستقل طور پر ایک دوسرے کے آمنے

سامنے آکھڑے ہوتے تھے گویا ثنویت کے وجود کا احساس غالب آ گیا تھا یہ نظم ۱۹۵۷ء میں لکھی گئی مگر اس سے ایک سال قبل "من و تو" کے نام سے میں ایک اور نظم بھی لکھ چکا تھا جس میں مرد کو سمندر سے اور عورت کو جزیرے سے تشبیہہ دی گئی تھی اور اس خیال کو اُبھارا گیا تھا کہ جزیرہ خامشی سے ہم کنار رہتا ہے جب کہ سمندر موجۂ طوفان اور ہوائے شعلہ بار سے اپنے وجود کا اعلان کرتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جزیرہ سدا سے بحر کی اس آشفتگی پر خندہ زن بھی ہے۔

ثنویت کا یہ احساس ازدواجی زندگی کا زائیدہ تو تھا مگر جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ وہ دائرہ در دائرہ پھیل رہا ہے۔ چنانچہ بہت جلد اس نے مظاہرِ فطرت، تہذیبوں اور طبقات کو بھی اپنی لپیٹ میں لینا شروع کیا۔ انہی دنوں میں نے ہیگل اور مارکس کا مطالعہ کیا۔ تھیسس اور اینٹی تھیسس THESIS AND ANTI-THESIS کی قوتوں سے آگاہ ہوا مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ دونوں جب مل کر سنتھی سس SYNTHESIS بناتی ہیں تو دراصل ایک نئی ثنویت کا سنگِ بنیاد رکھتی ہیں۔ جلد ہی میں ثنویت کا پوری طرح احاطہ کرنے کے لئے پُرشش اور پرکرتی ین اور ریانگ اور اہرمزا اور اہرمن سے متعلق لٹریچر کا مطالعہ کرنے لگا یہ سارا مطالعہ "اُردو شاعری کا مزاج" لکھنے کے دوران میرے بہت کام آیا۔

۱۴

انھیں دنوں (یہ غالباً ۱۹۵۸ کا واقعہ ہے) حکومتِ پاکستان نے فارم یوتھ ایکسچینج کے تحت آئے ہوئے ایک امریکی نوجوان کو دو ہفتوں کے لئے میرا مہمان نامزد کیا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ دو ہفتے میرے فارم پر رہے — کھیتوں پر کام کرے اور پاکستانی زراعت کے مزاج سے شناسائی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں امریکی زراعت کا طریق کار بھی بتائے۔ مجھے اس نوجوان کا نام یاد نہیں رہا۔ بس اس کا حلیہ، اس کا قد کاٹھ نیز اس کی قابلِ رشک صحت کا تاثر آج بھی باقی ہے۔ دن رات اس امریکی نوجوان کی ساتھ رہ کر مجھے امریکی کردار کا اندازہ ہوا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ہر انگریز ایک جزیرہ ہے (خود انگلستان بھی تو ایک جزیرہ ہے) اور ہر امریکی ایک براعظم ہے۔ اس نوجوان کو مل کر مجھے بالکل سچ نظر آیا۔ امریکی کردار کے بارے میں ہماری زیادہ تر معلومات فلموں اور ناولوں سے اخذ کردہ ہیں یا پھر ان جھوٹے سچے سفرناموں کا عطیہ ہیں

جن میں ہمارے ادبا نے زیادہ تر امریکی شہروں کے تمدّن کو اپنا موضوع بنایا ہے مگر یہ نوجوان امریکہ کے دیہات سے آیا تھا اور مجھے یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ وہ بھی سماجی شیرازہ بندی اور معاشرتی قدروں کا اسی طرح دالہ و شیدا تھا جس طرح ہمارے دیہات میں رہنے والے لوگ! شاید یہی وجہ ہے کہ امریکہ کا قومی شاعر والٹ وہٹ مین WALT WHITMAN ہے جو ہمارے ہاں کے کبیر کی فوٹو سٹیٹ کاپی ہے۔ جو کھلی کھلی کیفیت، قوّتِ برداشت، ایک دوسرے کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہونے کی روایت ہمارے ہاں پروان چڑھی ہے کم و بیش وہی امریکہ کی دیہی معاشرت میں بھی نظر آتی ہے۔ کم از کم امریکہ کے دیہاتی نوجوان کو دیکھ کر اور اس سے باتیں کر کے مَیں نے یہی تاثر قبول کیا۔ دو اور باتوں میں بھی مجھے مماثلت کا احساس ہوا۔ ایک یہ کہ وہ مکان کو ضرورت کی چیز سمجھتا تھا نہ کہ سماجی مرتبے کے اظہار کا ذریعہ۔ مثلاً مَیں ایک روز اسے جی۔ ایم نگمیانہ کے ہاں لے گیا (جی۔ ایم نگمیانہ میرے نہایت عزیز دوست تھے۔ امریکہ سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ اور ان دنوں کھیتی باڑی میں دلچسپی لے رہے تھے۔ افسوس کہ وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکے) ہم نے رات ان کی عالی شان کوٹھی میں بسر کی۔ صبح مَیں بیدار ہوا تو امریکی کو غائب پایا۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ وہ کوٹھی کی پورچ میں زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ مَیں بھی اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور پوچھا کہ کیا کر رہے ہو۔ کہنے لگا۔ مَیں اس بات پر غور کر رہا ہوں کہ انسان کو رہنے کے لئے کل کتنی جگہ درکار ہے۔ مثلاً دیکھو مسٹر نگمیانہ کو اتنے بڑے محل کی کیا ضرورت ہے جب کہ اسے اپنی رہائش کے لیے دو کمروں سے زیادہ جگہ درکار نہیں ہے۔ میرے لئے ایک امریکی کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ حیران کن تھے کیونکہ امریکہ کے بارے میں میرا یہ خیال تھا کہ وہاں کا ہر باشندہ اپنے جسم سے کہیں زیادہ جگہ گھیرنے کا شوقین ہے ——— دوسری بات جو مجھے اپنے اور امریکی معاشرے میں ایک "قدرِ مشترک" کے طور پر نظر آئی وہ اس امریکی نوجوان کا ایک فقرہ تھا جو طیش کے عالم میں اس کے منہ سے نکل گیا۔ ہوا یہ کہ ایک روز زراعت کے مختلف نظاموں پر بحث کرتے ہوئے مَیں نے چین کے کمیونز COMMUNES کا ذکر چھیڑ دیا اور پھر ان کی تعریف کرنے لگا۔ بس پھر کیا تھا۔ امریکی نوجوان کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور اس پر چڑھا ہوا تہذیب کا نقاب آنِ واحد میں اُتر گیا۔ کہنے لگا چین میں فاشزم ہے۔ وہاں سب ڈھور ڈنگروں کی طرح رہتے ہیں، شخصی آزادی ناپید ہے۔ وہاں

تو جنگل کا قانون نافذ ہے۔ یہ تم کس ملک کا ذکر کر رہے ہو؟ اُن دنوں امریکہ اور چین کے تعلقات اچھے نہیں تھے جبکہ پاکستان چین دوستی مثالی حیثیت رکھتی تھی۔ ظاہر ہے کہ مجھے امریکی کا یہ ردِّ عمل اچھا نہ لگا۔ سو مَیں نے ازراہِ شرارت کہا کہ چلو جنگل کا قانون سہی۔ مگر تم دیکھو کہ وہ کس طرح تیس برس کی مدت میں فوجی اعتبار سے ایک سُپر طاقت بن گیا ہے۔ میرا یہ کہنا تھا کہ امریکی نوجوان مشتعل ہو گیا۔ کہنے لگا: "تم فوجی طاقت کی بات کرتے ہو، ہم ایک رات میں ایٹم بم مار کر پورے چین کو صفحۂ خاک سے مٹا سکتے ہیں۔ معاً مجھے ہیروشیما اور ناگاساکی یاد آ گئے اور میں سوچنے لگا کہ جس طرح طیش کے عالم میں امریکی اپنی ساری تہذیب کو بھول کر شقاوت اور بے رحمی کا مظاہرہ کرتے ہیں بالکل اسی طرح بحران کی زد میں آنے پر ہمارے اندر سے بھی وحشی انسان مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا برآمد ہو جاتا ہے۔ مجھے ۱۹۴۷ء کے فسادات یاد آ گئے اور پھر وہ برہنہ لاش جو مَیں نے نہر میں بہتی ہوئی دیکھی تھی اور میرے سارے بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔

(۱۵)

گاؤں میں رہتے ہوئے اب مجھے تقریباً دس برس ہو چکے تھے اور میرے پاؤں کے تلوؤں میں گُدگُدی سی ہونے لگی تھی۔ یہ نہیں کہ مَیں گاؤں کی زندگی سے تنگ آ گیا تھا، بلکہ یہ کہ گاؤں کے جادو نے مجھے ایک پتھر کے بُت میں تبدیل کرنا شروع کر دیا تھا، یہ وہی احساس تھا جو یوسف ظفر کو ازدواجی زندگی کے ان مراحل میں ہوا تھا جب اسے اپنے چاروں طرف نرم و نازک اُنگلیوں سے بنا ہوا ایک "زندان" دکھائی دیا تھا۔ خود مجھے زندان تو دکھائی نہیں دیا تھا۔ البتہ دھرتی کی کششِ ثِقل مجھے اس بُری طرح اپنی طرف کھینچ رہی تھی کہ میری "آزادی" کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ دھرتی کا انداز عجیب ہے وہ پہلے تو فرد کو اپنی طرف کھینچتی ہے پھر اسے ریزہ ریزہ کر کے خود میں شامل کر لیتی ہے۔ مَیں بھی محسوس کر رہا تھا کہ ہر روز بھُربھُری چٹان کی طرح میرے بدن کا کوئی نہ کوئی حصّہ ٹوٹ کر گرتا اور پھر ریزہ ریزہ ہو کر زمین کا جُزوِ بدن بن جاتا۔ یہی نہیں دھرتی کی اپنی چند موسمی اور معاشرتی کھائیاں بھی تھیں جس میں اس نے اپنی اولاد کو پناہ دے رکھی تھی اور یہ اولاد کھائیوں میں چلتی ہوئی ایک ہی نقطے کے گرد گھوم رہی تھی۔ کھیتی باڑی کے سارے وظائف

موسموں کے مدّوجزر کے تابع تھے۔ بارہ کے بارہ مہینے اپنی اپنی جگہ پر جیسے ازل سے نقلی چوکیداروں کی طرح ایستادہ تھے بلکہ یوں کہئیے کہ زمین میں نصب تھے۔ جیٹھ ہاڑ میں گرمی پڑتی، ساون بھادوں میں برکھا ہوتی، پوہ ماگھ میں کُہرا پڑتا۔ صدیوں سے یہی چلن تھا۔ کبھی کبھار اگر معمول میں کوئی شے رخنہ انداز ہوتی تو اسے واقعہ قرار دے دیا جاتا اور اس سے تاریخیں متعین ہوتیں۔ مثلاً یہ کہ فلاں شخص کی موت یا شادی اُس برس ہوئی تھی جب ساون نہیں لگا تھا یا جس سال بڑا بھونچال آیا تھا وغیرہ۔ پورا کاشتکاری کا نظام ایک دائرے میں گھوم رہا تھا۔ ہر سال بیج کو زمین کے سُپرد کر دیا جاتا اور وہ ایک معیّن عرصے کے بعد خوشوں میں ڈھل جاتا۔ پھر کٹائی ہوتی۔ اس کے بعد کھلیان بھر جاتے مگر ایک ہی سال میں کھاد بن کر دوبارہ زمین میں شامل ہو جاتے ہر شے زمین سے پیدا ہو کر واپس زمین میں جا رہی تھی۔ انسان بھی زمین کے نمک پانی اور دوسرے اجزا کا آمیزہ ہے۔ مگر جب عناصر کا ظہورِ ترتیب ٹوٹتا تو واپس دھرتی کی کوکھ میں چلا جاتا۔ ہر طرف دائرے ہی دائرے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ دائرے لمحہ بہ لمحہ تنگ ہو رہے ہیں اور مَیں خاک میں مل کر خاک ہونے لگا ہوں۔ اس میں لطف تو بہت تھا کیونکہ اتنی بڑی ہستی میں جذب ہو جانا ایک سعادت تھی تاہم اس سے آزادی کے چھن جانے کا خطرہ بھی تھا۔ میں دوسرے کسانوں کی طرح دھرتی سے پیار تو کرتا تھا۔ مگر ان کی طرح دھرتی کا تابع مہمل بننے سے گریزاں تھا۔ ان دنوں میں مجھے اپنا گاؤں ایک ایسے پیپل کی طرح دکھائی دیا جس کی جڑیں تو زمین کے اندر دُور تک اُتری ہوئی تھیں مگر جس کی شاخوں میں معاشرے کی ہر کروٹ اپنے مقررہ وقت پر آتی اور پیپل کو تھوڑی دیر کے لئے جگا کر واپس چلی جاتی:

پیپل کیا ہے؟ —— جوگی کا بے دَر سا اک استھان
جھونکے، پتّے، پنچھی، انسان سب اس کے مہمان
کھاٹ پہ لیٹا سوچ رہا ہوں، مَیں مورکھ نادان!

انہی دنوں ملک میں پہلا مارشل لا لگا۔ بازاروں اور گلیوں کی صفائی ہونے لگی۔ قطار بندی کی تلقین

کی جانے لگی۔ انسانوں کے جمِ غفیر کو کھائیوں میں چلانے کی مہم جاری ہوئی۔ یکا یک مجھے محسوس ہوا کہ میرے گاؤں میں صفائی پسندی کی مہم، مہینوں اور سالوں کی قطار بندی کا عمل اور کھائیوں میں چلنے کی روش، ان سب نے پھیل کر پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ردِّ عمل کے طور پر میرے اندر ترتیب کے عمل نیز سیدھی سڑک پر چلنے یا چلانے کے رویّے کو خندۂ استہزا میں اڑانے کا آغاز ہوا جو میری نظموں اور انشائیوں میں کو دینے لگا۔ مثلاً میں نے اپنے انشائیہ "پگڈنڈی" میں لکھا:

"پگڈنڈی اختیار کرنے میں بڑا لطف ہے۔ آپ کے سامنے زمین کا ایک طویل و عریض خطہ ہے جس میں آپ اپنے قدموں سے اک نئی راہ تراشتے ہیں ــــ سڑک کو تو ایک دوسرے کے تعاقب میں بڑھتے ہوئے قدموں نے روند روند کر سیدھا کر دیا ہے حتّٰی کہ جب آپ بھی ان قدموں کے نشانوں پر چلتے ہیں تو سڑک کی ہیئت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ لیکن جب آپ پگڈنڈی اختیار کرتے ہیں تو اپنی فطری متلوّن مزاجی کا بیّن ثبوت مہیّا کرتے ہیں......... شاید اسی لیے پگڈنڈی سڑک کی طرح سیدھی نہیں ہوتی۔ اس میں انسانی مزاج کے سارے پیچ و خم نمودار ہو جاتے ہیں۔ یہ چلتی ہے، رُکتی ہے، ہٹتی ہے، سیدھی ہوتی ہے اور پھر یکلخت مڑ جاتی ہے۔ درختوں سے خود کو بچا کر، چٹانوں سے کترا کر، کھیتوں کو چیر کر، ہر قسم کے نشیب و فراز سے ہم کنار ہوتی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے ــــ سڑک پر چلتے ہوئے آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ تنہا نہیں ہیں، آپ کے ساتھ ایک مشتعل ہجوم ہے دوست احباب، عزیز و اقارب، اپنے بیگانے، سب لوگ ہمراہ ہیں۔ ترشا ترشایا ہوا راستہ ہے ڈھلی ڈھلائی گھاتیں ہیں، بنے بنائے اصول اور نپی تلی باتیں ہیں لیکن پگڈنڈی پر چلتے ہوئے کوئی بات بھی قانون اور ضابطے کے تابع نہیں ــــ آپ گویا پہلے انسان ہیں جو ملاءِ اعلیٰ سے جھگڑ کر، فرشتہ پن سے مایوس ہو کر، اس خطۂ ارضی پر اُتر آئے ہیں اور اب آپ کے سامنے نہ کوئی منزل ہے اور نہ نشانِ منزل! اُوپر آسمان کی بے کنار وسعتیں ہیں۔ نیچے زمین کا فراخ سینہ ہے۔ آپ کے ہاتھ میں چھڑی اور لبوں پر سیٹی ہے اور آپ کسی ذی رُوح کا سہارا لیے بغیر خراماں

خراماں بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ سڑک آپ کو راستہ دکھاتی ہے، منزل کا نشان بتاتی ہے، ہمراہیوں کا سہارا دلاتی ہے۔ لیکن پگڈنڈی کو آپ خود راستہ دکھاتے اور خود سہارا دیتے ہیں۔ پگڈنڈی اختیار کرنے میں یہی سب سے بڑا لطف ہے!"

عجیب بات یہ تھی کہ گاؤں کے "قیام" کے دوران میں نے سب سے پہلے پگڈنڈیوں کے خلاف مہم جاری کی تھی اور زمین کو سیدھی سڑکوں اور روِشوں سے مزیّن کر دیا تھا حتّٰی کہ درختوں تک کو قطاروں میں لے آیا تھا اور اب میں واپس پگڈنڈیوں کی دُنیا میں جانے کا آرزومند تھا دراصل خودرو جنگل اور اُس کی پگڈنڈیاں میرے لاشعور میں شاید لاکھوں برس سے ایک حالتِ خواب میں موجود تھیں اور ہر چند میں نے شعور کی دُنیا میں اپنے لئے سیدھے راستے بنا لئے تھے۔ مگر ذات کے اندر "آزادہ روی" کا وہ رویّہ بدستور موجود تھا جو حد بندیوں اور ضابطوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اندر سے انسان بچّے کی طرح ہے۔ بچّے کو آپ ہزار منہ ہاتھ دُھلا کر نئے کپڑے پہنائیں وہ چند ہی لمحوں کے بعد واپس اپنے فطری لباس میں آ جائے گا۔ کچھ یہی حال میرا تھا کہ میں واپس پگڈنڈیوں کی دنیا میں جانا چاہتا تھا۔ عام زندگی میں تو یہ ممکن نہیں تھا اور نہ مناسب مگر ذات کے اندر تو میں کُھل کھیل سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے باہر کی دنیا میں جن پگڈنڈیوں کو صفحۂ خاک سے مٹایا تھا اور جن جنگلوں کو باغوں میں تبدیل کیا تھا انھیں اپنے اندر کی زمین پر دوبارہ اُگا لیا۔ مراد یہ کہ میں خیال اور عادات کی بنی بنائی کھائیوں سے باہر آنے کے لئے کوشاں ہو گیا۔ ذہنی اور تخلیقی سطح پر مجھے "آزادہ روی" کے اس میلان نے بہت فائدہ پہنچایا بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ میرے ہاں انشائیہ نگاری کا رُجحان بھی اصلاً اپنے ہی اُگائے ہوئے "باغِ عدن" سے آزادی حاصل کرنے کا ایک اقدام تھا۔

اُن ہی دنوں میں نے ایک انشائیہ بعنوان "بے ترتیبی" لکھا۔ مجھے اپنے گھر کے اندر ہر جگہ ضرورت سے زیادہ ترتیب دکھائی دینے لگی تھی جو بعض اوقات مجھے بالکل مصنوعی لگتی۔ میں سوچتا کہ ترتیب کوئی فطری عمل نہیں ہے۔ انسان کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ اصل ترتیب تو بے ترتیبی اور فطری سطح کی آزادی کو حاصل ہے۔ میں دراصل ترتیب کے خلاف اتنا نہیں تھا جتنا ترتیب کے مصنوعی عمل اور اس کے عقب میں سکول کے ہیڈ ماسٹر ایسے رویّے کے

خلاف تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے انشائیہ "بے ترتیبی" کا آغاز اس پیراگراف سے کیا:

"میرے ملازم کی یہ ایک نہایت بُری عادت ہے کہ جیسے ہی میں کہیں باہر جاتا ہوں وہ بے جھجک میرے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے اور آناً فاناً میرے پھیلائے ہوئے انتشار کو ترتیب اور سلجھاؤ میں بدل دیتا ہے۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا ہے کہ بھلے آدمی یہ کوئی قبرستان تو ہے نہیں کہ قبروں کی طرح میزیں، کرسیاں اور کتابیں بھی ایک خاص ترتیب میں قطار اندر قطار نظر آئیں۔ لیکن نہ جانے کیوں بات اس کی سمجھ میں آتی ہی نہیں" وغیرہ

لیکن جب میری بیوی نے یہ انشائیہ پڑھا تو بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آ گئی۔ کہنے لگی: "نوکر غریب کو آپ نے عبث بدنام کیا۔ انشائیے میں اصل "ہدف" تو میں تھی۔"

اس انشائیے کے آخری حصّے میں بات کمرے کی بے ترتیبی تک محدود نہ رہی بلکہ اُوپر اٹھ کر پوری کائنات کی بے ترتیبی تک پھیل گئی۔ کچھ اس انداز میں:

"فطرت کا سارا حُسن اس کی بے ترتیبی میں ہے۔ سیدھے خط تو صرف انسان کھینچتا ہے اور بزعمِ خود سمجھتا ہے کہ اس نے کوئی بڑا تیر مار لیا ہے۔ انسان کے اُگائے ہوئے باغوں اور ترتیب دیئے ہوئے پارکوں کا حُسن قاعدے اور اُصول کا رہینِ منّت ہے لیکن فطرت کا حُسن تو ان باتوں کا محتاج نہیں۔ جو پاگل کر دینے والی خوبصورتی، جو نشیلی کیفیت ایک خود رو جنگل میں ہے، ایک صاف سُتھرے بنے ٹھنے ہوئے باغیچے میں کہاں؟ لیکن جنگل ترتیب کا محتاج نہیں اس کا سارا حُسن بے ترتیبی میں ہے۔ پہاڑوں کے سلسلے، دریاؤں کے پیچ و خم سمندر کے کٹے پھٹے کنارے اور آسمان کے نیلگوں فرش پر پڑی بے پروائی سے بکھرے ہوئے اَن گنت ستارے ——— کوئی چیز بھی تو ترتیب کے حصار میں قید نہیں۔ انسان کی ساری عمر اشیا کو ترتیب دینے میں بیت جاتی ہے اور ہر بار فطرت کی لازوال بے ترتیبی کا عمل بڑھ کر اس ترتیب کو ختم کر دیتا ہے اس لئے کہ ترتیب ایک خلافِ فطرت عمل ہے ——— تہذیب کی

گرینڈ ٹرنک روڈ، سماج کی دائرہ در دائرہ تنظیم، نقطۂ نظر کی سیدھی لکیر۔
یہ سب انسان نے اپنی سوچ بچار سے ترتیب دئے ہیں۔ فطرت سے اخذ نہیں کئے ------ وغیرہ۔"

(۱۷)

میرے لئے اپنے گاؤں سے منقطع ہونے کا تو سوال نہیں تھا۔ کیونکہ میں نہ صرف حصولِ رزق کے لئے اس کا مرہونِ منّت تھا بلکہ جذباتی طور پر بھی اس کی دھرتی اور مظاہر سے پوری طرح جُڑا ہوا تھا۔ بس میں لمحاتی طور پر بوریت محسوس کرنے لگا تھا اور چاہتا تھا کہ تبدیلی آئے۔ باہر کی وسیع فضا میں نکلوں، پوری دنیا کے جوار بھاٹے کا نظارہ کروں ــــ دیکھوں کہ ہجوم کیا ہوتا ہے اور اس کا طریقِ کار کیا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ دوستوں کے حلقے میں وسعت پیدا کروں تاکہ میری شخصیت پر سے وہ زنگ اُتر سکے جو گاؤں کے طویل "قیام" کے باعث اب مجھے صاف نظر آنے لگا تھا۔

مگر گاؤں سے ہجرت کرنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ مینا اب سات برس کی ہو گئی تھی۔ اور سلیم تین برس کا اور اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ انھیں شہر کے کسی اچھے سکول میں داخل کرایا جاتا۔ کسی زمانے میں سرگودھا شہر کے باہر، ریلوے سٹیشن کے قریب (ان دنوں یہ علاقہ شہر کا حصّہ متصوّر نہیں ہوتا تھا گو اب شہر نے اس پر پوری طرح قبضہ جما لیا ہے۔) کسی ڈاکخانے کی ایک خستہ حال پُرانی عمارت تھی جو والد صاحب نے کسی لمحۂ خود فراموشی میں خرید لی تھی۔ ہم لوگ جب سرگودہا جاتے تو اس عمارت ہی میں قیام کرتے لیکن ہمیشہ یہی محسوس ہوتا کہ کسی سرائے میں پڑے ہیں۔ مجھے جب سرگودھا میں بودوباش اختیار کرنے کی ضرورت پڑی تو میں نے اس عمارت کو گرا کر اپنے لئے ایک نیا گھر بنایا۔ پُرانے مکان کا تقریباً سارا ملبہ نئے گھر کی تعمیر میں صرف ہوا۔ لکڑی گاؤں کے درختوں نے مہیّا کر دی۔ مزدور بھی میں گاؤں سے لے آیا۔ چنانچہ چند ہی ماہ میں ہمارا گھر تعمیر ہو گیا۔ بعد ازاں یہ "۵۸۔ سول لائنز" کے نام سے مشہور ہوا۔ مشہور اس لئے کہ اس میں ملک کے چوٹی کے فن کاروں، ادیبوں اور دانشوروں نے چند گھنٹوں یا چند دنوں کے

لئے قیام کرکے اسے عزت اور وقار عطا کیا۔ آیندہ دس بارہ سالوں میں اتنی بڑی بڑی شخصیتیں اس "خانۂ انوری" میں تشریف لائیں کہ آخر ایک روز پروفیسر غلام جیلانی اصغر کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔ طنز کو مزاح میں لپیٹ کر گویا ہوئے:

یہ ۵۸۔ سول لائنز نہیں، ۱۰۔ ڈاؤننگ سٹریٹ ہے!!

سفر

۱۹۵۹ء تا ۱۹۷۵ء

اَب دُھول میں اٹے ہوئے رستوں پہ ہے سفر
وہ دن گئے کہ قدموں تلے نرم گھاس تھی

۱

سرگودھا میں بود و باش اختیار کرتے ہی میرا سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔ مگر اب اس کی نوعیت پہلے سفر سے بالکل مختلف تھی۔ میری زندگی کا پہلا سفر جو تقریباً ستائیس سالوں پر پھیلا ہوا تھا۔ اصلاً ہوا کا پلّو تھام کر چلنے کی ایک صُورت تھی۔ چنانچہ ہوا جہاں چاہتی مجھے لئے لئے پھرتی۔ بے شک میں اس دَور کے آخری حصّے میں بظاہر ایک جگہ رک گیا۔ مگر میں اس زمانے میں بھی ایک طرح کی داخلی لامرکزیّت کی زد میں رہا۔ ذہنی اور جذباتی طور پر قطعاً بے پتوار اور بے سمت! مگر جب میں ایک طویل عرصہ گاؤں میں رہنے کے بعد سرگودھا منتقل ہوا تو میری زندگی کا وہ سفر شروع ہوا جو ایک مرکز NUCLEUS کے گرد ہمہ وقت پھیلتے ہوئے دائروں کی صورت میں تھا۔ گویا اب میں نے بیک وقت کئی مداروں میں سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری حالت اس نمک لگے جامن کی سی تھی جسے گڑوی میں ڈال کر اور گڑوی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے جنبش دی جاتی ہے حتّٰی کہ وہ اندر اور باہر سے پوری طرح نرم اور خستہ ہو جاتا ہے۔ میں بھی سرگودھا آتے ہی داخلی اور خارجی سطحوں پر ایک مسلسل حرکت کی زد میں آگیا تھا اور میرے احساسات میں کئی طرح کے جوار بھاٹے آنے لگے تھے۔ جس کے نتیجے میں میری شخصیّت کا ذرہ بذرہ جگہ جگہ

سے ٹوٹنے لگا تھا۔ شکست و ریخت اور اس کے بعد نسبتاً بلند سطح پر تعمیرِ نو کا یہ سلسلہ میری اس زمانے کی نظموں، انشائیوں اور تنقیدی کتابوں میں بآسانی پڑھا جا سکتا ہے۔

سرگودھا پہنچ کر میری زندگی نے جن مختلف دائروں میں حرکت شروع کی ان میں سے ایک سرگودھا کی شہری زندگی نے مرتب کیا تھا۔ میرے گھر میں ٹیلی فون لگ گیا تھا۔ لہٰذا میں پورے شہر سے مصروفِ گفتگو ہو گیا۔ شام کو ۵۸۔ سول لائنز میں "شامِ دوستاں" منعقد ہونے لگی۔ جس میں ہر ہفتے کسی نہ کسی نئی شخصیت کا اضافہ ہو جاتا۔ ابتداً میر عبدالرشید اشک، انور گوئندی، غلام جیلانی اصغر اور کبھی کبھی الطاف مشہدی آتے رہے۔ پھر سجاد نقوی اور ان کے ساتھ میرزا ریاض اور کبھی کبھی انور سدید آنے لگے۔ انہی دنوں عصمت اللہ، رحمٰن قریشی اور ڈاکٹر سہیل بخاری اور کچھ عرصہ بعد خورشید رضوی سے مراسم استوار ہوئے اور شامِ دوستاں آباد ہوتی چلی گئی۔ مگر یہ تو ایک دائرہ تھا۔ دوسرا دائرہ شہر کی انجمنوں اور اداروں نے مرتب کیا۔ میں ان میں سے بیشتر انجمنوں اور اداروں کا رُکن اور بعض کا بنیادی رُکن تھا۔ اور اب میں ان کے جلسوں میں التزام کے ساتھ شریک ہونے لگا تھا۔ یہ سب ادارے زرعی اور نہری مشاورتی کمیٹیوں، روٹری کلب، آرٹ کونسل، سرگودھا اکادمی اور بعض دیگر سوشل تنظیموں کی صورت میرے چاروں طرف پھیلے ہوتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ میں ایک پروانے کی طرح ان سب شمعوں کے گرد مسلسل گھوم رہا تھا۔ کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ میں ان میں سے متعدد انجمنوں کا صدر یا نائب صدر مقرر ہو گیا۔ گویا میں سرگودھا کی شہری زندگی کی شریانوں میں اولمپک کی تیاری کرنے والے اتھلیٹ کی طرح نان سٹاپ دوڑنے لگا۔

مگر جلد ہی مجھے ایک اور مدار عطا کر دیا گیا۔ صدر ایوب نے مارشل لا کی حکومت میں عام شہریوں کو شمولیت کا موقع دینے کے لئے بنیادی جمہوریتوں کا نظام قائم کیا تھا جس میں نچلی سطحوں پر الیکشن اور بالائی سطحوں پر نامزدگی ہونی قرار پائی تھی۔ اس وقت وَن یونٹ قائم تھا۔ لہٰذا پورے مغربی پاکستان کے لئے بیس بائیس ممبروں پر مشتمل ایک مشاورتی کمیٹی کا اعلان ہوا جس کے اجلاس بعد ازاں لاہور کے اسمبلی ہال میں گورنر مغربی پاکستان کے زیرِ صدارت منعقد ہوئے۔ میرا معمول تھا کہ ہر دوسرے روز علی الصبح گاؤں جاتا اور شام کو لوٹ آتا۔ ایک شام میں لوٹا تو بیوی نے ٹیلی گراموں کا ایک ڈھیر لا کر میرے سامنے پٹخ دیا۔ کہنے لگی کہ ان سے دُگنے ٹیلی فون بھی آ چکے ہیں۔ میں نے حیران

ہو کر پوچھا کہ قصّہ کیا ہے ؟ بولی: قصّہ یہ ہے کہ آپ کو صوبائی مشاورتی کونسل کا ممبر نامزد کیا گیا ہے جس پر لاتعداد لوگ خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ میں نے اسی وقت اخبار منگایا۔ بات درست تھی۔ میں نے ٹیلی گرام پڑھے ۔ بیشتر ایسے لوگوں کے تھے جنھیں میں جانتا تک نہ تھا۔ پھر ٹیلی فون آنے شروع ہوئے۔ مگر میں اندر سے بجھ سا گیا تھا۔ مجھے اس نامزدگی سے ذرّہ برابر خوشی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ محسوس ہوا تھا جیسے ہزاروں من بوجھ مجھ پر آ گرا ہے۔ میں نے سوچا یہ ایک سیاسی معاملہ ہے اور میں عمر بھر سیاست سے کوسوں دور رہا ہوں۔ مجھے کوئلوں کے اس کاروبار میں حصّہ نہیں لینا چاہئے۔ ابھی میں اس نئے طوفان میں ہچکولے کھا ہی رہا تھا کہ مولانا صلاح الدین احمد کا ٹیلیفون آ گیا۔ وہ بہت خوش تھے اور مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔ میں نے دل میں تو کہا: ET TU BRUTE مگر احتراماً زبان پر یہ الفاظ نہ لا سکا البتہ مولانا سے بحث کرنے لگا کہ میں اصولاً اور مزاجاً اس بیں شرکت کے خلاف ہوں۔ مولانا نے کہا کہ اس میں قطعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ کوئی سیاسی ادارہ نہیں۔ محض ایک مشاورتی کونسل ہے آپ اس کے اجلاس میں شریک ہو کر ادب، تعلیم اور زراعت کے سلسلے میں کچھ اہم مشورے تو دے سکتے ہیں۔ مولانا کا "ردِ عمل" جان کر مجھے جیسے قرار سا آ گیا اور میں نے اس "نامزدگی" کو قبول کرنے کا ارادہ کر لیا۔

بعد ازاں لاہور جا کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ محض ایک "مشاورتی کونسل" نہ تھی بلکہ ایک سیڑھی تھی جس پر قدم رکھ کر اس کے ممبران کو سیاسی مراعات اور مناصب حاصل کرنے تھے۔ چنانچہ جب دو تین سال کے بعد یہ کونسل ختم ہوئی اور وزارتیں قائم ہوئیں تو میرے بہت سے ساتھی تو وزرا نامزد ہو گئے مگر میں بخیر و عافیت اپنے گھر لوٹ آیا۔

(۲)

گورنر کی صوبائی مشاورتی کونسل کا ممبر نامزد ہونے کے باعث میں ایک بڑے مدار میں گھومنے لگا تھا۔ مگر میرے لئے سیاست کی یہ دنیا قطعاً نامانوس اور اجنبی تھی۔ کئی بار میں نے سوچا کہ "اسمبلی ہال میں اجنبی" کے موضوع پر کوئی نظم یا انشائیہ تحریر کروں مگر چونکہ فرمائشی پروگرام کا عادی نہیں تھا (چاہے فرمائش اپنی ہی کیوں نہ ہو) اس لئے میں اپنے اس ارادے کو تو عملی جامہ نہ پہنا سکا البتہ میں نے

اجنبیت کے احساس کو زائل کرنے کے لئے مشاورتی کونسل کی کارروائیوں میں بھرپور حصہ لینے کا ارادہ کرلیا۔ میں نے اس سلسلے میں دو تین تقریریں بھی کر ڈالیں جو خاص طور پر اس لئے پسند کی گئیں کہ ان میں بقول ممبران "زبان کے جوہر" دکھائے گئے تھے۔ پھر ایک روز میں نے اسمبلی میں یہ تجویز پیش کی کہ دیہاتی مدرسوں میں زرعی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ چونکہ میں اس مسئلہ پر ایک عرصہ سے غور و خوض کر رہا تھا۔ نیز چونکہ اس کے بارے میں ایک حد تک میں جذباتی بھی تھا لہٰذا میں نے اپنی تجویز کے حق میں ایک بھرپور تقریر کر ڈالی۔ مجھے اس بات کا سان گمان بھی نہ تھا کہ اس تقریر کا نتیجہ ممبران کے چند تعریفی کلمات کے علاوہ بھی کچھ نکلے گا۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میری تقریر کے خاتمے کے فوراً بعد صدر مشاورتی کونسل (مغربی پاکستان کے گورنر) نے میری تجویز کو قبول کرتے ہوئے اعلان کیا کہ بہت جلد اسے قانونی صُورت دے دی جائے گی۔ (جہاں تک مجھے علم ہے آج تک بوجوہ اس فیصلے پر عمل درآمد نہیں ہو سکا) مگر اس وقت سب کو یقین تھا کہ یہ تجویز قانون بن جائے گی۔ چنانچہ پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ دوسرے روز پاکستان ٹائمز کے پہلے صفحے کی لیڈنگ سُرخی بھی یہی تھی۔ مشاورتی کونسل کا اجلاس ختم ہوا تو ممبر حضرات نے فرداً فرداً مجھے مبارکباد دی۔ میری حالت اُس سکھ ایسی تھی جسے دریا سے ڈوبتے ہوئے شخص کو بچانے پر ہیرو کا درجہ دے دیا گیا تھا مگر خود سردار جی اس شخص کی تلاش میں تھے جس نے انہیں دریا میں دھکا دیا تھا۔ میرے معاملے میں دھکا دینے والا میں خود تھا۔ میرا مقصود تو محض لُطف لینے کے لئے گل افشانیٔ گفتار کا مظاہرہ کرنا تھا۔ یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ میری تجویز منظور بھی ہو گی۔ (مشاورتی کونسل میں غیر سرکاری ممبروں کی تجاویز شاذ و نادر ہی منظور ہوتی تھیں) شام کو گورنر ہاؤس کے لان میں ممبران کے اعزاز میں چائے تھی۔ شہر کے معززین کو بھی دعوت نامے جاری کئے گئے تھے۔ تقریباً تین سو خواتین و حضرات جمع ہو گئے تھے۔ گورنر صاحب گورنر ہاؤس سے نکل کر آئے اور ایک سرے سے لوگوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے گھومتے چلے گئے۔ جب میرے قریب پہنچے تو مجھے دیکھ کر مسکرائے اور پھر آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کرنے کے بجائے معانقہ کیا اور بآوازِ بلند میری تقریر کی تعریف کر دی۔ بس پھر کیا تھا سیکرٹریوں اور ڈپٹی سیکرٹریوں اور ممبروں اور مہمانوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا اور مجھے ترجیحی سلوک کا سزاوار قرار دے ڈالا۔ چند ہی ہفتوں کے اندر اندر مجھے صوبے

کی بہت ہی اہم کمیٹیوں کا ممبر بنا دیا گیا۔ اور میری "عزت" میں روزبروز اضافہ ہونے لگا۔ اس وقت مجھے بہت سے دوستوں نے مشورہ دیا کہ میں اگر گورنر صاحب کے مزید قریب ہو جاؤں تو میرا سیاسی مستقبل محفوظ ہو جائے گا۔ مگر دوسری طرف میرا سانس رُکنے لگا تھا۔ تصنع اور دُنیا داری کی فضا اور جوڑ توڑ اور سیاسی مراعات حاصل کرنے کی دَوڑ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ میں جلد از جلد اس ساری فضا سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب صوبائی مشاورتی کونسل کا عرصۂ حیات ختم ہوا تو میں چپکے سے واپس سرگودھا آگیا اور پھر کبھی اس سڑک پر نہ گیا جو سیاست کے رُومتہ الکبریٰ کی طرف جاتی ہے۔

۳

سیاسی اور سماجی وضع کے ان دائروں کے علاوہ میں گاؤں سے سرگودھا آتے ہی ایک اور دائرے میں بھی گھومنے لگا تھا جو میرے لئے سوہانِ رُوح سے کم نہیں تھا۔ فرد کے لئے اس کے اعزہ ایک بہت بڑا سہارا بھی ہوتے ہیں اور بلائے بے درماں بھی۔ عام حالات میں تو ان کا رویہ نارمل اور سلوک قابلِ تعریف ہوتا ہے مگر جیسے ہی آپ کو کوئی اعزاز مل جائے۔ سماجی یا معاشی حالت ان سے بہتر ہو جائے تو ان کی ذات میں چھپے ہوئے "عزیزانِ مصر" طعنوں اور برچھیوں سے لیس ہو کر باہر نکل آتے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ آپ کے نئے نویلے پروں کو کُتر کر آپ کو اپنے جیسا کر لیں۔ اساطیر میں کالی دیوی نیز سمندری بلا" تیامت" کا بار بار ذکر آیا ہے جو سدا توڑ پھوڑ کی طرف مائل رہتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہر قریبی عزیز کے بطون میں یہ تیامت موجود ہوتی ہے اور جیسے ہی موقع ملتا ہے، اندر سے باہر آکر قیامت برپا کر دیتی ہے (تیامت اور قیامت کی صوتی مماثلت قابلِ غور ہے) آپ چاہیں تو اسے حسد کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ میرے معاملے میں یہ ہوا کہ میرے ایک نہایت قریبی عزیز کو میرا "اندازِ قد" پسند نہ آیا۔ کچھ ان کے اپنے مقاصد بھی تھے۔ سو انھوں نے میرے چھوٹے بھائی کو آلۂ کار بنایا اور ایک ایسی خطرناک صورتِ حال پیدا کر دی کہ میرے لئے راتوں کی نیند حرام ہو گئی پورے چار برس تک میں اس صورتِ حال سے نبرد آزما رہا۔ مقدمات کا ایک کبھی نہ ختم نہ ہونے والا سلسلہ تھا۔ اکثر و بیشتر عدالتوں کے طواف میں پورا پورا دن گزر جاتا۔ میری یہ کوشش تھی کہ چھوٹے بھائی کو اپنے ان عزیزوں کی گرفت سے نجات دلاؤں اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایسا ہو۔ مجھے اپنے چھوٹے بھائی

سے بڑا پیار تھا مگر جب میں دیکھتا کہ اس کی BRAIN - WASHING ہو رہی ہے اور وہ روز بروز ذہنی اور احساسی سطح پر مجھ سے دُور ہوتا جا رہا ہے تو میں اس کے مستقبل کا تصور کر کے کانپ اُٹھتا۔ انھیں دنوں میں نے متعدد ایسی نظمیں لکھیں جن میں اپنے ان خدشات کا اظہار کیا تھا۔ مثلاً ایک نظم تھی "بے وفا"!

دل اک سوکھا پتّا جس نے شاخ سے ناتا توڑا
اپنوں سے منہ موڑ کے جس نے تجھ سے رشتہ جوڑا
سوکھا پتّا شاخ سے ٹوٹا اب تو اسے اڑائے گی
جہاں بھی تیرا جی چاہا تو ساتھ اسے لے جائے گی
روِش روِش پر گلی گلی میں کیا کیا ناچ نچائے گی
دیواروں سے دے مارے گی پاؤں سے ٹھکرائے گی
پنکھ اس کے جب جھڑ جائیں گے تو آگے بڑھ جائے گی

دل اک سوکھا پتّا جس نے شاخ سے ناتا توڑا
چھوڑا اپنوں کو اس پاگل نے کس سے رشتہ جوڑا

اس نظم میں جو پیش گوئی کی گئی تھی، آگے چل کر حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو ان عزیزوں کے چنگل سے تو آزاد کرا لیا، مگر پھر وہ باقی زندگی بار بار ہر کسی کے "چنگل" میں بآسانی آتا ہی رہا۔ اس کے ذہن کے اندر کئی طرح کے خوف پیدا ہو گئے تھے۔ قوّتِ فیصلہ قریباً ختم ہو گئی تھی۔ اور جب کبھی فعّال ہوتی تو وہ ہمیشہ غلط فیصلے کرتا۔ ۱۹۷۷ء کے مارشل لا کے دوران اس نے اسی طرح کا ایک بالکل غلط فیصلہ کیا۔ نتیجتہً مارشل لا کے تحت حکومت کا مہمان ہوا۔ اس تجربے نے اسے جذباتی اور ذہنی طور پر ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ گھر آنے کے بعد وہ زیادہ عرصہ اپنے "کمرے" میں بند رہا۔ بالآخر پچھلے سال اس جہانِ فانی سے رُخصت ہو گیا۔ میں یہ تمام عرصہ اس کی حالتِ زار دیکھ کر کُڑھتا رہا، مگر وہ ایک سوکھے پتّے کی طرح ہمہ وقت ہوا کے ساتھ رواں تھا۔ میری ہزار کوششوں کے

باوجود رُک نہ سکا۔

عزیزوں کی طوطا چشمی اور پھران کی "کارکردگی" نے مجھے بڑا دُکھ پہنچایا۔ دُکھ کا کارن یہ تھا کہ مجھے پیار اور مروّت کے رشتے "کچے" دھاگوں کی طرح نظر آنے لگے تھے۔ میں سوچتا کہ اتنے مضبوط رشتے اگر پل بھر میں ٹوٹ سکتے ہیں تو پھر پیار کے نئے رشتے استوار کرنے کا فائدہ؟ اور اگر پیار کا رشتہ دائمی نہیں ہے تو پھر اس کائنات میں کون سی شے دائمی ہے؟ انھیں دنوں میں نے نظم "پیار" لکھی جس سے مجھے آج بھی بڑا پیار رہا ہے:

پیار کے کچّے دھاگے میں اب کون پروئے دل
آیا جھونکا، ٹوٹا دھاگا، بکھر گئی محفل!
بچھڑ گئے سب سنگی ساتھی، ڈوب گئی منزل

کون کسی کا دامن تھامے کون کسی کا میت
شبنم ایسے کچّے رشتے، بادل ایسی پریت
پل بھر برسیں نین رسیلے، پل بھر کا سنگیت

شام چِتا میں سورج کی، کیوں اپنا انگ جلائے
رات بےچاری کس کی خاطر تارے گنتی جائے
پیار کے رشتے کچّے دھاگے، پیار سے ہم بھرپائے

دُکھ کی ڈور سے بندھا ہوا ہے یہ سارا سنسار
روتی شبنم، روتا بادل، نینوں کی پھوار
دُکھ جیون کا سنگی ساتھی دُکھ سے ہم کو پیار!

آج مَیں نے دوبارہ اس نظم کو پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ نظم لفظ "پیار" سے شروع ہوئی اور اس کا آخری لفظ بھی "پیار" ہے۔ گویا پیار ہی ازل اور پیار ہی ابد ہے۔ ہوتا بس یہ ہے کہ انسان ایک

سطح سے (جس سے اسے بے پناہ لگاؤ تھا) اُکھڑ کر ایک دوسری سطح سے جُڑ جاتا ہے اور پھر اس نئی سطح سے پیار کرنے لگتا ہے۔ میرے معاملے میں یہ ہوا کہ میں خاندان اور برادری کے رشتوں سے اوپر اُٹھ کر اُس دُکھ سے پیار کرنے لگا جو روتی ہوئی شبنم سے لے کر روتے ہوئے بادل اور نیر بہاتی آنکھوں تک پوری کائنات میں بکھرا پڑا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی تبدیلی تھی جس نے مجھے رشتوں کی نچلی سطح سے اُٹھا کر ایک اُونچی سطح پر لا بٹھایا اور میرے سامنے محسوسات کے نئے نئے آفاق طلوع ہونے لگے۔

(۴)

میں گاؤں سے سرگودھا پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ دریا کی ہموار سطح یکایک RAPIDS کی زد پر آگئی ہے اور میں لکڑی کے ایک تختے پر بیٹھا گرتی اٹھتی اور آگے بڑھ کر چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی لہروں کے رحم و کرم پر ہوں۔ گاؤں کی آہستہ خرام زندگی کے مقابلے میں مجھے شہر کی پُرآشوب ٹوٹتے بنتے اور دوبارہ ٹوٹتے ہوئے رشتوں کی منڈی عجیب سی لگی۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ یہ "آزادی" نہیں بلکہ قید بامشقت ہے۔ ممکن ہے عام حالات میں میرے احساسات کا یہ عالم نہ ہوتا۔ مگر میں جب سرگودھا پہنچا تو مارشل لا لگ چکا تھا، شہری آزادیاں ختم ہو چکی تھیں ——— بنیادی انسانی حقوق واپس لے لئے گئے تھے۔ زبانوں پر پہرے تھے۔ چونکہ زبان دماغ کی فاضل سٹیم کو خارج کرنے کا بہترین ذریعہ ہے اس لئے جب زبان بند ہوئی تو سٹیم دماغوں کے اندر جمع ہو کر انسانی تعلقات اور رشتوں پر اثر انداز ہونے لگی۔ آرتھر کوئسلر ARTHUR KOESTLER نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انسان کے بطون میں ایک طرح کا پاگل پن (جسے اس نے PARANOID STREAK کہا ہے) سدا سے موجود ہے۔ مجھے اُس کی اِس بات سے اتفاق ہے مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب کوئی بحرانی صورتِ حال نازل ہو جس کے نتیجے میں فاضل اسٹیم کے اخراج کے امکانات باقی نہ رہیں تو پاگل پن فعال ہوتا ہے ورنہ نہیں! فاضل سٹیم کا اخراج فنونِ لطیفہ کے ذریعے ہو تو یہ مثبت عمل ہے۔ جذباتی فشار کے ذریعے ہو تو منفی ہے۔ قتل و غارت گری، تخریبی اقدامات، جنگ اور اسی طرح کے دوسرے مظاہر اس فاضل اسٹیم کے منفی اخراج ہی کی صورتیں ہیں۔

سو جب میں سرگودھا پہنچا تو دماغوں میں دُھواں بھرنا شروع ہو گیا تھا اور شہری زندگی میں منافقت، جھوٹ، تصنع اور اسی طرح کی باتیں پہلے کی نسبت زیادہ نظر آنے لگی تھیں۔ چونکہ میں گاؤں کی پُرسکون اور صاف ستھری سادہ زندگی کو ترک کر کے شہر آیا تھا اس لئے ان دو دنیاؤں کے فرق نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ میرے اندر ایک مدت سے شے کو اس کے پس منظر میں دیکھنے کا میلان مضبوط ہو رہا تھا۔ اور میں ہر شے کو اس کے سائے سے پہچاننے کی طرف مائل تھا، جس کے نتیجے میں ثنویت ایک فلسفیانہ رویّے کے طور پر مجھے متاثر کر رہی تھی۔ سو جب میں شہر پہنچا اور اسے پہچاننے کے لئے میں نے اسے گاؤں کے تناظر میں رکھ کر دیکھا تو شہر مجھے ایک مُردہ خور کی طرح نظر آنے لگا۔ بعض اوقات یوں لگتا جیسے وہ ایک چیل کی طرح مجھ پر جھپٹنے کی تیاری میں ہے۔ کبھی محسوس ہوتا جیسے وہ خود تو اُجڑ چکا ہے مگر اس کے ملبے پر ایک سیہ رُو قلندر نیرو کی طرح آ بیٹھا ہے اور اب لوہے کا لمبا سا ایک چمٹا بجا رہا ہے، کبھی مجھے اپنا آپ ایک ایسے سرپھرے کی طرح دکھائی دیتا جو بیتے لمحے کی تلاش میں شکستہ مکانوں ٹوٹی پھوٹی ہوئی خندقوں اور گرد آلود راستوں میں سرگرداں ہوا اور جب اسے چاند کی قندیل دکھائی دے تو اس کی آنکھیں چندھیا جائیں اور وہ بگڑ کر بڑے زور اور کرب سے چیخ اُٹھے جیسے کہہ رہا ہو: "لے جاؤ اس روشنی کو!" اس زمانے کی میری بہت سی نظموں میں ان مجملہ احساسات کے سائے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً

آسماں پر دائرے کے رُوپ میں
چیختے روتے ہوئے بھوکے پرند
دم بدم غوطہ لگاتے میری اور
دم بدم مجھ پر جھپٹتے مُردہ خور

——— اجنبی

عجب ——— ماجرا ہے
اندھیرے کی ننگی نگاہیں مجھے گھورتی ہیں
بجھی بانجھ دھرتی کی چھاتی سے چمٹا ہوا ہوں

——— عفریت

دیکھو بستی جاگ اُٹھی ہے
شیشم کی چوٹی پر بیٹھی
چیل — مُڑی ہوئی چونچ سے اپنی
اُلجھے پنکھ سنوار رہی ہے

تم بھی جاگو
تم کن میٹھے سُندر سپنوں میں غلطاں ہو
آنسو کی باریک ردا سے جھانک کے دیکھو
بستی پنکھ سنوار رہی ہے

—— چیل

(۵)

اُوپر مَیں نے لکھا ہے کہ سرگودھا پہنچتے ہی میں بیک وقت کئی دائروں میں گردش کرنے لگا تھا۔ ان میں سے ایک دائرہ ادب کی دنیا سے بھی متعلق تھا۔ جب مَیں گاؤں میں رہتا تھا تو تین چار ماہ میں دو تین روز کے لئے لاہور جاتا۔ حلقہ اربابِ ذوق کے ہفتہ وار اجلاس میں شریک ہوتا۔ بعض اوقات مضمون، انشائیہ یا نظم تنقید کے لئے پیش کرتا۔ چونکہ لاہور میں میرا کوئی حلقۂ احباب نہیں تھا اور مَیں لاہور کے ادبا کے لئے محض مضافات کا اُبھرتا ہوا ایک ادیب تھا، اس لئے وہ میری تخلیقات پر بطورِ خاص سخت تنقید کرتے۔ بعض جو کسی نہ کسی اخبار سے منسلک ہوتے، اپنے اخبار میں میرے خلاف چُبھتے ہوئے فقرے بھی لکھتے۔ میں کوئی صوفی یا درویش نہیں تھا کہ اس تنقید سے بے نیاز رہتا۔ لٰہذا دو ایک روز کُڑھنے کے بعد واپس سرگودھا آجاتا۔ البتہ مولانا صلاح الدین احمد میری بہت حوصلہ افزائی کرتے۔ حلقہ اربابِ ذوق میری جس تخلیق کو رَد کرتا مولانا اسے "ادبی دنیا" میں بڑے اہتمام سے شائع کرتے اور بطورِ خاص اس کی تعریف کرتے۔ میں ایک عجیب گومگو کے عالم میں تھا۔ دونوں میں سے کون سچّا تھا۔ آہستہ آہستہ صورتِ حال مجھ پر

واضح ہونا شروع ہوئی اور مجھے محسوس ہوا کہ مولانا کا رویّہ مثبت تھا اور حلقے کا رویّہ منفی —— اتنا منفی کہ اس کے نفسیاتی تجزیے کی بھی ضرورت تھی۔ بعد ازاں میں نے ایک مضمون "مجلسی تنقید کا نفسیاتی تجزیہ" کے نام سے غالباً "ادبِ لطیف" میں لکھا۔ حلقے کے بعض اراکین نے اسے سخت ناپسند کیا۔ کیونکہ اس آئینے میں انہیں اپنے چہرے صاف دکھائی دئے تھے۔ مگر پھر میں اس مضمون کو بھول گیا اور یہ میرے کسی مجموعے میں شامل نہ ہو سکا۔ تقریباً پندرہ برس بعد جب سلیم اختر صاحب اپنا ڈاکٹریٹ کا تھیسس لکھ رہے تھے تو انھوں نے اس مضمون کو دریافت کیا اور پھر اس کی نہ صرف بے حد تعریف کی بلکہ یہ فرمائش بھی کی کہ میں اسے اپنے نئے مجموعۂ مقالات میں شامل کروں۔ چنانچہ جلد ہی میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل کردی مگر ذکر حلقۂ اربابِ ذوق کے تنقیدی رویّے کا تھا۔ میں ۱۹۴۵ء سے حلقہ کے جلسوں میں شریک ہو رہا تھا۔ مگر ایک خاموش تماشائی کی حیثیت میں۔ پھر ۱۹۵۲ء کے بعد میں نے حلقے میں اپنی تخلیقات پیش کرنا شروع کیں اور کبھی کبھی تنقید میں بھی حصّہ لیتا رہا۔ ۱۹۶۰ء تک پہنچتے پہنچتے میں حلقہ کی تنقید سے دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ کیونکہ ان پندرہ سالوں میں حلقے کے تنقیدی رویّے میں مزید زوال آ گیا تھا۔ قیوم نظر صاحب جو حلقے کے روحِ رواں تھے، بیک وقت دو شخصیتوں کا مظاہرہ کرتے۔ علیحدگی میں ملتے تو حد درجہ ملائم اور شائستہ نظر آتے۔ بہت اچھے مشورے دیتے بالخصوص اُردو نظم کے سلسلے میں انھوں نے میری بہت عمدہ رہنمائی کی۔ مگر حلقۂ اربابِ ذوق کے اجلاس میں شریک ہوتے ہی ان کا رویّہ بدل جاتا۔ لہجے میں اکھڑپن آ جاتا اور آنکھوں سے مروّت رخصت ہو جاتی۔ میرا خیال ہے کہ وہ حلقے میں زیادہ تر اداکاری کرتے تھے۔ مگر اس سب کا نتیجہ حلقے کے باب میں بہت مُضر نکلا۔ کیونکہ انھوں نے حلقے کی سیاست کو جس طرح متاثر کیا اور تنقید میں جو متشدّد رویّہ اختیار کیا وہ بعد ازاں حلقے کی سرشت میں شامل ہو گیا اور اس کے زوال کا باعث ثابت ہوا۔ مگر خیر یہ تو ایک جُملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر میں اپنی تخلیقات کے سلسلے میں محض حلقے کے ردِّ عمل پر انحصار کرتا تو یقیناً ادب کے دیار سے بہ عجلت رخصت ہو جاتا مگر اس زمانے میں ادب کے ایک پلڑے میں اگر حلقہ اربابِ ذوق تھا تو دوسرے پلڑے میں مولانا صلاح الدین احمد تھے اور میری نظروں میں مولانا کا پلڑا بھاری تھا۔ سو میں نہ صرف ادب سے منسلک رہا بلکہ اپنے لئے ادب کے دائرے کو بتدریج وسیع کرنے

میں بھی کوشاں رہا۔ ۱۹۶۰ تک پہنچتے پہنچتے میں مولانا کے بہت قریب آچکا تھا۔ انھوں نے "مسرت کی تلاش" تو ۱۹۵۴ میں شائع کر دی تھی۔ پھر ۱۹۵۸ میں انھوں نے میرا ڈاکٹریٹ کا تھیسس "اُردو ادب میں طنز و مزاح" کے نام سے شائع کر دیا اور یہ شائع ہوتے ہی بیسٹ سیلر BEST SELLER قرار پایا ـــــ بیسٹ سیلر اس اعتبار سے کہ ایک ہی سال کے اندر اندر اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔ کتاب کے جلد فروخت ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس موضوع پہ کوئی اور کتاب موجود نہیں تھی۔ اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو طنز و مزاح کے بارے میں مواد جمع کرنے اور آرام ترتّب کرنے میں بڑی دقّت کا سامنا تھا۔ چنانچہ یہ کتاب اس وقت بھی اور بعد ازاں بھی ملک کی تمام یونیورسٹیوں کے اُردو اساتذہ نے خوب "استعمال" کی۔ اس کے نوٹس NOTES بنائے اور طلبا تک اس کے مندرجات پہنچائے تاہم جہاں تک مجھے علم ہے پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی نے اس کتاب کو "سفارش کردہ کتب" کی فہرست میں شامل کرنا ضروری نہ سمجھا۔ بعد ازاں پاکستان میں اس کے مزید تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ دو ایڈیشن بھارت میں شائع ہوئے مگر دونوں PIRATE EDITIONS تھے۔ اس کتاب کی اشاعت کے چند ہی ماہ بعد "نقوش" کا طنز و مزاح نمبر شائع ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ اس نمبر کی ترتیب و تدوین میں "اُردو ادب میں طنز و مزاح" سے خوب مدد لی گئی تھی۔ ساتھ ہی ایک ایسا مضمون بھی اس نمبر میں شامل کیا گیا تھا جس میں اس کتاب کو ہدفِ طنز بنایا گیا تھا تا کہ "توازن" کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے ـــــ مگر ذکر مولانا کا تھا جو عمر میں مجھ سے بیس برس بڑے تھے۔ ان کے لئے میرے دل میں وہی احترام تھا جو والد کے لئے تھا۔ دوسری طرف مولانا نے اپنی تمام تر بزرگی کے باوصف مجھ سے دوستی کا رشتہ استوار کیا تھا جو روز بروز مستحکم ہو رہا تھا۔ ۱۹۶۰ء تک پہنچتے پہنچتے یہ رشتہ اتنا مضبوط ہو چکا تھا اور وہ مجھ پر اس قدر اعتماد کرنے لگے تھے کہ جب "ادبی دنیا" کا آخری اور سب سے ہنگامہ خیز دَور شروع ہوا تو انھوں نے مجھے شریک مدیر بنا لیا۔ میرے لئے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا اور نروس بھی بہت تھا۔ کیونکہ "ادبی دنیا" ایک بہت بڑا اور مشہور جریدہ تھا اور میں ادارت کے معاملے میں ناتجربہ کار اور ادب کے میدان میں نوآموز تھا۔ اس لئے اتنی بڑی ذمہ داری

میں شریک ہونے سے خوف زدہ تھا مگر میں مولانا کی بات کو ٹال نہ سکتا تھا۔ انھوں نے طویل سوچ بچار کے بعد قطعاً غیر جذباتی انداز میں فیصلہ کیا تھا۔ اور مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ ان کے فیصلہ کے راستے میں دیوار بن جاتا۔ سو میں "ادبی دنیا" سے بطور شریک مدیر منسلک ہوا۔ اور چند ہی ماہ کے اندر اندر مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک بالکل نئے دائرے میں گردش کرنے لگا ہوں۔

(۶)

"ادبی دنیا" فکشن کے معاملے میں جدیدیت پسند مگر شاعری کے معاملے میں ایک حد تک پرانے انداز کا رسیا تھا۔ بے شک میراجی کے زمانے میں "ادبی دنیا" نے جدید نظم کے فروغ میں ایک اہم حصّہ لیا تھا۔ مگر میراجی کے چلے جانے کے بعد وہ بتدریج اپنی پرانی روش پر آتا چلا گیا۔ اور اب ایک طویل عرصے سے اس میں اثر صہبائی، عباس بیگ محشر، خلیفہ عبدالحکیم، حامد علی خاں، امین حزیں، طفیل ہوشیارپوری اور دوسرے اصحاب کی شاعری نسبتاً زیادہ نمایاں تھی۔ جب میں ادبی دنیا سے منسلک ہوا اور مولانا نے شاعری کا حصّہ میری تحویل میں دے دیا تو مجھے ادبی دنیا کے رویّے میں تبدیلی لانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور میں یہ تبدیلی تین سطحوں پر لایا۔ ایک تو میں نے ادبی دنیا کے بزرگ شعرا سے قطع تعلق کیے بغیر نئے شعرا سے رابطہ استوار کیا اور بہت سے نئے ناموں کو (جو آج اُردو شاعری میں معتبر نام ہیں) ادبی دنیا کے صفحات میں متعارف کرایا۔ دوسرے میں نے جدید نظم کے بارے میں بطورِ خاص خود بھی مقالات لکھے اور دوسروں سے بھی لکھوائے اور "بزمِ ادب" میں شاعری کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا آغاز کر دیا۔ تیسرے میں نے عملی تنقید کا ایک ایسا نیا سلسلہ شروع کیا جس کی کم از کم اُردو ادب کی تاریخ میں اس سے قبل کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت مقبول ہوا اور بہت سے دیگر رسائل نے بھی نظم کے اس تجزیاتی مطالعہ کی تقلید شروع کر دی۔ طریقۂ واردات یہ تھا کہ میں کسی جدید نظم گو شاعر کی نظم، شاعر کا نام ظاہر کیے بغیر نصف درجن حضرات کو ارسال کر دیتا اور ان سے نظم کے بارے میں تاثرات

وصول کر کے مرتب صورت میں شائع کر دیتا۔ در اصل یہ سب کچھ حلقۂ اربابِ ذوق کی تنقید کے متوازی ایک اقدام تھا۔ میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ حلقہ اربابِ ذوق کی تنقید تخلیق کار کی شخصیت کی نسبت سے منفی یا مثبت رویہّ اختیار کرتی ہے۔ لیکن اگر تخلیق کے خالق کا نام معلوم نہ ہو تو پھر تنقید کا مزاج اور رویہّ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ نظم کے تجزیاتی مطالعے کے اس تجربے میں بہت سی دلچسپ صورتیں سامنے آئیں۔ ایک صاحب نے اپنے ایک "دشمن" کی نظم کی بے محابا تعریف کر دی۔ ایک اور صاحب نے اپنے ایک گہرے دوست کی نظم پر سخت تنقید کر دی۔ جب بعد ازاں انھیں نظم کے خالق کا اصل نام معلوم ہوا تو بہت جھنجھلائے کہ "مروا دیا"! — مگر اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ ادیب کی شخصیت کو منہا کر کے اس کی تخلیقات کا جائزہ لینے کی طرف راغب ہونے لگے — اگر یہ سلسلہ کچھ عرصہ اور جاری رہتا تو ممکن ہے اس کے دیرپا نتائج بھی برآمد ہوتے مگر ۱۹۶۴ء میں ادبی دنیا سے میرا رشتہ منقطع ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی عملی تنقید کا یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا!

۷

مولانا نے صرف شاعری کا حصّہ میرے سپرد کیا تھا لیکن اس مثل کے بمصداق کہ کھڑا ہونے کا موقع دو تو میں لیٹنے کی گنجائش از خود پیدا کر لوں گا، میں نے بھی آہستہ آہستہ اپنے دائرہ کار کو بڑھانا شروع کیا۔ اگر شاعری میری تحویل میں تھی تو ظاہر ہے کہ شاعری پر مضامین نظموں کا تجزیاتی مطالعہ اور نئی نظم کے ثقافتی، نفسیاتی اور فکری تناظر کی نشان دہی بھی میرے دائرہ اختیار میں تھی۔ لہٰذا میں نے "ادبی دنیا" میں وقت، حُسن۔ انشائیہ، علامت، موجودیت کلچر اور اسی وضع کے دوسرے موضوعات پر مباحث کا ایک سلسلہ بھی شروع کر دیا تاکہ اس فکری موسم کو محسوس کیا جا سکے جو نئی شاعری کا خالق تھا۔ اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ جدیدیت کی ایک تحریک کا آغاز ہو گیا۔ آغاز تو نہیں کہنا چاہئے کیونکہ ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ اُردو ادب میں کلبلاہٹ کے آثار صاف نظر آنے لگے تھے۔ بعض لوگ زبان کے بنے بنائے سانچوں سے باہر

آنے کے متمنّی تھے۔ بعض کہانی کے مخفی ابعاد کو گرفت میں لینے کے لئے کوشاں تھے۔ اور بعض چاہتے تھے کہ مغرب میں علوم کا جو دھماکا ہوا تھا اس کی لہریں اُردو ادب کو بھی مَس کریں۔ "اَدبی دُنیا" نے ادبی نبّاض کا رول ادا کرتے ہوئے ان سب دھڑکنوں کو سُنا اور پھر اپنے معاونین اور قارئین کو ان دھڑکنوں کی طرف متوجّہ کیا۔ جس کے نتیجے میں وہ جدیدیّت کا آرگن بن گیا اور اس نے پاکستان اور بھارت کے نئے اذہان کو نہ صرف متحرّک کرنے میں حصّہ لیا بلکہ انھیں ادب کے ذریعے اپنا اظہار کرنے پر بھی اُکسایا۔

دراصل "ادبی دُنیا" نے دو انتہاؤں کے درمیان ایک نازک سے مقام پر اپنے قدم جمالئے تھے اور میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ "اَدبی دُنیا" کو ڈولنے اور کسی ایک سمت میں پُوری طرح جُھک جانے سے باز رکھوں۔ ایک طرف تو قدیم انداز کے لوگ تھے جو ایک خاص ڈکشن میں بات کرنے کے عادی تھے۔ اور جدیدیت کے نئے انداز کو خوف اور نفرت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ دوسری طرف "برہم نوجوانوں" کا ایک گروہ تھا جو توڑ پھوڑ اور مار دھاڑ کو پسند کرتا تھا اور اس بات کا آرزومند تھا کہ ادب میں فکر اور زبان دونوں سطحوں پر ایک انقلابی تبدیلی آئے۔ "اَدبی دُنیا" نے اس صورتِ حال میں توازن قائم کرنے کی جو کوشش کی اس کے باعث یہ دونوں طبقے اس سے ناراض ہو گئے۔ مثلاً یونیورسٹیوں سے منسلک ان اساتذہ نے جو جدیدیت کو محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کے دَور تک محدود کرنے کے عادی تھے، جدیدیت کے نئے انداز کی طرف "ادبی دُنیا" کے جھکاؤ کو ناپسند کیا۔ اسی طرح برہم نوجوانوں کا گروہ جس کے سرخیل افتخار جالب تھے "ادبی دُنیا" کو رجعت پسندوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے کا طعنہ دیتا تھا۔ ان برہم نوجوانوں میں سے بعض کے ساتھ میرے مراسم بھی تھے اور وہ لاہور کے علاوہ سرگودھا بھی مجھ سے ملنے کے لیے آتے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ ایک خاص منصوبے کے تحت "ادبی دنیا" کو اپنے "متشدّد" رویّوں کے فروغ کے لیے آلۂ کار بنانے کے آرزومند تھے۔ میں نے ان میں سے بعض "برہم نوجوانوں" مثلاً احمد ہمیش اور انیس ناگی وغیرہ کی کچھ نسبتاً کم انقلابی نظمیں "ادبی دُنیا" میں شائع کیں۔ مگر افتخار جالب اور ان کے بعض دوستوں کی جناتی زبان میں لکھی گئی نظموں کو میں قبول نہ کر سکا —— دونوں گروہ میرے خلاف صف آرا ہو گئے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ نے تو اپنا آزمودہ نسخہ آزمایا اور "ادبی دنیا" اور اس کے مدیران کو "ناپسندیدہ" لوگوں کی فہرست میں شامل کر کے انھیں "نظر انداز" کرنے کی مہم شروع کر دی۔

جب کہ برہم نوجوانوں نے بالخصوص میرے خلاف ایک تیز مہم کا آغاز کیا۔ مضامین لکھے جانے لگے اور ٹی ہاؤسوں اور کافی ہاؤسوں میں ایک طرح کے WHISPERING COMPAIGN کا آغاز کر دیا گیا جو کسی نہ کسی صورت میں آج تک جاری ہے۔

۸

ادبی دنیا سے میری وابستگی نے میری مَری یاترا میں بھی ایک نئے بُعد کا اضافہ کر دیا۔ میں ۱۹۵۲ء میں پہلی بار اور اس کے بعد بار بار گرمیوں میں دو ایک ماہ کے لیے مَری جاتا رہا تھا۔ ان دنوں وہاں نسیم شمائل پوری اور محمد جلیل "مری لٹریری یونین" کے زیرِ اہتمام ہر ہفتے تنقیدی محفلیں برپا کرتے۔ دونوں حضرات ترقی پسند تھے اور دونوں نے اُن بڑے بڑے ترقی پسندوں سے قریبی تعلقات قائم کر رکھے تھے جو ہر سال غمِ دوراں کو غلط کرنے کے لئے مری تشریف لاتے اور جن کے قیام اور کبھی کبھی طعام کا بندوبست بھی نسیم اور جلیل ہی کرتے تھے۔ اُن دنوں ترقی پسند تحریک ایک متشدد رویّے کی حامل تحریک تھی۔ اس نے نہ صرف اپنے رسائل کے دروازے غیر ترقی پسندوں کے لئے بند کر رکھے تھے بلکہ وہ اپنی تنقیدی مجالس میں بھی غیر ترقی پسندوں کی شرکت کو ناپسند کرتی تھی۔ سو جب میں نے مری میں "مری لٹریری یونین" کے اجلاس میں جانا شروع کیا تو مجھے فوری طور پر سخت ردِّعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ بالخصوص نسیم شمائلپوری کا رویّہ بہت متشدد تھا اور وہ مجھ سے ہر بات میں اختلاف کرنا بلکہ بہ آوازِ بلند اختلاف کرتا۔ اس کے کچھ ساتھی بھی تھے۔ جن میں ایک نوجوان عابد حسن منٹو بہت فعال تھا۔ چنانچہ اکثر میرے اور عابد منٹو کے درمیان تلخ و ترش مکالمے ہوتے جنھیں سننے کے لئے مری کے ادب نواز اور ہنگامہ پسند لوگ ہر اتوار کو کسی نہ کسی جگہ جمع ہو جاتے۔ ۱۹۶۰ء تک پہنچتے پہنچتے نسیم شمائل پوری اور محمد جلیل میرے نہایت گہرے دوست بن چکے تھے۔ وہ دو بار سردیوں میں میرے گاؤں بھی آئے۔ یہ نہیں کہ میں نے ان کے ترقی پسندانہ خیالات کو تبدیل کیا تو ہماری دوستی وجود میں آئی بلکہ یہ کہ ترقی پسندی کے باوجود محبّت اور دوستی کے مقدّس رشتے نے جنم لیا اور مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ نظریاتی اختلاف کو دوستی یا دشمنی کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بعد ازاں دونوں حضرات ترقی پسندی

اور مستند ترقی پسندوں سے اپنے تجربات کی بنا پر برگشتہ بھی ہوئے مگر ظاہر ہے کہ اس برگشتگی کی تعمیر میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ ان میں سے جلیل سے میری دوستی آج تک قائم ہے بلکہ جیسے جیسے اس پر بڑھاپا طاری ہو رہا ہے، بال اڑنے اور دانت گرنے لگے ہیں، وہ شکستہ ہو کر میرے لئے عزیز تر ہو رہا ہے۔ نسیم شمائل پوری ۱۹۶۰ء کے بعد انگلستان چلے گئے تھے، وہیں انھوں نے بود و باش اختیار کر لی۔ لمبے لمبے وقفوں سے پاکستان آتے تا ہم ان سے خط و کتابت ہوتی رہتی اور وہ تھے کہ ہر آنے والے کے ہاتھ میرے اور جلیل کے لئے تحائف بھیجتے۔ ۱۹۷۵ء میں زیر زمین دوز ٹرین کے ایک حادثے میں وہ ہلاک ہو گئے۔ میرے اور جلیل کے لیے یہ ایک بہت بڑا حادثہ تھا جس کے کرب سے ہم آج تک باہر نہیں آسکے —

نسیم کی وفات پر مَیں نے جو غزل کہی اس کا آخری شعر تھا۔ ع:

ہے بات اتنی کہ تجھ بن رہی نہ بات کوئی !!
مگر یہ بات تجھے کس طرح بتاؤں مَیں

⑨

ادبی دنیا کا شریکِ مدیر بن جانے کے فوراً بعد مَیں نے راجہ مہدی علی خاں سے رابطہ قائم کیا۔ دراصل ان سے "رابطہ" تو پچھلے پندرہ برس سے قائم تھا کیونکہ مجھے ان کی مزاحیہ اور طنزیہ نظمیں بہت پسند تھیں اور ان میں سے بیشتر مجھے حفظ ہو گئی تھیں۔ مولانا صلاح الدین احمد بھی راجہ مہدی علی خاں کے مدّاح تھے۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب مَیں نے ادبی دنیا کے مال روڈ والے دفتر میں مولانا کو راجہ مہدی علی خاں کی نظم "ایک چہلم پر" سُنائی اور اب میرے سامنے مولانا کی تصویر اُبھر آئی ہے کہ وہ نظم کے ایک ایک شعر پر اس قدر ہنسے تھے کہ آنسو ان کی آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر بار بار ٹھوڑی تک آجاتے تھے اور وہ اپنے اُس رومال سے جس کے ایک کونے سے چابیوں کا گچھا مستقلاً بندھا رہتا تھا، ان آنسوؤں کو پونچھتے بھی جاتے تھے — میرا نظم سُنانا، مولانا کے قہقہے، آنسوؤں کی رِم جھِم اور چابیوں کی جھنکار — یہ سب باتیں مِل جُل کر ایک ایسی سہانی کیفیت میں تبدیل ہو گئی تھیں کہ مَیں اس کے تصور ہی سے قندِ مکرر

کام لے سکتا ہوں۔ مگر اس کیفیت کو وجود میں لانے والی ہستی (یعنی راجہ مہدی علی خاں) اُس وقت بھی سینکڑوں کوس دُور بمبئی شہر کے کسی گمنام سے گوشے میں منقار زیرِ پر تھی اور اُردو ادب کے ایوان میں اب دوسرے مزاح نگاروں اور طنز نگاروں کا طوطی بول رہا تھا۔ جب میں نے "اُردو ادب میں طنز و مزاح" لکھی تو اس میں راجہ مہدی علی خاں کی صلاحیتوں کا برملا اعتراف کیا۔ مگر راجہ صاحب کو اس "جسارت" کی خبر تک نہ ہوئی۔ میں ادبی دنیا سے منسلک ہوا تو میں نے راجہ صاحب کو ایک طویل خط لکھا نیز اُردو ادب میں طنز و مزاح کا ایک نسخہ بھی ارسال کیا۔ اور یوں انھیں گم نامی کے گوشے سے باہر نکل آنے کی تحریک دی۔ جلد ہی راجہ صاحب کی نظمیں "ادبی دنیا" میں شائع ہونا شروع ہوئیں اور پھر ان نظموں کا اتنا بڑا سیلاب آ گیا کہ "ادبی دُنیا" اس کے لیے کافی نہیں تھا۔ چنانچہ اس سیلاب نے اُردو کے دیگر رسائل کو بھی اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا۔ تاہم راجہ صاحب کی بہترین نظمیں "ادبی دنیا" ہی میں شائع ہوئیں جن میں ان کی نظم "مثنوی قہر البیان" بھی تھی۔ جس کا مرکزی کردار میں خود تھا۔ اور جو "ادبی دُنیا" میں چھپتے ہی زبان زدِ خاص و عام ہو گئی۔ مگر نظموں کے علاوہ راجہ صاحب نے مجھ پر خطوں کی یلغار بھی کر دی تھی۔ بعض اوقات مجھے ایک ہی وقت کی ڈاک سے راجہ صاحب کے تین تین چار چار خط موصول ہو جاتے۔ وہ مجسم محبّت تھے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ان کا دل محبّت کا ایک ڈیم DAM تھا جو کسی نہ کسی وجہ سے پھٹ گیا تھا اور اب پانی کے ریلے مجھے بہائے لیے جا رہے تھے۔ راجہ صاحب کا تقاضا تھا کہ میں انھیں ملنے بمبئی آؤں کیونکہ بقول ان کے وہ اس شخص کو دیکھنا چاہتے تھے جس نے انھیں خوابِ خرگوش سے بیدار کیا تھا۔ میں نے جب بیوی سے راجہ صاحب کی دعوت کا ذکر کیا تو وہ خوشی سے اُچھل پڑی۔ راجہ صاحب کی ذات اور ان کی نظم نگاری سے اسے کوئی خاص غرض نہیں تھی۔ وہ تو بمبئی کی سیر کرنے اور بھارتی فلمیں دیکھنے کی آرزومند تھی۔ میرے دونوں بچّے بھی ماں کی خوشی کی لپیٹ میں آ گئے اور یوں گھر میں دن رات بمبئی بمبئی کی رٹ لگ گئی۔ سو میں نے بمبئی جانے کا ارادہ کر لیا۔

ادبی دُنیا سے منسلک ہونے کے بعد میں نے بلراج کومل سے بھی رابطہ قائم کیا تھا۔ مجھے اُن کی نظمیں بہت پسند تھیں۔ البتہ اُن سے خط و کتابت نہیں تھی۔ سو میں نے نہ صرف ادبی

دنیا" کے لئے ان سے نظمیں طلب کیں بلکہ ان سے مراسلت کا رشتہ بھی قائم کرلیا جو آج تک جاری ہے
میں نے اپنی زندگی میں جو چند نہایت پرخلوص اور محبت کرنے والے دوست بنائے ہیں ان میں بلراج کومل کو
ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ سو بمبئی کا سفر اختیار کرنے کی خواہش میں بلراج کومل سے ملنے کی
کشش بھی شامل تھی۔

دسمبر ۱۹۶۳ء میں ہم چاروں بمبئی کے لئے روانہ ہوگئے۔ مولانا ہمیں رخصت کرنے ریلوے
سٹیشن تک آئے۔ پندرہ روز کے بعد جب ہم لوٹے تو اس وقت بھی مولانا ہمیں لینے سٹیشن پر پہنچے
ہوئے تھے۔ میں پہلے ہی مولانا کی شفقت اور محبت کے بوجھ تلے سمٹا پڑا تھا۔ اب بالکل پس
گیا۔ دراصل ان دنوں مجھے چاروں طرف سے ایک ان دیکھی "محبت" نے اپنے پروں میں سمیٹ رکھا تھا
مجھے یوں لگتا جیسے ہر وہ شخص جو میری زندگی میں داخل ہوتا ہے مجھ سے محبت کے ایک اٹوٹ
رشتے میں منسلک ہو جاتا ہے۔ تاہم اس زمانے میں تین شخصیتیں ایسی تھیں جو مجھ سے ٹوٹ
کر پیار کر رہی تھیں :- مولانا، راجہ مہدی علی خاں اور میری والدہ! ——— اور قدرت کی
ستم ظریفی دیکھئے کہ آیندہ تین ہی سالوں میں یہ تینوں ہستیاں مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے
لئے جدا ہو گئیں۔

میں دوسری بار بمبئی جا رہا تھا۔ مگر بیوی بچوں کا یہ پہلا سفرِ بمبئی تھا۔ اس لئے وہ ہر چیز
کو انتہائی حیرت اور مسرت سے دیکھ رہے تھے۔ تاہم میں خود بھی ان کی حیرت اور مسرت
میں پوری طرح شریک تھا۔ میں جب بیس برس پہلے بمبئی گیا تھا تو اکیلا تھا اس لئے مجھے
اپنا سفر ایک لق و دق صحرا کا سفر محسوس ہوا تھا مگر اب میں اکیلا نہیں تھا اور اپنے اردگرد
کی دنیا کو دو کے بجائے آٹھ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ سو مجھے وہ سب کچھ نظر آ گیا جسے
گرفت میں لینے کے لئے محض دو آنکھیں ناکافی ہوتی ہیں۔ واپس آکر میں نے اس سفر کی
روئیداد لکھی تو اپنے بہت سے محسوسات کو سمیٹ لیا تاکہ وہ محفوظ رہ جائیں۔ اس کا فائدہ
مجھے آج پہنچا ہے کہ ذہن میں تو یہ سارا سفر دھندلا گیا ہے مگر میں اپنے سفر نامہ کے مطالعہ
سے اسے دوبارہ مرتب کر سکتا ہوں۔ مثلاً بمبئی سے ذرا پہلے کا جو منظر ہمیں نظر آیا وہ میرے
سفر نامے میں کچھ یوں بیان ہوا ہے:

"رتلام تک پہنچتے پہنچتے موسم خاصا تبدیل ہو چکا تھا۔۔۔۔۔۔ (سخت سردی کے بجائے) اب ایک میٹھی خواب کی سی کیفیت تھی جس میں نہ گرمی تھی نہ سردی! باہر منظر بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ چھوٹی چھوٹی خوشنما اور سرسبز و شاداب پہاڑیوں، ناریل کے جھنڈوں، آم اور چیکو کے باغوں اور ہولے ہولے بہتی ہوئی ندیوں نے ایک سہانا سماں پیدا کر دیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہمارے ریل کے ڈبے کی دونوں کھڑکیاں دو چوکھٹے ہیں جن میں بحرالکاہل کے جزیروں کی حسین تصاویر آویزاں کر دی گئی ہیں۔"

بمبئی پہنچے تو منظر تبدیل ہو گیا۔ مظاہرِ فطرت کی جگہ ایک مشتعل ہجوم نے لے لی۔ ہم لوگ ایک دُور افتادہ گاؤں سے آ رہے تھے۔ اس لئے انسانی جسموں کے اتنے بڑے سیلاب کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے جو ہمیں بمبئی کے کوچہ و بازار میں نظر آیا:

"ٹیکسی پالی ناکا سے نکل کر چوپاٹی کی طرف بڑھنے لگی، جیسے جیسے ہم آگے کو بڑھے ہجوم میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور سڑکوں پر موٹروں نے ایک سیلِ رواں کی صورت اختیار کر لی۔ بمبئی میں موٹروں کی تعداد سینکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہے اور پھر بھی یہ اس کی آبادی کے لیے ناکافی ہیں۔ بے شک بمبئی شہر کی آبادی پچاس لاکھ سے کسی طور کم نہیں (یہ ۱۹۶۳ء کی بات ہے اب تو یہ آبادی ایک کروڑ سے کم کیا ہو گی) لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ ساری متحرک آبادی ہے ۔۔۔۔۔ تانگوں، رکشاؤں، موٹروں، ٹیکسیوں، بسوں، ٹراموں اور برقی ٹرینوں پر خلقِ خدا ایک کبھی ختم نہ ہونے والے سفر کے چکر میں گرفتار ہے۔ ہر طرف لہریں ہی لہریں ہیں، حرکت ہی حرکت ہے شاید اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سمندر کے جزر و مد کا اثر ہے یا جاتے کم اور مردماں بسیار اس کا باعث ہے یا شاید یہ ایک داخلی ہیجان کا نتیجہ ہے کہ بمبئی میں رفتار کی فراوانی کا شدید احساس ہوتا ہے۔۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی شریر لڑکے نے اپنی چھڑی سے شہد کے چھتّے کو چھیڑ دیا ہو۔"

"دراصل بمبئی ایک حوض کی طرح ہے جس میں لاکھوں کی تعداد میں مچھلیاں بند ہیں۔ شام کے قریب اس حوض کا پانی اس قدر گدلا ہو جاتا ہے کہ مچھلیوں کو سانس لینے کے لئے حوض کی سطح پر آنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ بمبئی کے باشندے سمندر

کنارے، پارکوں، تفریح گاہوں، شراب خانوں، کلبوں مگر زیادہ تر سینما ہاؤسوں کی طرف بھاگنے لگتے ہیں۔ تفریح کا یہ عمل اہلِ بمبئی کے لیے ایک اہم ضرورت کا درجہ رکھتا ہے اور سینما ہاؤس تو بالخصوص جذبات کے اخراج کا کام دیتے ہیں۔ اعصابی تناؤ اور برق رفتاری کی اس فضا میں اگر ایک ہفتے کے لیے فلموں کی نمائش بند کردی جائے تو مجھے یقین ہے کہ اس شہر کی آدھی مخلوق اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔"

میں بمبئی کے اس سفر کے دوران بہت سے ادبا سے بھی ملا۔ بمبئی میں مہندر ناتھ، باقر مہدی اور ظ۔ انصاری کے علاوہ کرشن چندر اور اختر الایمان سے بھی ملاقات ہوئی۔ اختر الایمان کی نظموں اور کرشن چندر کے افسانوں کا میں ایک بہت اچھا قاری تھا۔ سو ان دونوں حضرات سے مل کر مجھے بے پناہ خوشی ہوئی۔ کرشن چندر کی سوچ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ انھیں عدم اور وجود کے بہت سے مسائل سے دلچسپی تھی۔ اور وہ مجھ سے متعدد موضوعات پر تبادلۂ خیالات کرنے کے آرزومند تھے۔ مگر اس ہنگامہ دار و گیر میں ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ بمبئی جاتے ہوئے دہلی ریلوے اسٹیشن پر بلراج کومل اور کمار پاشی سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات آیندہ بیس سالوں میں ہونے والی متعدد ملاقاتوں کا پیش خیمہ تھی۔ دونوں دوست ایک ایک بار سرگودھا بھی آئے۔ دو بار دہلی میں بھی ان سے ملاقات ہوئی۔ یار زندہ صحبت باقی۔ شاید آیندہ بھی ملاقات کی کوئی صورت نکلتی رہے۔ مگر بمبئی میں اصل ملاقات تو راجہ مہدی علی خاں سے ہوئی جو پورے پندرہ دنوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ملاقات بمبئی سنٹرل کے پلیٹ فارم سے شروع ہوکر وہیں اپنے اختتام کو پہنچی۔ ابتدا کچھ یوں تھی:

"بمبئی سنٹرل کے اسٹیشن پر ہم سب کی نظریں راجہ مہدی علی خاں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ نہ اس سے پہلے کبھی راجہ صاحب نے ہمیں دیکھا تھا اور نہ ہم نے راجہ جی کو! لیکن ان کی تصاویر نے ہمیں ان سے کافی حد تک متعارف کرادیا تھا۔ بینا اور سلیم نے استفسار کیا کہ ہم راجہ جی کو کیسے پہچانیں گے۔ میں نے جواباً کہا کہ پلیٹ فارم پر تمھیں جو سب سے موٹا شخص بے اختیار ہنستا ہوا نظر آئے وہی راجہ مہدی علی خاں ہوگا۔ اتفاق دیکھیے کہ پلیٹ فارم پر پھرتے ہوئے کالے کلوٹے پنجر نما انسانوں میں ہمیں ایک ہنستا ہوا "ابوالہول" بالکل الگ تھلگ کھڑا ہوا نظر آیا اور قطعاً غیر شعوری طور پر

ہم سب کی انگلیاں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ راجہ صاحب نے بھی ہمیں پہچان لیا۔ لیکن انھوں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ اپنے ساتھ دوستوں کی ایک پوری فوج لائے تھے۔ پھر قلیوں سے لے کر ٹیکسی ڈرائیوروں تک کو انھوں نے پہلے ہی اپنے قبضے میں کر رکھا تھا وہ روایتی گل محمد کی طرح اپنی جگہ پر کھڑے پان چباتے اور ہنستے رہے وہاں سے ہاتھ ہلا ہلا کر قلیوں کو ہدایات براڈ کاسٹ کرتے اور انڈین ریلوے پر سنسکرت آمیز ریڈیائی زبان میں لعنتیں بھیجتے رہے۔ کھڑے کھڑے انھوں نے مجھے کھینچ کر خود سے لپٹا لیا، کھڑے ہی کھڑے مینا اور سلیم کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور پھر کہرام برپا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر ہمارا سامان ریڑھیوں پر لاد دیا گیا تھا اور قافلہ باہر کی طرف کوچ کر رہا تھا۔ اب راجہ صاحب نے پہلی بار خود کو جنبش دی اور گیٹ کی طرف قدم بڑھائے۔ میں نے پلٹ کر اس "مقدس" مقام کا جائزہ لیا جہاں راجہ صاحب پچھلے ایک گھنٹے سے کھڑے تھے وہاں اب پان کی سرخ پیکوں سے ایک اچھا خاصا جوہڑ وجود میں آ گیا تھا۔ اور چند سہمے ہوئے مسافر اسے غور غور سے تک رہے تھے۔"

گو راجہ صاحب سے خط و کتابت ایک عرصے سے جاری تھی اور میں ان کی نظموں کے ذریعے بھی ان سے واقف تھا مگر جب ان سے ملا تو معلوم ہوا کہ میں تو ان سے کبھی جدا ہی نہیں ہوا تھا۔ پھر جب ہمارا بمبئی کا قیام اختتام کو پہنچا اور بمبئی سنٹرل کے پلیٹ فارم پر راجہ مہدی علی خاں نے ہمیں رخصت کیا تو مجھ پر زیاں کا ایک گہرا احساس چھا گیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میری کوئی نہایت عزیز شے مجھ سے چھن گئی ہے:

"تب دفعتاً گاڑی نے سیٹی بجائی اور حرکت میں آ گئی۔ بے اختیار ہمارے ہاتھ الوداعی سلام کے لئے بلند ہوئے پھر تیز ہوتی ہوئی گاڑی کی کھڑکی میں سے میں نے دیکھا کہ بکھرے ہوئے چہروں کے ہجوم میں راجہ مہدی کا چہرہ ایک مشعل کی طرح چمکا اور پھر گم ہو گیا۔ ملاقات ختم ہو گئی۔ دفعتاً پاتال سے تاریکی کی ڈائن ایک غلیظ سی انگڑائی لے کر اٹھی اور اس

نے آگے بڑھ کر اپنے کالے چکٹ دامن سے دیوار پر لکھے ہوئے سارے روشن الفاظ مٹا دئے۔"

(۱۰)

جب میں ۱۹۵۹ء میں وزیر کوٹ سے سرگودھا پہنچا تھا تو پہنچتے ہی متحرک ہوگیا تھا اور میری زندگی کئی دائروں میں گردش کرنے لگی تھی، ایک مسلسل سفر کی سی کیفیت تھی۔ سرگودھا شہر میں ہوتا تو صبح و شام مختلف جلسوں اور تنقیدی محفلوں میں شرکت کرتا۔ گھر پر آنے والوں کا بھی تانتا سا بندھ گیا۔ مقدمات کے سلسلے میں بھی کچہریوں اور تھانوں کا طواف کرنا پڑا۔ مگر ساتھ ہی حصولِ رزق کے لئے ہر دوسرے روز گاؤں جانا بھی ضروری قرار پایا۔ پھر گورنر کی مشاورتی کونسل کا ممبر ہونے کے باعث میں نہ صرف بار بار لاہور اور اسلام آباد جاتا بلکہ مجھے سیاست میں دلچسپی رکھنے والے اصحاب سے بھی رابطہ قائم رکھنے کی ضرورت پڑتی۔ سرگودھا میں گورنر صاحب یا وفاقی وزرا میں سے کوئی آتا تو ان سے "گفتگو" کرنے کا پہلا حق مجھے دیا جاتا اور مجھے اپنی طبیعت پر جبر کرکے ان سے رسمی باتیں کرنا پڑتیں۔ ضلع سرگودھا میں جو بڑے بڑے زمینداروں اور سیاست دانوں کا ضلع ہے، ایک ایسے شخص کو سیاسی سطح پر سب سے اہم شخصیت قرار دے دیا گیا جو نہ صرف سیاست کے معاملات میں بالکل کورا تھا بلکہ دوسروں کے مقابلے میں بہت کم زمین کا مالک ہونے کے باعث بھی کسی قطار شمار میں نہیں تھا۔ اس سب پر مستزاد یہ کہ "ادبی دنیا" سے منسلک ہونے کے باعث مجھے بار بار لاہور جانے کی ضرورت پڑتی بلکہ اب میں مختلف شہروں میں ہونے والے ادبی جلسوں میں بھی بلایا جاتا اور میں بڑے شوق سے جاتا کیونکہ "ادبی دنیا" کے لئے زیادہ سے زیادہ ادبا سے رابطہ قائم کرنا بے حد ضروری تھا۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر میں اب گرمیوں میں پہلے سے زیادہ عرصہ مری میں گزارتا اور وہاں کی ادبی محفلوں میں شرکت کرتا اور پورے ملک سے آئے ہوئے ادبا سے رابطہ قائم کرتا۔ بعد ازاں یہ رابطہ اکثر و بیشتر دوستی کی بنیاد بھی بن جاتا۔ مری میں یوں تو بے شمار لوگوں سے ملاقات ہوئی مگر جمیل ملک، کرم حیدری، ناصر شہزاد، جمیل یوسف،

مشتاق قمر، جمیل آذر، رشید امجد اور رشید نثار سے دوستی کے رشتے اوّل اوّل مری کی خنک فضا ہی میں قائم ہوئے اور اتنی مضبوطی سے قائم ہوئے کہ نہ صرف آج تک باقی ہیں بلکہ روز بروز زیادہ مستحکم ہو رہے ہیں۔ مری میں طویل عرصہ رہنے اور پھر راولپنڈی میں بار بار جانے کا ایک خوشگوار نتیجہ بھی نکلا کہ راولپنڈی کے ادبا کے لئے "ادبی دنیا" اور بعد ازاں "اوراق" کے ذریعے خود کو منظرِ عام پر لانا ممکن ہوا۔ گویا راولپنڈی میں نئے افسانہ اور انشائیہ کی جو تحریکیں اُبھریں اور پھر ملک بھر میں پھیلیں، ان کے معاملے میں مرکزی کردار ان دو ادبی پرچوں ہی نے ادا کیا۔

(۱۱)

مگر بالائی سطح کا یہ سفر اُس سفر کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھا جو میں اپنی ذات کے اندر کر رہا تھا۔ یکایک جیسے میری ذات کے اندر فاصلے اُبھر آئے تھے اور متعدد سمتیں وجود میں آگئی تھیں اور میرے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ میں جلد از جلد ان فاصلوں کو طے کروں۔ جب کہیں دھماکہ ہو تو اشیا باہر کی طرف اُڑتی ہیں اور جہاں سے وہ اُڑتی ہیں وہاں خلا کا ایک بُلبلا سا بن جاتا ہے۔ وزیر کوٹ سے سرگودھا آتے ہی میری زندگی میں جو دھماکا ہوا تھا اس نے میرے اندر کی دنیا میں ایک خلا سا پیدا کر دیا تھا اور اب میں اس خلا یعنی ایک طرح کی MIND - SPACE میں بے سمت گھوم رہا تھا اور چاہتا تھا کہ دُور کی چیزوں سے رابطہ قائم کر کے خود کو بے سمتی کے احساس سے نجات دلاؤں۔ انھیں دنوں میں نے دو مصنّفوں کو بطورِ خاص پڑھا یعنی ینگ اور فریزر کو اور دونوں نے مجھے انسانی سائیکی کے اجزائے ترکیبی کی طرف متوجہ کر دیا ینگ کا کہنا تھا کہ انسان کا اجتماعی لاشعور ان نسلی تجربات پر مشتمل ہے جو آر کی ٹائپس ARCHETYPES میں خود کو ظاہر کرتے ہیں۔ گویا یہ سٹرکچر ہی انسان کا ثقافتی اور روحانی ورثہ ہیں۔ اور انھیں کے مطالعہ سے انسان اپنے لاکھوں برس پر پھیلے ہوئے تاریک برِاعظم کی سیاحت کر کے ان فاصلوں کو ختم کر سکتا ہے جو اس کی رُوح کے اندر پیدا ہو گئے ہیں۔ فریزر کا کہنا تھا کہ اساطیر وہ آئینے ہیں جن میں انسان اپنے عقائد نیز نفسیاتی بحرانوں ،

اجتماعی خوشیوں اور دکھوں کے عکسوں کو دیکھ سکتا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم انسان آئس برگ کی بالائی سطح پر فروکش ہیں اور نہیں جانتے کہ اس آئس برگ کے چھپے ہوئے حصّے کی صورت کیا ہے؟ جب تک ہم پر چھپی ہوئی حقیقت آشکار نہ ہو ہم اپنے آج کے سماجی اداروں نیز اپنے شخصی اقدامات اور اجتماعی بحرانوں کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ینگ اور فریزر کے مطالعہ کے بعد تاریخ تہذیب سے متعارف ہونے کی بھی ضرورت محسوس کی اور جلد ہی ہیگل، شپنگلر، ٹائن بی اور سوروکن کے مطالعہ میں کھو گیا۔ تاریخ تہذیب کا ایک بڑا حصّہ آثارِ قدیمہ کے مطالعہ سے بھی ماخوذ ہے۔ سو میں نے سمیریا، مصر، کریٹ اور وادیٔ سندھ کی پرانی تہذیبوں کا مطالعہ آثارِ قدیمہ پر لکھی گئی کتابوں کے حوالے سے کرنا شروع کیا اور جلد ہی میری آنکھوں کے سامنے ایک تصویر سی ابھرتی چلی آئی ——— ایک ایسی تصویر جس کی افقی سطح تو تاریخ تہذیب کے مطالعہ نے اور عمودی سطح ینگ اور فریزر کے نظریات نے مجھ پر منکشف کی تھی۔ انھیں دنوں میں نے اپنا مضمون "دھرتی پوجا کی ایک مثال ——— میراجی" لکھا جو اس سلسلے میں بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا۔

۱۲

اوپر میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شادی کے بعد جب میں گاؤں میں قیام پذیر ہوا تو دھرتی کے لمس سے آشنا ہوا تھا اس تجربے نے مجھے نہ صرف لنگر انداز ہونے کا موقع فراہم کیا بلکہ دھرتی کے بے پناہ حُسن کو بھی مجھ پر آئینہ کر دیا۔ اصلاً یہ رشتہ جذباتی نوعیّت کا تھا۔ میں اپنی پانچوں حسیات کی مدد سے دھرتی کو دریافت کر رہا تھا مگر اس کی نوعیّت بہر حال مادی تھی۔ پھر جب میں نے سرگودھا پہنچنے کے بعد اپنی ذات کے اندر سفر شروع کیا تو دوبارہ "دھرتی" سے ایک اور سطح پر منسلک ہو گیا۔ پہلے میں دھرتی کی قوسوں اور دائروں، اس کی خوشبوؤں اور رنگوں اور آوازوں سے آشنا ہوا تھا۔ اب میں دھرتی کے نقوشِ قدم کی تلاش میں منہمک ہوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ نہ صرف دھرتی بجائے خود سورج کے گرد اپنوں

سالوں سے سفر کر رہی ہے بلکہ اس کے وجود میں اس سفر کی روئیداد بھی دفن ہے اس روئیداد کو دھاتوں اور چٹانوں کے علاوہ متحجرات میں پڑھا جا سکتا ہے لیکن اس کے علاوہ یہ روئیداد انسانوں کی پوری تاریخِ تہذیب کی صورت میں بھی موجود ہے اور اس تاریخِ تہذیب کو آثارِ قدیمہ کے مطالعہ کے علاوہ خود انسانی سائکی کے مطالعہ سے بھی سامنے لایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے ینگ کا "اجتماعی لاشعور" ایک نہایت زرخیز تصوّر نظر آیا۔ زمین اگر اپنی کوکھ میں اپنی ساری داستان چھپائے ہوئے ہے تو انسان کی سائکی میں بھی اس کے جملہ نسلی تجربات متحجرات کی صورت میں موجود ہوں گے۔ اگر ایسا ہے تو پھر شاعری جو انسان کے اندر کی دنیا کو مَس کرنے پر قادر ہے، ان متحجرات کے وجود سے بھی یقیناً آشنا ہوگی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ شاعری کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہونے کا فیصلہ تو ہمارا ذوقِ نظر کرتا ہے۔ مگر شاعری کے عمق کا اندازہ لگانے کے لیے قاری کو کچھ دوسرے ذرائع بھی درکار ہیں۔ مثلاً اگر شاعری میں آرکی ٹائپل امیجز ARCHETYPAL IMAGES موجود ہوں تو قاری ان کی وساطت سے نہ صرف یہ جان سکتا ہے کہ شاعر نے انسانی سائکی کی کن تہوں کو مس کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے بلکہ وہ ان کی مدد سے انسان کی ثقافتی تاریخ کو بھی از سرِ نو مرتّب کر سکتا ہے۔ بس یہی وہ خیال تھا جس نے مجھے شاعری کے مطالعہ سے شاعر کی شخصیّت کو دریافت کرنے اور شخصیّت کے ذریعے ثقافتی تناظر کو طشت ازبام کرنے کی طرف راغب کیا اور میں ایک لمبے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس سلسلے میں مَیں نے پہلا مضمون "دھرتی پوجا کی ایک مثال — میراجی" لکھا اور کچھ ہی عرصہ بعد "اُردو شاعری کا مزاج" لکھنے کی طرف متوجّہ ہو گیا۔

"دھرتی پوجا کی ایک مثال —— میراجی"! لکھتے ہوئے مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ میراجی اس برِّصغیر کی دھرتی کے عشق میں گرفتار ہے۔ مگر اس کی "دھرتی پوجا" بُت پرستی کی صورت میں نہیں ہے۔ اس نے تو اپنی دھرتی کے ثقافتی تناظر کو جی جان سے چاہا ہے اور اس کی ثقافتی کروٹوں کو خود میں پوری طرح سمو لیا ہے۔ چنانچہ اس کے ہاں گوتم کی شخصیّت، ویدانت کا زاویۂ نگاہ اور ویشنو بھگتی تحریک — یہ سب محض مطالعہ اور اکتساب کی حد تک موجود نہیں ہیں بلکہ اُس کا سارا شعری باطن اپنی امیجری اور لفظیات سمیت اس ثقافتی تناظر سے ایک گہری

جذباتی وابستگی کا آئینہ دار ہے۔ میں نے میراجی کی نظموں کے مطالعے سے اپنے اس موقف کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور ضمناً ویشنو بھگتی تحریک کے مزاج کا بھی تجزیہ کر ڈالا۔ جب میرے اس مضمون کا مسوّدہ سرگودھا سے لاہور مولانا صلاح الدین احمد کے پاس پہنچا اور انھوں نے اس کا مطالعہ کیا تو اس قدر خوش ہوئے کہ مجھ سے انھوں نے اسی وقت ٹیلیفونی رابطہ قائم کیا اور پھر میرے مضمون کی اس قدر تعریف کی کہ میں بوکھلا گیا اور شکریہ کے رسمی الفاظ تک زبان پر نہ لا سکا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے بعد میں گھنٹہ بھر اپنے سرگودھا کے مکان کے صحن میں تیز تیز چلتا اور اس مسرّت کو ضبط کرتا رہا جو میرے ہر بُنِ مو سے پھوٹ بہی تھی۔ میں نے اپنی بعد کی زندگی میں متعدد ایسے مضامین اور کتابیں لکھیں جنھیں پڑھ کر میرے بعض احباب نے میری بے حد حوصلہ افزائی کی مگر جو خوشی مجھے اُس روز مولانا کی تعریف سُن کر ہوئی پھر کبھی نصیب نہ ہو سکی۔ مگر مولانا نے اس تعریف کو محض نجی سطح کا معاملہ نہ رہنے دیا۔ بلکہ بعد ازاں جب یہ مضمون "ادبی دُنیا" میں شائع ہوا تو "بزمِ ادب" میں اس تعریف کو من وعن دہرا کر پوری اُردو دنیا کو اس مضمون کی طرف متوجہ کر دیا۔ مضمون چھپنے کے بعد اہلِ نظر نے اس کی جو تعریف کی اس کا کچھ حصّہ تو ادبی دنیا کے آئندہ شماروں میں محفوظ ہو گیا۔ مگر زیادہ حصّہ زبانی کلامی پھیلتا رہا تا آنکہ اسے اُس ردِّ عمل کا سامنا کرنا پڑا جو ضرورت سے زیادہ تعریف کے نتیجہ میں ہمیشہ سامنے آتا ہے۔ چنانچہ میرے کرم فرماؤں نے میری ہی تخلیق کردہ ترکیب "دھرتی پوجا" کو بطور دشنام میرے خلاف استعمال کرنے کی مہم شروع کی جو کسی نہ کسی صورت آج تک جاری ہے اور جس کے ساتھ انھوں نے سیاسی تاویلات نتھی کر کے اسے کردار کُشی کا ذریعہ بھی بنا یا ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ انھوں نے "دھرتی پوجا" کے بارے میں میرے مسلک کو سمجھے بغیر یا شاید اس معاملے میں تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اس کی بڑے پیمانے پر مذمّت کی ہے۔ مگر یہ کوئی ایسی کہانی نہیں جسے بطورِ خاص سُنانے کی ضرورت محسوس کی جائے۔

۱۳

"دھرتی پوجا کی ایک مثال ــــ میرا جی" میں شاعر کو اس کے ثقافتی تناظر سے منسلک کر کے اس کی شاعری کے اجزا اور محرکات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی، مگر میں اسی دوران ثقافتی تناظر کے حوالے سے خود اصنافِ شعر کے مزاج کو دریافت کرنے کی طرف بھی مائل ہو گیا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں چند ایک مضامین بھی لکھے تھے جن میں نظم اور غزل کا مزاج دریافت کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان میں سے ایک مضمون "نظم اور اس کا پس منظر" کے عنوان سے میری کتاب "نظمِ جدید کی کروٹیں" میں شامل تھا۔ میں نے اس مضمون میں غزل اور نظم کا مزاج دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے لکھا تھا:

"نظم کے سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ بہ حیثیت مجموعی نظم کو مغرب میں فروغ حاصل ہوا ہے، جب کہ غزل صرف مشرق کی پیداوار ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کو محض اتفاق پر محمول کر کے مسترد تو نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہر صنفِ ادب نہ صرف شخصیت کا بے محابا اظہار ہے بلکہ اپنے ماحول، زندگی، جغرافیائی حالات اور اس کے اثرات کو بھی پیش کرتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر صنفِ ادب دراصل اپنے مخصوص ماحول کی پیداوار ہوتی ہے ــــ اور اس کا مزاج اور پیکر اپنے ماحول کا دست نگر رہتا ہے۔ پس اگر نظم نے مغرب میں مقبولیت حاصل کی ہے تو اس کے مزاج کو پرکھنے کے لئے مغرب کے مخصوص اندازِ نظر، مزاج اور طریقِ کار کو سمجھنا ضروری ہے ــــ"

"نظم کی خصوصیت اس کی اکائی ہے اور نظم کا ہر مصرع ایک مرکزی خیال کی تعمیر میں صرف ہوتا ہے۔ لیکن غزل متعدد بکھرے ہوئے اشعار کا مجموعہ ہے اور غزل کا ہر شعر غزل کے پیکر سے اس طرح منسلک ہوتا ہے جیسے درخت جنگل سے یا فرد سماج سے۔ پھر غزل کا شعر نظم کی طرح کسی مخصوص تجربے کا "تجزیاتی اظہار" نہیں ہوتا بلکہ جذبے اور تجربے کی عمومی صورت کو وجود میں لاتا ہے۔ مشرقی ممالک میں تہذیب کے ارتقا نے فرد کو سماج میں ضم کر دیا تھا اور اپنے مخصوص تجربے کے اظہار پر انبوہ اور سماج کے اجتماعی تجربے کے اظہار کو فوقیت دینا

تھا۔ چنانچہ غزل میں فرد کا مخصوص تجربہ بھی اجتماعی اور عمومی صورت اختیار کر گیا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ نوکیلا جذبہ تہذیب سے مملو ہو کر ہموار، کشادہ اور ہمہ گیر ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں نظم فرد کی ذات کا آئینہ ہے وہاں غزل ایک پورے دَور کی کروٹوں اور ذہنی تحریکوں کی عکاسی کرتی ہے"۔

میرے لیئے غزل اور نظم کے مابہ الامتیاز کو دریافت کرنے کی یہ کوشش ایک BREAK THROUGH تھا۔ یکایک میری نظروں کے سامنے ایک نئی دُنیا طلوع ہو گئی تھی اور اس نئی دُنیا سے منسلک متعدد سوالات بھی کلبلانے لگے تھے۔ جن میں اہم ترین سوال یہ تھا کہ اگر نظم اور غزل کا فرق ہیئت کا نہیں بلکہ مزاج کا فرق ہے تو پھر یہ مزاج کن اجزا سے متشکل ہوا ہے۔ کیا اس مزاج کو ماحول کی محض اُفقی یا جغرافیائی سطح تک محدود رکھنا مستحسن ہے؟ کیونکہ ہر ماحول اپنی اُفقی وسعت کے ساتھ ایک عمودی عمق بھی رکھتا ہے اور یہ عمودی عمق نسبتاً زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں درخت کی مثال اُبھری کہ درخت کا چھتنار بھی اُفقی طور پر چاروں طرف پھیلتا ہے۔ مگر اس کی جڑیں زمین کے اندر اُتری ہوتی ہیں جہاں سے وہ اپنے لیئے غذا کشید کرتی ہیں۔ کیا یہی حال کلچر کا بھی نہیں ہے؟ کیونکہ وہ بھی اپنی جڑوں کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا۔ اگر یوں ہے تو پھر جڑوں کی تلاش کرنی چاہیئے۔ سو یہ تلاش ہی اب میرے لیئے سب سے اہم موضوع تھا۔ کسی زمانے میں میں نے مسرت کی تلاش کی تھی اب میں اپنی دھرتی کی بلکہ خود اپنی جڑوں کی تلاش میں مصروف ہوا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ مختلف اصنافِ شعر کے مزاج کا فرق بھی اس تلاش کے نتیجے ہی میں آئینہ ہو گا۔

(۱۴)

"اُردو شاعری کا مزاج" پہلی بار ۱۹۶۵ میں شائع ہوئی۔ میں نے کتاب کے اختتامیہ میں لکھا کہ "میں نے تقریباً پانچ برسوں میں اس کتاب کو مکمل کیا ہے۔ تاہم در اصل میں گہری تاریکیوں میں اپنے لیئے راستہ ہی تلاش کرتا رہا ہوں"۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر چند کتاب پانچ برس میں مکمل ہوئی لیکن میں اس پر غور و فکر ایک طویل مدت سے کر رہا تھا اور اس کے تعقّلات

یعنی CONCEPTS تو میری زندگی کے پورے بیس سالوں کی مختلف ذہنی اور جذباتی کروٹوں سے مرتّب ہوئے تھے۔ سو میں نے کتاب کے دیباچے میں لکھا:

"کسی زبان کی شاعری کا مطالعہ اس بات کا متقاضی ہے کہ پہلے اس تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کا جائزہ لیا جائے جس میں اس زبان اور اُس کی شاعری نے جنم لیا۔ لیکن یہ پس منظر سادہ ورق کی طرح ایک ہموار سطح کو پیش نہیں کرتا بلکہ دو مختلف سطحوں کے امتزاج سے متشکّل ہوتا ہے۔ اس کی پہلی سطح دھرتی کی تاریخ کا ایک آئینہ ہے —— دوسری سطح داخلی اور تہذیبی تصادم کو اُجاگر کرتی ہے ان دونوں سطحوں کے امتزاج ہی سے کسی ملک کا وہ ثقافتی اور تہذیبی پس منظر مرتب ہوتا ہے جو اس کی زبان اور شاعری پر اپنے گہرے اثرات مرتسم کرتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ اُردو شاعری کے مزاج کو دریافت کرنے کے لئے ایک تو میں اُسے دھرتی کے مزاج سے منسلک کرنے کی کوشش میں تھا، دوسرے میں اس کام کے لئے ثنویت کے CONCEPTS کو بروئے کار لا رہا تھا۔ دھرتی کے بارے میں میری معلومات بعض کتابوں سے ماخوذ نہیں تھیں۔ میں نے ایک طویل عرصہ دھرتی کی معیّت میں بسر کیا تھا اور اس کے ہر رنگ رُوپ اور اس کے مزاج کی ہر کروٹ سے براہِ راست منسلک رہا تھا۔ میں نے دھرتی کا اس کی اُفقی اور عمودی دونوں سطحوں پر مطالعہ کیا تھا۔ اور جانتا تھا کہ خود میرا جسم بھی دھرتی ہی کی توسیع ہے۔ پھر جس طرح رُوح، جسم کی دھرتی کے بغیر اپنا اظہار کرنے سے قاصر ہے بالکل اسی طرح سارے فنونِ لطیفہ دھرتی کے بدن میں موجود روح ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سو جب میں اُردو شاعری کا مزاج دریافت کرنے کے لیے اس بّرِصغیر کی دھرتی اور اس کی جڑوں کی طرف راغب ہوا تو اصلاً خود اپنے اعماق میں اُترا اور اجتماعی لاشعور کے حوالے سے اُن MOTIFS کا مطالعہ کرنے لگا جو اساطیر، عقائد اور رُوحانی اور ثقافتی مظاہر کی صورت میں اُبھرے ہوئے مجھے صاف نظر آنے لگے تھے۔ تاہم اس مطالعہ اور تجزیے کے لئے میں نے جو آلاتِ جراحی استعمال کئے ان میں سب سے اہم "ثنویت" کا تصور تھا۔

جذباتی سطح پر اس تصوّر کا نہایت گہرا رشتہ میری ازدواجی زندگی میں ابھرنے والے "میں اور تُو" کے تصوّر سے اور ذہنی سطح پر "وجود اور موجود" کی اُس دوئی سے تھا جو میری زندگی کے ایک دَور میں میرے لیے ایک اہم سوال کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

مگر "اُردو شاعری کا مزاج" میرے لئے ایک اوڈیسی بھی تھی ——— میں ایک تاریک خطّے کا سفر کرنے لگا تھا اور ہر شے مجھے ہیولوں کی صورت میں دکھائی دے رہی تھی۔ البتہ جب میں قریب جاتا اور اس مشعل کی روشنی میں ان پر ایک نظر ڈالتا جو میں نے اولمپک کے کھلاڑی کی کھلاڑی کی طرح اٹھا رکھی تھی تو ہیولے خاکوں میں اور خاکے تصویروں میں ڈھلنے لگتے۔ یہ مشعل ایک تمثیل تھی جسے میں نے "کُھل جا سِم سِم" کے طور پر بھی استعمال کیا اور جس کی مدد سے میں نے ان تالوں کو کھولنے کی کوشش کی جو قدم قدم پر میرے راستے میں اُبھر آئے تھے۔ تمثیل فقط یہ تھی کہ عورت (دھرتی) مرد کی محبّت کو ایک بیج کی طرح اپنے دل میں اگاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ دو حصّوں (ماں اور بچّہ) میں بٹ جاتی ہے۔ بچّہ ماں کا ہاتھ تھام کر چلتا ہے تاکہ بھرے میلے میں گم نہ ہو جائے مگر پھر ایک روز جب بچّہ جوان ہو کر ایک منفرد اکائی میں ڈھل جاتا ہے تو ماں سے اپنا ہاتھ چھڑا لیتا ہے مگر ماں سے جُدا نہیں ہوتا۔ اب ماں کو وہ ایک بُت کی طرح اپنی ذات کے اندر بٹھا لیتا ہے اور ہر بحرانی صورتِ حال میں اس سے مدد طلب کرتا ہے۔ مجھے اس تمثیل کی روشنی میں گیت کی نمو اس وقت دکھائی دی جب عورت کے دل میں محبّت کا بیج اگتا ہے۔ غزل کی اُس وقت جب ماں اور بچّہ کی دوئی اور انسلاک وجود میں آتا ہے اور نظم کی اس وقت جب بچّہ جوان ہو کر "ماں" کو اپنی ذات میں سمو لیتا ہے۔ اب میرے لئے سوال یہ تھا کہ کیا اس برِّصغیر کی ثقافتی تاریخ بھی اس تمثیل کی توثیق کرتی ہے یا نہیں؟ بس میں یہی ایک سوال لے کر چلا۔ میں نے پروٹو آسٹرولائیڈ PROTO-AUSTRALOID اور نیگرائڈ NEGROID اور پھر دراوڑیوں اور آریاؤں کی آویزش اور انضمام میں ان تینوں اصنافِ شعر کے "مقام" کو متعیّن کرنے کی کوشش کی اور ضمناً اس ثقافتی تناظر کی نسبت سے جس میں ہر صنفِ شعر کا جنم ہوا تھا، اُس کا مزاج بھی متعیّن کیا۔ میری یہ اوڈیسی تقریباً ساڑھے چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی کتاب "اُردو شاعری کا مزاج" کا موضوع ہے۔

(۱۵)

مجھے "اُردو شاعری کا مزاج" کے شائع ہوتے ہی ایک شدید ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑا جو کسی نہ کسی صُورت میں آج تک جاری ہے بلکہ اب سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ردِ عمل علامتی سطح پر اس کی اشاعت سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ غالباً مارچ ۱۹۶۵ء کا مہینہ تھا۔ اُن دنوں رَن آف کچھ کے تنازع کی وجہ سے پاکستانی افواج حرکت میں آچکی تھیں۔ میری والدہ بیمار رہنے لگی تھیں۔ ایک روز اطلاع ملی کہ حالت خراب ہے۔ چنانچہ میں سرگودھا سے بیوی بچّوں کے ساتھ کار میں وزیرکوٹ کے لئے روانہ ہوا۔ اُن دنوں "اُردو شاعری کا مزاج" کی کتابت مکمّل ہو چکی تھی اور مَیں کتابت شدہ مسوّدہ پڑھ رہا تھا۔ لہٰذا مَیں نے مسوّدہ بھی کار میں اپنے ساتھ رکھ لیا۔ شہر سے باہر نکلتے ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا کیونکہ سڑک پر فوجی ٹرکوں کی لاتعداد قطاریں مصروفِ سفر تھیں۔ ہم لوگ بھی ایک قطار میں شامل ہو کر آہستہ آہستہ آگے کو سرکنے لگے۔ سرگودھا سے تقریباً ۷ میل دُور راجباہ لالیاں سے ذرا پہلے بسوں کا ایک اڈّہ ہے جو "چک ۴۶ اَڈّہ" کے نام سے مشہور ہے۔ مَیں نے سوچا کچھ دیر کے لیے اس اَڈّہ پر رُک جاتے ہیں۔ ممکن ہے رش کم ہو جائے۔ چنانچہ ہم سڑک سے ذرا ہٹ کر ٹھہر گئے، مگر کار میں ہی بیٹھے رہے۔ معاً سامنے سے ایک تیز رفتار فوجی ٹرک آیا مگر اُس نے ہماری کار کو دیکھ لیا اور اس لئے کار کو بچا کر گزرا۔ مگر اس کے پیچھے ایک اور تیز رفتار فوجی ٹرک آ رہا تھا جس کے ڈرائیور کو کار نظر نہ آئی۔ چنانچہ وہ سیدھا کار کی جانب لپکتا چلا آیا۔ مجھے یوں لگا جیسے "موت" ایک پہاڑ کی صُورت میری طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ یہ اب آخری لمحہ ہے۔ مَیں نے غیر شعوری طور پر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر مجھے یوں لگا جیسے ٹرک ہماری کار کے ساتھ نہیں ٹکرایا بلکہ کسی نے کار کو ایک پھُول مار دیا ہے۔ بالکل معمولی سا جھٹکا تھا۔ مَیں نے آنکھیں کھولیں۔ کار میں سب لوگ زندہ سلامت تھے۔ مَیں کار سے باہر نکلا۔ ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ کار کا اگلا حصّہ تباہ ہو چکا تھا۔ میں خود بھی زخمی تھا مگر بہرحال زندہ سلامت تھا۔ دراصل دھچکا بہت شدید تھا لیکن مجھے نہ جانے کیوں معمولی سا محسوس ہوا۔ غالباً لمحہ بھر کے لیئے میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا جس کے نتیجے

میں میرے جسم نے دھچکے کی شدت کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ ہم نے کار وہیں چھوڑ دی کیونکہ وہ اب چلنے کے قابل نہیں تھی اور ایک تانگے میں سوار ہو کر وزیر کوٹ جا پہنچے۔ مگر اس طور کہ میرے کپڑے خون آلود تھے۔ میرے ہاتھ میں "اردو شاعری کا مزاج" کا مسوّدہ تھا اور آنکھوں میں "رسیدہ بود بلائے" کے بعد والی وہ چمک تھی جسے "بخیر گزشت" کے کھسیانے الفاظ سے نشان زد کرنے کی ہمیشہ سے کوشش ہوتی رہی ہے۔

وزیر کوٹ پہنچ کر میں نے گاؤں کے "ڈاکٹر" کو اپنے زخم دکھائے۔ اس نے ضروری کارروائی کی اور پھر مجھے بستر میں آرام کرنے کی تلقین کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے کچھ ہی عرصہ بعد مجھ پر ایک نظم اُتری جس میں غالب ترین احساس یہ تھا کہ موت اگر اپنے مشن میں کامیاب ہو جائے تو زندہ رہتی ہے۔ کامیاب نہ ہو سکے تو زمین پر گر کر ایک جھنکار کے ساتھ پاش پاش ہو جاتی ہے۔ نظم کا عنوان تھا: "بانجھ"!

چھتوں، منڈیروں اور پیڑوں پر
ڈھلتی دُھوپ کے اُجلے کپڑے سُوکھ رہے تھے
بادل سُرخ سی جھالر والے بانکے بادل
ہنستے چِکتے پھُولوں کا اک گُلدستہ تھے
ہر شے کندن رُوپ میں ڈھل کر دَمک رہی تھی
گالوں پر سونے کی ڈلک اور آنکھوں میں اک تیز چمک تھی
سارا منظر کیف کے اک لمحے میں بے بس
لذّت کی بانہوں میں جکڑا ٹھمک رہا تھا!

اور پھر وہ آنکھوں کو مَلتی
کالے، اُلجھے بالوں کو مُکھ پہ بکھرائے
چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بڑھتی آئی
پہلی کھڑکی میں جب اُس نے جھانک کے دیکھا

کھڑکی کی دہلیز پہ رکھا اک نازک گُل دان چھَنخ کر ٹوٹ گیا
اُبھے بالوں، پاگل آنکھوں والی نے تب آگے بڑھ کر
دوسری، تیسری اور پھر گلی کی ہر کھڑکی میں جھانک کے دیکھا
گُل دانوں کو ٹھوکر ماری
اک اک پھُول کو روند دیا!

تب وہ مجھ کو دیکھ کے لپکی
میری جانب غیض بھری نظروں کا ریلا آیا
پھر جیسے کچھ سوچ کے ٹھٹھکی
سُرخ گلاب کا پھُول میرے ہاتھوں میں تھمایا
اور خود چکنے فرش پہ گر کر ٹوٹ گئی!

اس حادثے کے طفیل میرے حصّے میں "سُرخ گلاب" ایسا جو زخم آیا وہ تو ہفتہ بھر کے بعد مُرجھا گیا۔ مگر "اُردو شاعری کا مزاج" پر سنگ باری کرنے والوں کی کارروائی کا یہ نقطۂ آغاز تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ رِم جھِم شروع ہو گئی تھی جس نے آگے چل کر موسلا دھار بارش کی صُورت اختیار کرنا تھی۔

(۱۶)

میرے لیے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء دو ہنگامہ خیز سال تھے۔ اُن دو سالوں نے مجھے بے پایاں خوشی بھی عطا کی اور گہرا دُکھ بھی دیا۔ خوشی اس لیے کہ "اُردو شاعری کا مزاج" شائع ہوئی اور "اوراق" کا اجرا ہوا۔ دُکھ اس لیے کہ "اُردو شاعری کا مزاج" پر دل دُکھانے والے اعتراضات ہوئے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان پہلی بڑے پیمانے کی جنگ ہوئی اور میری والدہ وفات پا گئیں۔ چنانچہ میں یہ سارا عرصہ گھڑی کے پنڈولم کی طرح خوشی اور غم کی انتہاؤں کے درمیان جھُولتا رہا۔

"اُردو شاعری کا مزاج" پر پہلا "پھول" ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب کی طرف سے آیا۔ ڈاکٹر صاحب

کے لیے میرے دل میں بڑا احترام تھا اور کم از کم اس کوارٹر سے مجھے ایسے سخت "ردِّ عمل" کا وہم و گمان تک نہیں تھا۔ مگر کتاب اس نوعیّت کی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی مرنجان مرنج طبیعت کو بھی اشتعال دلانے میں کامیاب ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے لاہور کے ایک انگریزی جریدے میں اس کتاب کے خلاف ایک مضمون لکھا۔ میں نے مضمون پڑھا تو مجھے دُکھ ہوا کیونکہ اس میں کتاب پر سیاسی اور مذہبی نوعیّت کے ناروا اعتراضات کیے گئے تھے۔ مَیں نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اسی وقت ایک خط لکھا اور کہا کہ اگر آج مولانا صلاح الدّین احمد زندہ ہوتے تو مجھے میری محنت کی داد دیتے مگر آپ نے داد کے بجائے بیداد کا رویّہ اختیار کیا۔ آخر کیوں؟ —— ڈاکٹر صاحب نے فوراً میرے خط کا جواب دیا اور معذرت کی کہ اُن کا مقصود وہ نہیں تھا جو مجھ تک پہنچا اور ساتھ ہی اس خدشے کا اظہار کیا کہ انھوں نے اس کتاب کے خلاف ایک طویل مضمون لکھ کر رسالہ "فنون" کو دے رکھا ہے۔ کہیں وہ شائع نہ ہو جائے۔ چند روز کے بعد اُن کا ایک اور خط آیا جس میں لکھا تھا کہ وہ مضمون واپس لینے "فنون" کے دفتر گئے تھے مگر مضمون حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ مضمون "فنون" میں شائع ہوا۔ مضمون میں مجھ پر دراوڑیت پھیلانے کا الزام لگایا گیا تھا۔ لکھا تھا کہ مَیں دراوڑیت تو کیا پھیلاؤں گا خود ہی ختم ہو جاؤں گا وغیرہ —— مَیں تنقید سے الرجک نہیں تھا۔ لیکن ایسی تنقید جس میں ادب کم اور سیاست زیادہ ہو میرے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ ندیم صاحب سے میرے برادرانہ مراسم تھے۔ ان سے بھی توقّع نہیں تھی کہ وہ اس سطح کے اعتراضات کو اپنے رسالے میں جگہ دیں گے۔ مگر انھوں نے بہر حال اس میں کوئی ہرج نہ دیکھا۔ مجھے بہت کم غصّہ آتا ہے آئے بھی تو اندر ہی اندر سُلگ کر ختم ہو جاتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب کے مضمون کا لہجہ ایسا تھا اور ان کے اعتراضات کی نوعیّت اس قسم کی تھی کہ مجھے غصّہ آ گیا۔ چنانچہ مَیں نے عصمت اللہ کے "اُردو زبان" میں جو اُن دنوں سرگودھا سے نکلنا شروع ہوا تھا ایک مضمون لکھا جس میں ڈاکٹر صاحب کے اعتراضات کو رَد کرنے کی کوشش کی۔ مضمون خاصا تیز تھا۔ تاہم مَیں نے مضمون میں ڈاکٹر صاحب کا احترام شروع سے آخر تک ملحوظ رکھا تھا۔ میرے مضمون

کی اشاعت سے اُن شعلوں میں مزید اضافہ ہوگیا، جو فنون والے مضمون سے پیدا ہوئے تھے۔ خیر شعلے تو بہر حال اُٹھنا ہی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا مضمون شائع نہ بھی ہوتا تو "اُردو شاعری کا مزاج" پر شدید ردِّ عمل متوقّع تھا، مگر میرے جوابی مضمون کے بعد میرے اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو گئی۔ ملنا جلنا بھی بند ہوگیا اور خط و کتابت بھی!

اس کے کئی سال بعد وہ ایک بار سرگودھا تشریف لائے۔ غالباً کوئی اُردو کانفرنس تھی۔ رات کو کلب میں ان کے اعزاز میں ڈنر تھا۔ ڈنر میں مَیں بھی موجود تھا۔ لیکن خلقِ خُدا سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دُور سے مجھے دیکھا تو لپک کر مجھ تک پہنچے اور پھر مجھ سے بغل گیر ہو گئے۔ بس اُس ایک درخشاں لمحے میں ڈاکٹر صاحب نے ساری کدورت اور رنج میرے دل سے کھُرچ ڈالا۔ مَیں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چائے پئیں۔ انھوں نے میری دعوت فوراً قبول کر لی۔ دوسرے روز میرے ہاں آئے۔ "اُردو شاعری کا مزاج" کا ذکر تک نہ آیا۔ مطلع صاف ہو گیا تھا۔ بزرگ ادبا کا یہی امتیازی وصف ہونا چاہئے کہ اپنے سے جونیئر ادبا کے ساتھ اِغماض و درگزر کا رویّہ اختیار کریں نہ یہ کہ اپنی انا اور مصنوعی خودداری کے خول میں بند ہو کر خود کو "مقدس" قرار دے ڈالیں۔

۱۷

ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ ہوئی مگر اس جنگ کے آثار پہلے سے دکھائی دینے لگے تھے۔ مَیں جب جولائی اگست میں مری گیا تو ساری فضا آنے والی جنگ کے سایوں میں لپٹی ہوئی نظر آئی۔ جب دو آدمی لڑتے ہیں تو ہاتھا پائی سے پہلے مغلّظات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ بس یہی کچھ دونوں طرف کے اخبارات میں ہو رہا تھا۔ ریڈیو بھی سرگرمِ عمل ہو گئے تھے۔ میں جب اخبار پڑھتا تو سیاست دانوں بالخصوص بھارتی سیاست دانوں کے اشتعال انگیز بیانات پڑھ کر مجھے بہت تکلیف ہوتی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ وہ ایک چھوٹے "برادر ملک" کے ساتھ برادر خوردوالا سلوک کرنے کے لئے پَر تول رہے ہیں۔ معاً میرے دل میں اپنے وطن کی دھرتی کے لیے ایک تُند و تیز جذبہ پیدا ہوا۔ مَیں "دھرتی" کا ایک طالب علم تھا اور اس کے تاریخ

جغرافیہ کا ایک عرصہ سے مطالعہ کرتا رہا تھا۔ مگر دھرتی کو بطور ارضِ وطن اس شدّت سے میں نے پہلی بار محسوس کیا۔ بعدازاں جب جنگ ہوئی تو ہر بم کا گولہ جو ارضِ وطن پر گرتا مجھے اپنے سینے پر گرتا ہوا محسوس ہوتا۔ مگر حُبِّ وطن کے اس جذبے کے ساتھ ساتھ میرے اندر جنگ سے نفرت کے اس جذبے نے بھی سر اُٹھایا جو عرصۂ دراز سے منقار زیرِ پر تھا۔ بات یہ ہے کہ میں نے دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ دیکھ رکھا تھا اور جانتا تھا کہ جنگ کیا ہوتی ہے۔ کیسے جنگ ہنستے بستے گھروں کو اُجاڑتی اور زندگیوں کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ علاوہ ازیں میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کے گرنے کے ہولناک تجربے سے بھی گزرا تھا۔ یعنی اگرچہ بم جاپان میں گرائے گئے لیکن پُوری نسلِ انسانی نے اُن کے دھماکوں کو محسوس کیا تھا۔ اُس وقت مجھے اس بات کا احساس بڑی شدّت سے ہوا تھا کہ اگر نسلِ انسانی نے کبھی خودکُشی کا پروگرام بنایا تو اِن نئے مہلک ہتھیاروں کے باعث وہ اسے عملی جامہ پہنانے میں ضرور کامیاب ہو جائے گی۔ سو اب کہ میرا اپنا وطن جنگ کے شعلوں کی تمازت کو محسوس کرنے لگا تھا تو میرے اندر جنگ سے نفرت کا جذبہ اُبھرا اور مجھ پر پُوری طرح چھا گیا۔ اُن دنوں میں نے ایک نظم "پیش گوئی" لکھی۔ جس میں اُس "مُڑے ہوئے ناخنوں والے عفریت" یعنی جنگ کے دیوتا کا ذکر تھا جو ہر انسان کے اندر چھُپا بیٹھا ہے اور جب بھی موقع ملتا ہے ایک بھیانک قہقہہ کے ساتھ اس کی آنکھوں کے جھروکوں سے باہر نکل آتا ہے:

ہنسا کھوکھلی سی ہنسی
اور پوتھی پہ اک ہاتھ رکھ کر
مجھے گھُور کر
گُنگُنایا:
مجھے ایک بھی سبز پتّا دکھائی نہیں دے رہا
ایک بھی بانسری کی مدھر تان
پانی کی گاگر کے نیچے چھلکتی ہوئی وحشی ہرنی سی آنکھیں
کوئی ایک چمکیلا آنسو بھی باقی نہیں ہے!

دُھواں، راکھ اور خُون
دھرتی کی اُجڑی ہوئی کوکھ میں چند جُھلسی ہوئی ہڈیاں
اَدھ جلے پریم پتروں کے ڈھانچے
درختوں کی لاشیں
مکانوں کی اُڑتی ہوئی دھجّیاں
سُونے رستوں پہ بکھری ہوئی کھوکھلی سی ہَوا کے سوا
اور کچھ بھی مجھے یاں دکھائی نہیں دے رہا

بڑی دیر تک مَیں نے بوڑھے نجومی کی باتیں سُنیں
اور آباد راہوں پہ خوش پوش جوڑوں کو آنسو کی چلمن سے دیکھا کیا
پھر اچانک
نہ جانے کہاں اک بگل سا بجا
اور نہ جانے وہ کیسے نکل کر میرے سامنے آ گیا
ایک بھینگا، مُڑے ناخنوں والا عفریت
جو پہلے دن سے
مری آنکھ میں چُھپ کے بیٹھا ہوا تھا
میرے خُون پر پَل رہا تھا۔ (۱۹۶۵ء)

ستمبر میں جب جنگ ہوئی اور مَیں نے جنگ کے عفریت کو تباہی مچائے ہوئے دیکھا تو ایک شدید احساسِ زیاں کی زد میں آ گیا۔ میرے لیے ارضِ وطن کی بے حُرمتی ایک جان لیوا اور کربناک تجربہ تھا۔ اور یقیناً اس کا تعلق اُس دھرتی سے بھی تھا جو میرے اعماق میں ایک مقدّس جذبے کی طرح موجود تھی۔ اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب جنوری ۱۹۶۶ء میں "اوراق" کا پہلا شمارہ طلوع ہوا تو مَیں نے پہلا "ورق" میں دھرتی کی حُرمت اور اس سے لگاؤ کو بنیادی اہمیت تفویض کرتے ہوئے لکھا:

"پچھلے دنوں جب ہمارا وطن ایک زبردست خطرے سے دوچار ہوا تو ہم داخلی قوّت کے حصول کے لیئے اپنی ذات میں غوطہ زن ہونے پر مجبور ہو گئے اور یکایک یہ بات ہم پر منکشف ہوئی کہ ارضِ وطن تو ایک مقدّس اثاثہ ہے جس کے ناموس کے تحفظ کے لئے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینا بھی عین سعادت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں سترہ روز کے ایک نہایت قلیل عرصہ میں حبُّ الوطنی کے صحیح مفہوم سے آگاہی ہوئی ہے اور ہم نے نظریاتی سطح سے نیچے اُتر کر زمین کی باس کو سونگھا اور اس کے لمس کو محسوس کیا ہے ــــــــ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جہت بدل گئی ہے اور اب وہ دن قطعاً دُور نہیں جب ہمارے ادب میں قریبی مظاہر، اشیاء، الفاظ، محاورں، ملکی رسوم، تہواروں اور بالخصوص اپنے وطن کے ماضی سے ایک گہرا لگاؤ بھی پیدا ہو جائے گا ــــــــ "اوراق" کے پسِ پشت بنیادی ادبی نظریہ یہی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کسی ملک کے ادب کو اس کی ثقافت اور تہذیب سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور ثقافتی ماحول، زمین کی باس، پانی، نمک اور فضا پر عناصرِ آفاقی کے عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ اوراق زمین کو اہمیت دینے میں اس لیے پیش پیش ہے کہ زمین عورت کی طرح تخلیق کرتی ہے لیکن وہ آسمان کی اہمیّت کو بھی نظر انداز نہیں کرے گا کہ آسمان اس تخلیق میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔"

(۱۸)

"اوراق" میں جس ادبی مؤقف کی تشہیر کا آغاز ہوا وہ "اُردو شاعری کا مزاج" میں پوری وضاحت کے ساتھ پہلے سے موجود تھا۔ چنانچہ جب "اوراق" کے خلاف ردِّ عمل کا آغاز ہوا تو اس کی زد میں "اوراق" اور "اُردو شاعری کا مزاج" بیک وقت آئے۔ اعتراض یہ تھا کہ "شاعرِ مشرق نے جس ارضیّت اور زمین پرستی کے خلاف شدید احتجاج کیا تھا وہ اب قوم کے ادب پسند حصّے میں سے ایک مؤثر فرقے کا مذہب ہے۔" میں نے "اوراق" میں اس

بات کی وضاحت کی کہ ہم زمین کے ساتھ آسمان کو بھی اہمیّت دینے کے قائل ہیں نیز یہ کہ وطن کے بارے میں شاعرِ مشرق کے مؤقف کی غلط تاویلات کی جارہی ہیں۔ اگر وہ ارضیّت کے خلاف ہوتے تو ارضِ پاکستان کے حصول کے لیئے کوشش کیوں کرتے وغیرہ۔ ارضیّت کے تصوّر کو مذہب کہنا بھی زیادتی تھی۔ یہ تو زیادہ سے زیادہ ایک نظریہ تھا جس کے متعدّد ابعاد تھے اور مزید ابعاد سامنے آسکتے تھے۔ ایک بات تو بالکل واضح تھی کہ "اوراق" میں ارضیّت کے جس مؤقف کو اہمیّت دی گئی وہ اشتراکی نظریۂ ارضیّت سے بالکل مختلف تھا۔"اوراق" نے اپنے تئیں صُورتِ حال کی وضاحت کی بھرپور کوشش کی۔ بہت سے ادیب "اوراق" کے ہم نوا بھی تھے۔ مگر ایک مخصوص طبقے نے بات کو عقائد کی سطح پہ لاکر مزید اُلجھا دیا۔ شدہ شدہ بات اوراق کے اداریوں سے ہٹ کر "اُردو شاعری کا مزاج" پہ مرتکز ہوگئی اور اس کتاب کے خلاف ایک طوفانی مُہم کا آغاز ہوگیا۔ بعدازاں سجّاد نقوی نے اس تُند و تیز بحث کو اپنی کتاب "اُردو شاعری کا مزاج۔ معاصرین کی نظر میں" کے صفحات میں محفوظ کرلیا مگر بحث اس کے بعد بھی جاری رہی۔

۱۹

سجّاد نقوی سے میری دوستی کا آغاز تو اُن ایّام میں ہوگیا تھا جب وہ لاہور میں کچھ عرصہ کے لیے مقیم ہوئے تھے۔ ان دنوں میں میرزا ادیب سے ملنے اکثر "ادبِ لطیف" کے دفتر میں جاتا۔ میرزا ادیب بڑی محبّت سے پیش آتے۔ بالخصوص انشائیے کو اُردو داں طبقے سے متعارف کرانے میں انھوں نے میری بھرپور مدد کی اور متعدّد اداریئے لکھ کر نہ صرف انشائیہ کے مفہوم اور مزاج کی وضاحت کی بلکہ ادبا کو انشائیہ نگاری کی طرف راغب ہونے کی تلقین بھی کرتے رہے۔ مگر وہ زمانہ اُردو انشائیہ کے بچپن کا زمانہ تھا ـــــــ مشکور حسین یاد کے سوا کسی اور نے اس کارواں میں شریک ہونے کی کوشش نہ کی۔ بعدازاں مشتاق قمر اور ان کے بعد جمیل آذر نے صحیح معنوں میں انشائیے لکھے۔ مگر یہ انشائیے "ادبِ لطیف" کے بجائے "اوراق" اور دیگر رسائل میں شائع ہوئے۔ تاہم انشائیہ فہمی کے سلسلے میں مرزا ادیب صاحب نے اُن دنوں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ایک روز ان کے دفتر میں

سجّاد نقوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں پہلی ہی ملاقات میں اُن کی طبعی شرافت اور دوٹوک بات کرنے کے انداز سے متاثر ہوا۔ میرے لئے ان دو صفات کا یکجا ہونا ایک انوکھی بات تھی۔ کیونکہ طبعی شرافت بالعموم انسان کو ان تاثرات کے برملا اظہار سے روکتی ہے جن کے بارے میں اُسے گمان ہو کہ وہ دوسروں کی طبیعت پر گراں گزریں گے۔ مگر سجاد نقوی انتہائی ملائم اور شائستہ لہجے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے۔ لاہور کے بعد وہ کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج جھنگ میں بطور لائبریرین کام کرتے رہے، پھر ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ سرگودھا آ گئے۔ گویا سرگودھا میں وہ اور میں تقریباً ایک ساتھ وارد ہوئے تب سے اب تک وہ سرگودھا میں ہیں۔ پہلے لائبریرین تھے، پھر لیکچرر ہو گئے اب کئی سالوں سے میرے ساتھ "اوراق" کے مدیر ہیں۔ انتہائی مخلص اور با اعتماد دوست ہیں۔

سرگودھا میں سجّاد نقوی کی وساطت سے انور سدید سے ملاقات ہوئی۔ ان کے نام اور کام سے تو میں پہلے سے واقف تھا مگر جب ملاقات ہوئی تو مجھے ان کی صلاحیتوں کا کچھ اندازہ ہوا۔ میری ان کی دوستی کا آغاز کب ہوا، اس کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ بعض دوستیاں ایک دھماکے سے شروع ہوتی ہیں اور دھماکے ہی پر ختم ہو جاتی ہیں۔ میں اس قسم کے تجربات سے بار بار گزر چکا ہوں۔ مگر انور سدید سے دوستی کا علم مجھے اس وقت ہوا، جب یہ دوستی پروان چڑھ چکی تھی۔ یہ دوستی اس بیج کی طرح تھی جس نے کسی نہ کسی طرح میرے دل کے اندر اپنی جڑیں اتار لی تھیں مگر مجھے اس بات کی خبر تک نہ ہوئی تھی۔ پھر یہ بیج ایک پودے میں منتقل ہو کر آہستہ آہستہ بڑھتا رہا تا آنکہ ایک چھتنار میں تبدیل ہو گیا۔ اچانک ایک روز مجھے محسوس ہوا کہ کوئی ہستی سُورج کی تیز شعاعوں سے مجھے بچائے کھڑی ہے۔ بس اسی وقت مجھ پہ اس انوکھی دوستی کا انکشاف ہوا۔

انور سدید کسی زمانے میں افسانے لکھا کرتے تھے۔ افسانہ نگاری میں انھوں نے نام بھی پیدا کر لیا تھا مگر پھر نہ جانے کیوں افسانہ نگاری سے ہاتھ کھینچ لیا۔ جب ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ ان کا اصلی میدان تنقید ہے۔ سو میں نے انھیں بعض کتابوں پر تبصرے لکھنے کے لئے کہا اور جلد ہی میں نے دیکھ لیا کہ ان کی تنقید

میں گہرائی اور توازن اور ان کے اسلوبِ تنقید میں بلا کی روانی اور تازگی تھی۔ انھیں دنوں میں نے انھیں مولانا صلاح الدّین احمد کے اسلوب پر ایک مضمون لکھنے کے لئے کہا۔ چند روز کے بعد جب انھوں نے یہ مضمون لاکر دیا اور میں نے اسے پڑھا تو دنگ رہ گیا۔ مضمون انتہائی خوبصورت تھا۔ میں نے اسے اوراق میں شائع کیا اور یہ شائع ہوتے ہی مشہور ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب "اُردو شاعری کا مزاج" کے خلاف کئی سطحوں پر مہمات شروع ہو چکی تھیں۔ ایسے حالات میں سجاد نقوی کے علاوہ انور سدید نے بھی میرے مؤقف کی حمایت کی۔ یوں مجھے ایک ہنگامہ دار دَور میں دو انتہائی پُرخلوص اور با اعتماد ساتھی میسّر آ گئے۔

۲۰

مگر انھیں دنوں میں شخصی سطح کے متعدد بُحرانوں کی زد میں آ چکا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں جب مولانا صلاح الدّین کا اچانک انتقال ہوا تو میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے اس قدر عزیز تھے۔ جب کوئی چیز چھننے لگے یا چھن جائے تو احساسِ زیاں کی گہرائی اور شدّت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک صبح میرے چچا زاد بھائی امجد آغا نے (جو خود بھی اب اس دُنیا میں نہیں ہیں) مجھے منٹگمری (ساہی وال) سے ٹیلی فون پر اس حادثہ کی اطلاع دی۔ تھوڑی دیر کے بعد لاہور سے وجیہہ الدّین احمد نے مجھے ٹیلیفون کیا۔ پھر میں نے سرگودھا سے لاہور تک جو سفر کیا اُسے میں کوشش بھی کروں تو اپنے دل سے کھُرچ نہیں سکتا۔ آنسوؤں میں بھیگا ہوا یہ سفر ایک لق و دق صحرا کا سفر تھا۔ قطعاً بے سمت اور بے منزل! مجھے محسوس ہوا تھا جیسے میرے جسم کا ایک حصّہ کٹ گیا ہے۔ اور میں مفلوج ہو کر رہ گیا ہوں۔ کئی ماہ تک میں اس کیفیت سے خود کو باہر نہ لا سکا۔ پھر کچھ سنبھلا تو میری والدہ وفات پا گئیں۔ یہ ۲۴ اپریل ۱۹۶۶ء کا واقعہ ہے۔ میں باہر مردانے میں بیٹھا تھا کہ سلیم نے پھُولے ہوئے سانس کے ساتھ مجھے آکر بتایا کہ دادی اماں فوت ہو گئی ہیں۔ میرا دل دَھک سے رہ گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور چند قدم ان کے کمرے کی طرف چلا بھی مگر پھر رُک گیا۔ میں نے سوچا میں اب کہاں جا رہا ہوں! ماں تو گھر کے اندر رہی ہی نہیں وہ تو جسم کی قید سے نکل کر پوری کائنات

میں پھیل گئی ہے۔ سو میں ہولے ہولے چلتا اپنے رفیقِ دیرینہ یعنی گاؤں کے سب سے بوڑھے برگد کے سائے میں آکر بیٹھ گیا۔ اُس وقت مجھے محسوس ہوا جیسے میں اپنے سارے ماضی سے کٹ گیا ہوں اور اس دُنیا میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ ساتھ ہی یہ احساس بھی تھا کہ وہ درخت جس کے سائے میں مجھے محبّت اور سکون کی دولت ملتی تھی، اچانک گر گیا ہے اور چند ہی لمحوں میں وہ سارے پنچھی اُڑ جائیں گے جنھوں نے اس درخت کے پتّوں میں بسیرا کر رکھا تھا۔ بعد ازاں واقعی ایسا ہی ہوا۔ ماں گھر کا مرکزی نقطہ تھی۔ وہ نہ رہی تو گھر کیسے باقی رہ سکتا تھا۔

میں نے اُس روز اور پھر اُس سے اگلے روز وہ نظم لکھی جو بعد ازاں "ماں" کے عنوان سے شائع ہوئی اور پھر بار بار شائع ہوتی رہی۔ دراصل ماں سے انقطاع میرا ہی نہیں ہر شخص کا مسئلہ ہے۔ ہم کہ اپنی اپنی ماں کے جسم کا ایک حصّہ ہیں، پیدائش کے بعد بھی ماں کا ایک اٹوٹ انگ ہی بنے رہتے ہیں۔ پھر جب ماں رخصت ہو جاتی ہے تو ہم بظاہر اُسے قبر کے حوالے کر دیتے ہیں لیکن دراصل اُسے اپنے دل میں دفن کرتے ہیں جہاں وہ کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ "زندہ" ہو جاتی ہے۔ سو انسان کے لیے ماں سے منقطع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا بھی یہی حال رہا ہے۔ ماں کا وجود میری نظموں اور انشائیوں میں بار بار رُوپ بدل بدل کر اُبھرتا رہا ہے اور ایک CONCEPT کے طور پر میرے ادبی نظریات کی تشکیل میں بھی صرف ہوا ہے۔ مگر اُس روز جب ماں فوت ہوئی تو زیاں کا احساس ہی غالب ترین احساس تھا۔ میری نظم "ماں" کی بُنت میں زیاں کے اس احساس کو بآسانی دیکھا جا سکتا ہے:

وہ برگد کا اک پیڑ تھی
جس کی مانوس، گہری، خنک چھاؤں میں
ہم نے عمریں بتائیں
وہ مخمل کا اک نرم چھتنار تھی
جس کے پتّوں میں چھُپ کر

مہکتی ہوئی دُودھیا شاخ کو تھام کر
ہم نے میٹھی سی راحت کا انعام پایا
وہ پتّوں کے پنکھے سے
شاخوں کی لوری سے ہم کو سُلاتی رہی
مُسکراتی رہی

اور پھر ایک دن
اک بگولا اٹھا
پیڑ جڑ سے اکھڑ کر پرے جا پڑا
اور چھتنار کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے سارے پنچھی
بھیانک سی چیخوں کے کہرام میں اُڑ پڑے، ——— آسمان کی طرف!
پھر بکھرتے گئے چار سو! (پہلا رُوپ)

○

خموشی کے اس زرد لمحے سے پہلے
یہ محسُوس ہوتا تھا جیسے
کوئی غمزدہ، بے نشاں چاپ
میرے تعاقب میں
اک نرم جھونکے کی صُورت چلی آ رہی ہے
کوئی ہے ——— جو میرے عقب میں
محبّت کی نمناک خوشبو بکھیرے
اُمڈتے ہوئے تیز شُعلوں سے مجھ کو بچائے
میرے ہر قدم کی سلامت روی کے لئے

التجائوں، دعاؤں کی برکھا میں خود کو بھگوئے
میرے سر پر آنچل کا سایہ کئے
آ رہا ہے

اور اب دفعتاً
غم زدہ بے نشاں چاپ رُک سی گئی ہے
تو لاکھوں بپھرتے قدم، انگنت تُند دھارے
جو دبکے پڑے تھے
عقب سے اُبھر کر
میری سمت تیزی سے بڑھنے لگے ہیں
جھپٹتے، لپکتے ـــ چلے آ رہے ہیں۔ (دوسرا رُوپ)

(۱۹۶۶ء)

میں نے نظم کے آخری حصّے میں جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ بھی آگے چل کر درست ثابت ہوئے۔ میرے عزیزوں نے نجی سطح پر اور ''کرم فرماؤں'' نے ادبی سطح پر میرے خلاف ایک ایسی مہم شروع کی جو دل دُکھانے والے اقدامات اور فحش ہجویات سے لے کر اہانت آمیز مضامین تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ میرے خلاف سرگوشیوں میں لپٹی ہوئی کردار کُشی کی ایک مہم کا بھی آغاز کر دیا گیا۔ جس میں بائیں بازو کے ادبا کے ساتھ دائیں بازو کے ادبا نے بھی حصّہ لیا۔ بعض اوقات میں اِس صورتِ حال سے محظوظ بھی ہوتا تھا۔ ایک بار میں نے انور سدید سے کہا کہ کم از کم میرے معاملے میں ادبا اپنے نظریاتی اختلافات کو بُھلا کر اپنے ''مشترکہ دشمن'' کی سرکوبی کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع تو ہوئے ہیں۔ آپ دائیں اور بائیں بازو کے ادبا کے اس اشتراکِ باہم کا کریڈٹ مجھے دیجئے نا! مگر انور سدید اس معاملے میں بہت زیادہ سنجیدہ تھے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتے تھے۔ میرا خیال یہ تھا کہ ہم حریفِ بذلہ تو بن سکتے ہیں، حریفِ دشنام ہرگز نہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ میدانِ

جنگ سے پسپا ہوکر گوشۂ عافیت میں دبک جائیں اور خاموشی سے اپنا ادبی کام کرتے رہیں۔ چنانچہ میں نے کچھ عرصے کے لئے "اوراق" کا سلسلۂ اشاعت بھی روک دیا اور ادب کی دُنیا سے ایک بڑی حد تک خود کو منقطع بھی کر لیا مگر "ادب کی دُنیا" نے مجھ سے منقطع ہونا پسند نہ کیا۔ چنانچہ جو طوفانی مُہم میرے نظریات نیز میری ذات کے خلاف شروع کی گئی تھی وہ "ہدف" کے منظرِ عام سے غائب ہو جانے کے باوجود اپنی جگہ قائم رہی۔

(۲۱)

"اُردو شاعری کا مزاج" لکھتے ہوئے مَیں نے ثنویّت کے تصوّر کو اساسی حیثیّت تفویض کی تھی۔ میرے بعض دوستوں نے کہا کہ ثنویّت کا تصوّر تو خاصا پیش پا افتادہ ہے۔ لہٰذا اسے اساسی حیثیت نہیں ملنی چاہئے۔ میں نے وضاحت کی کہ مَیں ثنویّت کے اُس قدیم تصوّر تک خود کو محدود نہیں کر رہا جس کے مطابق اضداد OPPOSITES میں کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی جیسے مثلاً روشنی اور تاریکی یا اہرمن اور اہرمز کا تضاد جس نے افلاطون کے ہاں اعیان کو حقیقی اور موجود کو محض اس کا سایہ قرار دینے کی صُورت اختیار کی تھی۔ اور یہ تفریق کسی نہ کسی طرح کانٹ کے نظریات تک پھیلی ہوئی صاف نظر آتی ہے۔ فلسفے میں اس ثنویّت کے دو پہلوؤں میں ایک کے لئے جوہر ESSENCE اور دوسرے کے لئے موجود EXISTENCE کے الفاظ رائج رہے ہیں۔ ویدانت اور تصوّف نے بالخصوص جوہر کو مقدّم اور موجود کو ثانوی حیثیت دی ہے بلکہ اسے مایا یا فریب گردانا ہے۔ خود میری زندگی میں "مَن و تُو" کا جو احساس اُبھرا تھا۔ وہ بھی "مَیں" اور "تُو" کے بنیادی فرق ہی کا غمّاز تھا۔ میری بعض نظموں میں یوں محسوس ہوتا جیسے دونوں فریق ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں۔ مگر پھر ۱۹۶۳ء کے لگ بھگ مَیں نے ایک نظم "نیا سال" لکھی جس میں ایک ایسی ہستی اُبھری ہوئی نظر آئی۔ جس کے دو چہرے تھے ایک سامنے کی طرف نگراں تھا۔ دوسرا عقب کو دیکھ رہا تھا ؎

شام، بُجھتی شام تیرے سامنے　　　صُبح، ہنستی صبح میرے رُوبرو

اس وقت تو مجھ پر اس نئے تصوّر کی معنویت اُجاگر نہ ہوسکی۔ مگر بعد ازاں جب میں نے کیسرر CASSIRER کی کتاب MYTH OF THE STATE پڑھی جس میں DIALECTICS کی توضیح کرتے ہوئے مصنّف نے دیوتا JANUS کا ذکر کیا تھا جس کا ایک چہرہ سامنے کو اور دوسرا عقب کو دیکھتا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ ۱۹۶۳ء میں جب مَیں نے "نیا سال" لکھی تو میرے اندر "مَیں اور تُو" کا یہی نیا رشتہ اُبھر آیا تھا۔ یعنی پہلے وہ ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ اب ایک دوسرے سے جُڑ گئے تھے۔ البتہ ان کے چہرے مخالف سمتوں کو دیکھنے لگے تھے۔ پچھلے دنوں آرتھر کوئسلر ARTHUR KOESTLER کی کتاب GHOST IN THE MACHINE پڑھنے کا اتفاق ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ کوئسلر نے JANUS کے اسی تصوّر کو اپنے بنیادی تھیسس یعنی HOLON کے نظریے کے سلسلے میں استعمال کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ جنوری کے مہینہ کا نام ہی JANUS پر ہے۔ وجہ یہ کہ جنوری کا مہینہ نئے سال کو بھی دیکھ رہا ہوتا ہے اور پُرانے سال کو بھی! مجھے یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کیونکہ ARTHUR KOESTLER کی کتاب کا مطالعہ کرنے سے تقریباً بیس برس پہلے میری نظم میں جو امیج اُبھرا تھا وہ JANUS اور جنوری ہی کا امیج تھا اور مَیں نے نظم کا عنوان بھی "نیا سال" ہی تجویز کیا تھا مقصود کہنے کا یہ ہے کہ میں ثنویت کو اب متحرک حالت میں دیکھنے لگا تھا۔ انہیں دنوں میں نے ہیگل HEGEL کا فلسفہ پڑھا اور ثنویت کا ایک نیا رُوپ میرے سامنے آگیا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اگر میں اپنے باطن کی دُنیا میں پہلے سے اس تصوّر کو قبول نہ کرچکا ہوتا تو میرے لیے ہیگل کے نظریے کے بنیادی سٹرکچر کو قبول کرنا بے حد مشکل ہوتا۔

ہیگل کا نظریہ یہ تھا کہ ثنویت کے ایک بازو کو سچّا اور دوسرے کو جھوٹا کہنا یا اس بات کا اظہار کرنا کہ دونوں ازلی اور ابدی طور پر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں۔ اور ان کا وصال ناممکن ہے، صحیح نہیں ہے۔ دراصل مسئلہ اخلاقیات کا بھی تھا۔ ہیگل کے زمانے تک خیر اور شر کے بُعد القطبین کو اُجاگر کرنے پر زور دیا جاتا تھا۔ ہیگل نے خیر کے ساتھ شر کی حقیقت کو تو تسلیم کیا لیکن یہ بھی کہا کہ دونوں حقیقتیں ایک دوسری میں PENETRATE

بھی کرتی ہیں۔ افلاطون سے کانٹ تک معروضی دُنیا سے فرار حاصل کر کے ایک نہایت بلند اور ارفع دُنیا میں چلے جانے کو اہمیت ملی تھی۔ مگر ہیگل نے معروضی دُنیا کو اہمیت دی اور کہا کہ آب و گل کے اس جہان ہی میں موجود اور جو ہر ایک دوسرے سے متصادم ہوتے، ایک دوسرے سے ملتے اور پھر جُدا ہو جاتے ہیں مگر یہ جُدائی ایک نئے ملن کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ گویا اس نے تصادم اور آویزش اور اس کے نتیجے میں ملاپ SYNTHESIS کو مرکزی اہمیت دی۔ میرے لئے ہیگل کا یہ نظریہ ایک "روزن" تھا، جس میں سے میں اُردو شاعری کی پوری ثقافتی تاریخ اور اس کے مدّوجزر کو بآسانی دیکھ سکتا تھا۔ ہیگل نے مذہب اور تاریخ نیز TIME اور ETERNITY کو یکجا کیا تھا۔ میں نے شاعری اور تاریخ کو یکجا دیکھنے کی کوشش کی تاہم تاریخ کے معاملے میں صرف ثقافت کی تاریخ ہی کو پیشِ نظر رکھا کیونکہ میں اسی کو بنیادی شے سمجھتا تھا۔ جب کتاب چھپی تو ایک روز عارف عبدالمتین صاحب نے (جو اُن دنوں میرے ساتھ اوراق کے مدیر بھی تھے) مجھ سے پوچھا کہ میں نے "اُردو شاعری کا مزاج" میں DIALECTICS کا استعمال تو کیا ہے مگر مارکس MARX کے نظریے کا حوالہ نہیں دیا۔ کیوں؟ عارف صاحب ترقی پسند نظریات کے حامی تھے اور مجھے ان کے نظریاتی جھکاؤ کا علم تھا تاہم میں نے کہا کہ ہیگل کی DIALECTICS ہی اصل اور بنیادی نظریہ ہے۔ جس کے مبلّغین میں سے بعض نے اسے بائیں بازو کے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے اور بعض نے دائیں بازو کے مقاصد کے لئے۔ یعنی ایک طرف مارکسی ہیں اور دوسری طرف نیشنل سوشلسٹ! تاہم دونوں نے ہیرو پرستی اور آمریت پسندی ہی کو اپنا مذہب بنایا ہے۔ دراصل مجھے ہیگل کے نظریے کے سیاسی مضمرات سے کوئی غرض نہیں تھی اور مجھے اس کی بہت سی دوسری باتوں سے بھی اختلاف تھا مگر مجھے وہ سٹرکچر پسند آیا تھا جو تھیسس، انٹی تھیسس اور سینتھیسس THESIS ANTI-THESIS SYNTHESIS سے مل کر مرتب ہوا تھا اور جسے ہیگل کے نظامِ فکر میں اساسی حیثیت حاصل تھی۔

ہیگل نے DIALECTICS کا جو تصور پیش کیا تھا اس میں ہر "قدم" کے بطون میں سابقہ تمام

قدم مضمر تھے۔ کوئی اچانک تبدیلی وجود میں نہیں آتی تھی اور تسلسل میں کوئی شے رخنہ انداز نہیں ہوتی تھی۔ دو متضاد حقیقتیں جب ایک دوسری سے متصادم ہو کر یکجا ہوتی تھیں تو دونوں کے اوصاف ایک دوسری میں ضم ہو جاتے تھے۔ یوں دیکھئے تو سینتھیسس کی حیثیت انضمام کی تھی۔ یہ اجزا کی حاصل جمع کا دوسرا نام تھا۔ "اُردو شاعری کا مزاج" میں تصادم اور انضمام کا یہ نظریہ کارفرما نظر آتا ہے۔ جب آریا اور دراوڑ ایک دوسرے سے متصادم ہوئے اور پھر ایک دوسرے میں ضم ہو گئے تو اس کے نتیجے میں گیت کو فروغ ملا۔ اسی طرح جب مسلمان آئے اور ایک نئی آمیزش نے جنم لیا تو اس کے نتیجے میں غزل کو اور جب مغربی تہذیب ہندوستانی تہذیب سے ٹکرائی اور بعد ازاں دونوں میں INTER-PENETRATION ہوئی تو اس کے نتیجے میں نظم کو فروغ ملا نا ہم میں "اُردو شاعری کا مزاج" لکھتے ہوئے دو نئی باتوں سے بھی متعارف ہوا جو ہیگل کے نظامِ فکر میں مجھے نظر نہیں آئی تھیں۔ پہلی تو یہ کہ جب دو تہذیبیں یا عناصر آپس میں ٹکراتے ہیں تو کچھ عرصہ کے لیے پیچھے ہٹنے کا عمل وجود میں آتا ہے۔ مراد یہ کہ وہ متصادم ہو کر پھر گھل مل کر ایک "تکبیری صُورت" کو وجود میں لانے سے پہلے ایک اور حالت سے گزرتی ہیں۔ دوسری یہ کہ اس حالت میں سے ایک جست وجود میں آتی ہے جو اچانک بھی ہوتی ہے اور زوردار بھی۔ ویسے بھی جب کوئی زقند لگاتا ہے تو پہلے اپنے جسم کو پیچھے کی طرف لے جاتا ہے۔ پھر آگے کو لپکتا ہے۔ بے شک "اُردو شاعری کا مزاج" میں میں نے تہذیبوں کی آویزش اور پھر امتزاج کو اہمیت دی مگر اس سارے مطالعہ کے دوران میں "پیچھے ہٹنے" اور "پھر جست بھرنے" کے ان ڈوپرا اسرار اعمال کو بار بار مَس کرتا رہا۔ اُس وقت تو مجھے اس بات کا پوری طرح احساس نہ ہو سکا مگر آج میں جانتا ہوں کہ میں قطعاً غیر شعوری طور پر "تخلیقی عمل" کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

۲۲

"اُردو شاعری کا مزاج" ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی اور "تخلیقی عمل" ۱۹۷۰ء میں۔ پانچ سال کے اس درمیانی عرصہ میں میں نے زیادہ تر متفرق چیزیں ہی تخلیق کیں۔ میرا حال اُس نابینا شخص کا سا تھا جو اندھیرے میں اشیا کو ٹٹول ٹٹول کر اپنے لئے راستہ بنا رہا ہو۔ مجھے نئی نئی چیزوں کا

لمس تو حاصل ہو رہا تھا مگر کوئی روشن تصویر نہیں بن رہی تھی۔ تخلیقی عمل کے مدارج کو ملحوظ رکھیں تو یہ ایک طرح کا INCUBATION کا دَور تھا جس میں تخیلات پَروں کی ہلکی سی گرمی میں ہولے ہولے خود کو متشکل کر رہے تھے۔ میں نے اس عرصے میں کچھ تو انشائیے لکھے جو میرے انشائیوں کے مجموعے "چوری سے یاری تک" میں شامل ہو گئے، کچھ تنقیدی مضامین لکھے جو "تنقید اور احتساب" میں یکجا کر دیے گئے۔ مگر ان کے علاوہ میں نے متعدد نظمیں بھی لکھیں جو میرے دوسرے شعری مجموعہ "دن کا زرد پہاڑ" کے تحت ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئیں۔ ان نظموں میں سے دو یعنی "لاوا" اور "اندھی کالی رات کا دھبّہ" مجھے خاص طور پر بہت عزیز تھیں۔ وجہ یہ کہ ان کا نہایت گہرا تعلق باہر کی زندگی کے بعض واقعات اور ان کے نتیجے میں میرے اندر پیدا ہونے والے احساسات کے مدّوجزر سے تھا۔ "لاوا" کی تخلیق کی محرّک اسرائیلی جارحیت تھی۔ اسرائیلیوں نے جس بے رحمی اور سنگ دلی کا مظاہرہ کیا تھا اس نے نازیوں کی یاد تازہ کر دی تھی۔ انہوں نے نہ صرف فلسطینیوں کو بے گھر کر کے ان کا مستقبل تاریک کر دیا تھا بلکہ ان کے کیمپوں پر لگاتار بمباری کر کے فلسطینی بچّوں اور عورتوں کا قتلِ عام بھی کیا تھا۔ یہی نہیں انھوں نے فلسطینیوں کے حق میں آواز اٹھانے والے ملکوں بالخصوص شام اور مصر کو بھی اپنی جارحیت کا نشانہ بنایا تھا۔ میں اخبارات میں یہ سب کچھ پڑھتا تو محسوس کرتا کہ میں خود وہ فلسطینی ہوں جسے پرومیتھس کی طرح پہاڑ کی ایک چٹان کے ساتھ زنجیروں کی مدد سے جکڑ دیا گیا ہے اور ایک وحشی پرندہ بلا روک ٹوک میرے جسم سے گوشت کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہا ہے۔ انہی دنوں اسرائیل کے کسی سیاست دان نے (ٹھیک سے نام یاد نہیں) کچھ اس طرح کا بیان دیا جیسے کہہ رہا ہو کہ اسے فلسطینیوں کے ساتھ ہمدردی ہے۔ یہ بیان مگرمچھ کے آنسو بہانے کی ایک صورت تھی۔ مجھے یہ بیان پڑھ کر بہت تکلیف ہوئی۔ میں سوچنے لگا کہ ظالم، ظلم بھی کرتا ہے مگر ساتھ ہی آنسو بہا کر اپنی دردمندی سے ساری دنیا کو متاثر کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ عجیب بات ہے! کئی روز تک میں ایک انوکھے کرب میں مبتلا رہا۔ پھر اچانک نظم "لاوا" تخلیق ہوئی تو مجھے اس کرب سے رہائی ملی۔ نظم یہ تھی:

فضاؤں میں اُڑتے ہوئے تُو نے دیکھا

میں اِک بانجھ پتّھر پہ ریشم کی ڈوری میں جکڑا پڑا تھا
مرے گرد تازہ لہو کی گھنی بُو نے
اک دائرہ بُن لیا تھا!
مجھے تُو نے دیکھا
تو اپنی مُڑی چونچ کھولی
پروں کو سمیٹا
بھیانک سا اِک قہقہہ
گرم لاوے کی صُورت ڈھلانوں سے لڑھکا
جلی گھاٹیوں میں مچلنے لگا
راستے راکھ سے اَٹ گئے
بوڑھے سُورج کی ٹوٹی ہوئی قاش پر
سُرخ آندھی کی بے حس ردا تن گئی
وقت پتھرا گیا۔

سُنا ہے تُو اب کہہ رہا ہے
ترے دل میں ٹھہرا ہوا آنسوؤں کا سمندر
تری آنکھ کے سنگِ لرزاں سے چشمے کی صُورت اُبلنے لگا ہے
سُنا ہے ——— مگر تُو نہیں جانتا ہے
مرے جسم پر تُو نے جو گرم لاوا انڈیلا تھا
اب منجمد ہو چکا ہے!!

(۲۳)

دوسرا واقعہ ۱۹۶۸ء کا ہے جب انسان نے پہلی بار چاند پر قدم رکھا۔ چاند پر قدم

رکھنا بیک وقت ایک بہت بڑی انسانی فتح بھی تھی اور میری نظروں میں ایک المیّہ بھی۔ فتح یوں کہ کائنات میں پیش قدمی کرنے کے لیے انسان نے چاند کو زینے کے پہلے قدم کے طور پر استعمال کیا تھا۔ المیّہ یوں کہ چاند کے ساتھ وابستہ ایک پُراسرار دُنیا آنِ واحد میں ملیا میٹ ہو گئی تھی۔ میرے لیے چاند ماں کا رُوپ تھا۔ میں نے اپنا سارا بچپن اس کی بیسمیں اُنگلی تھام کر گزارا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب پہلی کا چاند طلوع ہوتا تو میری والدہ اُسے دیکھتے ہی آنکھیں بند کر لیتیں اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر دُعا پڑھتیں۔ پھر اسی حالت میں مجھے آواز دیتیں اور کہتیں کہ میرے سامنے آ کر کھڑے ہو جاؤ۔ میں سامنے آ کھڑا ہوتا تو اپنی آنکھیں کھولتیں تاکہ سب سے پہلے ان کی نظریں مجھ پر پڑیں۔ (یوں لگتا جیسے وہ مجھے کوئی متبرک شے سمجھتی نہیں) پھر وہ اپنے مُنہ پر پانی کے چھینٹے مار کر سیدھے ہاتھ کی اُنگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی کے یاقوت میں جھانکتیں۔ اس کے بعد چاروں طرف نظر دوڑاتیں۔ یہ ایک انوکھا RITUAL تھا جس سے وہ اور میں ہر قمری ماہ کی پہلی تاریخ کو گزرتے۔ سو میرے لیے چاند اور ماں یک جان دو قالب تھے اور میں بستر پر لیٹا گھنٹوں چاند کے چہرے سے چھٹے ہیولوں کو دیکھتا رہتا۔ میرے لیے یہ سب کچھ بے حد پُراسرار تھا۔ پھر جب ۱۹۶۸ء میں انسان نے چاند پر قدم رکھا اور چاند مجھے ایک پُراسرار آئینے کے بجائے ایک ڈولتا پہیّہ، "کالی اندھی رات کا دھبّہ" اور ایک کھوٹا سکّہ نظر آیا تو میرے تخیّل کا سارا رنگ محل آنِ واحد میں پاش پاش ہو گیا۔ اور اس کی جگہ ایک سپاٹ اور بے رحم دنیا نے لے لی۔ یہ گویا زندگی کی پُراسراریت پر کاری ضرب لگنے کا ایک ایسا واقعہ تھا جس نے مجھے از سر تا پا جھنجوڑ دیا۔ انھی دنوں میں نے اپنی نظم "اندھی کالی رات کا دھبّہ" لکھی اور یوں اپنے احساسِ زیاں کو گرفت میں لینے کا اہتمام کر لیا۔ نظم یہ تھی:

اونچی نیچی دیواروں میں گھرے ہوئے
تم اتنے ہراساں، اتنے تنہا
پہلے کب تھے؟

جاؤ، پھر سے کھاٹ پہ لیٹو
ٹکٹکی باندھ کے اُس کو دیکھو
کتنا بے بس، کتنا بھیانک، کتنا تنہا!
ڈولتا پہیّہ، کھوٹا سکّہ، اندھی کالی رات کا دھبّہ
تم نے اس دھبّے کو اب تک پیشانی کی شوبھا سمجھا
اور اب خالی برتن بن کر چیخ رہے ہو!

بولو، اپنے ہونٹوں پہ کوئی شبد سجاؤ
منتر جاپو، ہاتھ اٹھا کر پڑھو دُعائیں
چہرہ دھو کر، سیدھے ہاتھ کی اُنگلی کے یاقوت میں جھانکو
بولو تم نے کیا دیکھا ہے؟

صدیوں تم نے اُس کو چاہا
اس کی سیمیں اُنگلی تھامی
چلنا سیکھا
اس کے ٹھنڈے نورانی چھتنار کے نیچے
گھاس پہ لیٹے
دُودھ بھری کرنوں میں نہائے
پیار بھری آنکھوں میں جھانکا!

اور اب کیا ہے؟
اک نقطہ، اک ڈولتا پہیّہ، اندھی کالی رات کا دھبّہ
نیست کا پیکر، بے رنگی کا منظر، تنہا!

اس کو اب تم کیا دیکھو گے
دیکھا بھی تو
اپنے ہی اندر جھانکو گے !!

(۲۴)

مگر ذکر "اُردو شاعری کا مزاج" کا تھا، جس کی اشاعت کے بعد ایک جانب تو اسے مسترد کرنے کی مہم کا آغاز ہوا اور دوسری طرف بعض اہلِ نظر اس کے پُرجوش حامی بن گئے۔ نتیجتاً وہ تُندو تیز بحث وجود میں آئی جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یہ نہیں کہ میں یہ سارا عرصہ ایک "خاموش تماشائی" بنا رہا۔ بننا بھی نہیں چاہیئے تھا۔ میں نے اُردو شاعری کی پرکھ کے لیے ایک نئی تھیوری پیش کر دی تھی اور اب یہ میرا فرض تھا کہ میں اعتراضات کا جواب دیتا۔ اور غلط فہمیوں کو دُور کرنے کے لیے اپنے نظریے کی وضاحت کرتا۔ سو میں یہ کام کرتا رہا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ میں نے ہمہ وقت "اُردو شاعری کا مزاج" سے اُبھرنے والے "تخلیقی عمل" کے سوال پر غور و فکر بھی جاری رکھا۔ اب میرا مطالعہ تہذیبوں کی آویزش سے ہٹ کر اس سوال پر مرکوز ہو گیا کہ اُس وقفے کی نوعیت کیا ہے جو دو حالتوں، تہذیبوں یا عناصر کی INTER PENETRATION کے بعد آتا ہے اور پھر یہ کہ اُس زقند کی نوعیت کیا ہے جو اس "وقفے" کے بعد نمودار ہوتی ہے ؟ کیا یہ زقند زندگی اور کائنات کی جملہ کروٹوں میں بھی مشاہدہ کی جا سکتی ہے ؟

پہلے میں نے سوچا کہ وقفے اور جست کی ان دو حالتوں کو طبعیات کے حوالے سے ایک "بنیاد" فراہم کر دوں۔ میں نے اس سلسلے میں خاصا مطالعہ بھی کیا اور بعض ایسے دوستوں سے بھی تبادلۂ خیالات کیا جنھوں نے طبعیات کا مطالعہ کر رکھا تھا، مگر جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ طبعیات ایک بھاری پتّھر ہے۔ میں نے اسے اٹھا بھی لیا تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ میں کہیں نہ کہیں لڑکھڑا کر گر پڑوں گا اور تخلیقی عمل پر میرا کام نا تمام رہ جائے گا۔ سو میں نے اس کے بجائے حیاتیات کا مطالعہ کیا اور جلد ہی

مجھے تقلیب MUTATION کا وہ تصوّر مل گیا جو حیاتیاتی ارتقا میں ایک "زقند" کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسانی دماغ کے بارے میں بھی مجھے یہ علم ہوا کہ وہ ڈوایوانی ہے اور اس کا دوسرا ایوان جو "نیا دماغ" کہلاتا ہے اور سر کے اندر بائیں طرف موجود ہے "اچانک" وجود میں آیا تھا۔ چونکہ مجھے اس بات کا علم تھا کہ ہر انسانی جسم ارتقا کی پوری داستان کو دہراتا ہے لہٰذا مجھے لورین ایزلے کی یہ بات بے حد خیال انگیز نظر آئی کہ پیدائش کے وقت انسان اور گوریلے کے بچّے کے دماغوں کا حجم برابر ہوتا ہے یعنی ۳۰۰ کیوبک سینٹی میٹر! لیکن پہلے ہی سال کے اندر اندر انسان کے بچّے کا دماغ تین گنا ہو جاتا ہے جب کہ گوریلے کے بچّے کے سلسلے میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہی "زقند" زندگی کے ارتقا EVOLUTION کی کہانی میں بھی صاف طور پر پڑھی جاسکتی ہے۔ نسلیں ایک خاص رفتار سے معاشرتی دائرے کے اندر ہی پھلتی پھولتی رہتی ہیں پھر اچانک ان میں ایک انقلابی تبدیلی آجاتی ہے اور وہ ایک نئی سطح پر اُٹھ آتی ہیں۔ گویا ارتقا کا سفر نپے تلے قدموں سے نہیں بلکہ زقندوں کی صُورت میں طے ہوتا ہے اور یہ کہنا بے حد مشکل ہے کہ اگلی "زقند" کب وجود میں آئے گی؟

مگر میں جاننا چاہتا تھا کہ زقند کیوں اور کب وجود میں آتی ہے یقیناً زقند سے پہلے "پیچھے ہٹنے" کا مرحلہ تو آتا ہوگا اور پیچھے ہٹنے کے اس مرحلے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ ایک انتشار کی سی حالت وجود میں آجائے۔ انتشار کی اس حالت کی نوعیّت کو جاننے کے لیے میں نے اساطیر کا مطالعہ کیا۔ اس لیے بھی کہ اساطیر ہی انسان کی تخلیق کاری کا پہلا ثمر ہیں اور ان کے مطالعہ سے تخلیقی عمل کے مختلف مدارج کا مشاہدہ کرنا نسبتاً آسان ہے۔ اساطیر کے مطالعہ میں مجھے سب سے زرخیز تصوّر "طوفانِ نوحؑ" کی کہانی میں ملا یعنی یہ کہ طوفان اس لیے آیا کہ سابقہ زنگ آلود جہان کو ملیامیٹ کر کے ایک نئے جہان کی آمد کے لئے زمین تیّار ہو سکے۔ جب میں نے "تخلیقی عمل" لکھی تو اس بات کی وضاحت ان الفاظ میں کی:

"آبی طوفان (طوفانِ نوحؑ) کی اس کہانی کے تین پہلو خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ پہلا یہ کہ طوفانِ اس لیے آیا کہ دُنیا پر شر اور گناہ غالب آ گئے

تھے۔ اس بات کو یوں بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ ہر معین وقفے کے بعد ارتقا کی رفتار سست پڑ جاتی ہے اور انجماد مسلّط ہونا شروع ہو جاتا ہے یعنی تخلیقی عمل کا زور ٹوٹ جاتا ہے (اس سے زیادہ گناہ کی صورت اور کیا ہو سکتی ہے کہ دُنیا بانجھ ہو کر رہ جائے اور اس پر جمود اور فرسودگی پُوری طرح مسلّط ہو جائے۔) چنانچہ اس بات کی ضرورت پڑتی ہے کہ ایک نئے تخلیقی عمل سے کائنات کی تجدید ہو — دوسرا یہ کہ طوفان نے ہر پُرانی شے کو ختم کر دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نئی تخلیق کے لئے سابقہ تمام صورتوں کا معدوم ہو جانا ایک ضروری شرط ہے — تیسرا یہ کہ جب طوفان میں سے ایک نئی ہستی نے جنم لیا تو وہ اپنی سابقہ صورت اور حیثیت سے کہیں زیادہ حسین اور ارفع تھی۔ مندرجہ بالا کہانی میں صاف درج ہے کہ دیوتاؤں نے آبی طوفان کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ "شہر بہت پُرانا ہو گیا تھا" یا "دُنیا شر میں ڈوب چکی تھی"۔ پھر جب طوفان آیا تو اس میں اور سب کچھ تو فنا ہو گیا مگر "زندگی" کا تخم باقی رہا۔ نوحؑ کی کشتی دراصل ایک بیج کی طرح تھی کہ اس میں جوڑوں کی صورت میں قوّتِ نمو کا وہ سارا خزینہ موجود تھا جس سے آئندہ نسلوں کو وجود میں آنا تھا۔ طوفانی سمندر کی سطح پر زندگی کا یہ "بیج" تیر رہا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ طوفانی ہواؤں کے تھپیڑے کھا کھا کر اپنے باسی پن، کہنگی اور انجماد سے دست کش ہو رہا تھا۔ چنانچہ جب طوفان تھم گیا تو کہانی کے مطابق اس بیج میں ایک نئی شکتی پیدا ہو گئی۔ حیاتیات کی زبان میں یوں کہا جائے گا کہ یہ تقلیب یعنی MUTATION کی ایک صورت تھی کہ اس نے بیج کی نسل ہی کو بدل کر رکھ دیا۔

"اُردو شاعری کا مزاج" میں مَیں نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ دو مخالف قوتیں ایک دوسری سے متصادم ہوتی ہیں اور پھر ایک تیسری صورت میں بدل جاتی ہیں۔ تخلیقی عمل تک پہنچتے پہنچتے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ پہلے انجماد یا خلا پیدا ہوتا ہے جو مخالف

قوتوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے بعینہٖ جیسے ہوا کا دباؤ کم ہوجائے تو باہر سے ہوائیں اُمڈ آتی ہیں اس کے بعد طوفان کا مرحلہ آتا ہے جس میں مخالف قوتیں ایک دوسری سے ٹکراتی ہیں اس کے بعد انتشار (CHAOS) کی صُورت جنم لیتی ہے جس میں عناصر کا تشخص تک باقی نہیں رہتا۔ پھر اس انتشار میں سے "تخلیق" ایک جست لگا کر اس طور باہر آتی ہے جیسے کائنات "عدم" کے اندر سے برآمد ہوئی تھی۔ مجھے اس سلسلے میں امرت منتھن کی کہانی نے بطورِ خاص متاثر کیا۔ سو میں نے "تخلیقی عمل" میں لکھا کہ جب وشنو کے کہنے پر منڈیر پربت کو اٹھا کر دودھ کے سمندر میں رکھا گیا اور اس کے گرد واسکی ناگ کو لپیٹ کر اُسر اور دیوتا اسے باری باری کھینچتے رہے یعنی دودھ کو بلوتے رہے تو اس کے نتیجے میں پہلے لکشمی دیوی نے درشن دیا جو حُسن اور خوش بختی کی دیوی ہے۔ پھر دھن دنتری نمودار ہوا جس کے ہاتھ میں امرت کا پیالہ تھا، جسے پی کر دیوتا دوبارہ شکتی مان کہلائے۔ میں نے مزید لکھا کہ اس کہانی کے مطابق تخلیق کا عمل چاٹی میں دودھ بلونے کے عمل سے مشابہ ہے۔ بلونے کے اس عمل میں مخالف قوتیں مل جل کر حصہ لیتی ہیں۔ پھر ایک ایسا مرحلہ آتا ہے جب دودھ کی شناخت ختم ہو جاتی ہے وہ نہ دودھ رہتا ہے نہ دہی! مگر اس کے بعد "انتشار" کے اس عالم سے اچانک مکھن سطح پر آجاتا ہے جو اساطیر کے مطابق "امرت رسیہ" کا دوسرا نام ہے۔

معاً مجھے خیال آیا کہ تخلیقی عمل کی کہانی چاک پر برتن بننے کے عمل سے بھی تو مشابہ ہے کیوں نہ اسے سمجھنے کے لیے چاک پر برتن بننے کے عمل کا مشاہدہ کیا جائے۔ سو میں اپنے گاؤں کے کمہار کے پاس پہنچا اور اس سے کہا کہ مجھے برتن بنا کر دکھائے۔ وہ بہت خوش ہوا کیونکہ پہلے کبھی کسی نے اُس سے اپنے آرٹ کا مظاہرہ کرنے کی فرمائش نہیں کی تھی۔ اسی وقت اس نے چکنی مٹی کے ڈھیر میں پانی ملا کر مٹی گوندھ لی۔ پھر اس نے پاؤں سے چاک کو حرکت دی اور لمحہ بہ لمحہ اس میں تیزی آتی گئی۔ جب وہ بہت تیز ہو گیا تو اس نے مٹی کے ایک گولے کو (جو انتشار کی صورت تھی) چاک پر رکھا اور بالکل اچانک بے ہیئت چکنی مٹی نے ایک برتن کی شکل اختیار کر لی۔ ساری صورتِ حال مجھ پر آئینہ ہو گئی۔ چنانچہ میں نے "تخلیقی عمل" میں لکھا:

"تخلیقی عمل" کی بُنت میں دو طرح کے عناصر صرف ہوتے ہیں منفعل

اور فعّال! منفعل عناصر میں وہ تمام نسلی تجربات شامل ہیں جو فن کار ورثے کے طور پر حاصل کرتا ہے ——— فعّال عناصر میں وہ سارے تجربات شامل ہیں جنھیں وہ بچپن سے اب تک حاصل کرتا آیا ہے۔ فن کار کے باطن میں دونوں قسم کے یہ تجربات موجود ہوتے ہیں۔ پھر کوئی ایسا واقعہ نمودار ہوتا ہے جو فن کار کے سارے باطنی نظام کو جھنجوڑ ڈالتا ہے، اس قدر کہ اس کے یہ تجربات منفی اور مثبت لہروں کی طرح ایک دوسرے سے متصادم ہو کر "نراج" پر منتج ہوتے ہیں ——— فن کار جب نراج میں مبتلا ہو کر اپنے اندر اُترتا ہے تو آہنگ کا لمس اس کے باطن میں پوشیدہ تخلیقی مشین کو متحرک کر دیتا ہے اور وہ نراج یا ناموجود سے ایک ایسی نئی شے خلق کر لیتا ہے جو اسے "سانس رُکنے" کے عالم سے نجات دلاتی ہے۔ چنانچہ تخلیق مختلف اثرات یا تجربات کا آمیزہ نہیں بلکہ ناموجود سے اُبھرنے والی (یعنی جست لگا کر باہر آنے والی) ایک ایسی حقیقت ہے جو لاثانی بھی ہے اور لاشریک بھی۔ فن کار کی طبّاعی کا یہی سب سے بڑا ثبوت ہے کہ وہ ایک ایسی نئی شے کو وجود میں لاتا ہے جس کا پہلے نام ونشان تک موجود نہیں تھا۔"

ظاہر ہے کہ "تخلیقی عمل" تک پہنچتے پہنچتے میں نے ایک لمبا سفر طے کر لیا تھا۔ "اُردو شاعری کا مزاج" لکھنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ فن کار کوئی نئی چیز تخلیق نہیں کرتا بلکہ دو چیزوں کے ربطِ باہم کو "دریافت" کرتا ہے۔ "اُردو شاعری کا مزاج" میں میں نے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ دونوں چیزیں یعنی OPPOSITES آپس میں ٹکرا کر پھر مل جل کر تخلیق پر منتج ہوتی ہیں۔ تخلیقی عمل میں میرا موقف یہ تھا کہ متخالف قوّتیں آپس میں ٹکرا کر بے ہیئت ہو جاتی ہیں اور اس بے ہیئتی میں سے تخلیق ایک جست لگا کر نمودار ہوتی ہے۔ لہٰذا نہ تو وہ ایک ایسی موجود حقیقت ہے جسے فن کار نے دریافت کیا ہے اور نہ وہ محض مختلف چیزوں کا آمیزہ ہے بلکہ ایک بالکل نئی چیز ہے جو اسی طرح وجود میں آئی جیسے عدم سے کائنات وجود میں آئی تھی۔

(۲۵)

"تخلیقی عمل" ۱۹۷۰ء کے آخری ایام میں منظرِ عام پر آئی۔ میرے لئے یہ سال بھی خوشی اور غم کا آمیزہ تھا خوشی کا اس لئے کہ میں نے "تخلیقی عمل" پر اپنا کام مکمل کر لیا۔ غم کا اس لئے کہ اس سال کی ابتدا میں میرے والد و۔ع۔خ وفات پا گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۹۰ برس تھی۔ وہ ذہنی طور پر بالکل چاق و چوبند تھے۔ ان کے معمولات میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بس چلنا پھرنا چھوٹ گیا تھا۔ تاہم وہ ناشتہ کے بعد پیرانہ سالی کے باوجود باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو بعض اوقات تین تین گھنٹوں تک "اپدیش" دیتے اور لوگ تھے کہ چلے ہی آ رہے تھے۔ دراصل اُن ایام میں پاکستانی معاشرہ غیر محفوظ ہونے کے عالم سے گزر رہا تھا۔ مارشل لاء نے ملک کو دوبارہ اپنے پنجوں میں جکڑ لیا تھا۔ مشرقی پاکستان کے حالات مخدوش تھے اور بھارت کی طرف سے خطرہ بڑھ گیا تھا۔ سو لوگوں کے ہاں غیر محفوظ ہونے کے احساس نے جنم لیا تھا۔ اور وہ سکونِ قلب کی تلاش میں تھے۔ و۔ع۔خ کی باتوں سے انھیں سکون ملتا تھا۔ لہٰذا وہ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ میں والد صاحب سے کئی بار کہتا کہ وہ زیادہ لوگوں سے نہ ملیں کیونکہ ہر ملاقات انھیں تھکا دیتی تھی مگر وہ کہتے کہ جب کوئی شخص سینکڑوں کوس کا سفر کر کے مجھ تک آتا ہے تو میں اسے ملنے سے کیسے انکار کر سکتا ہوں مگر میں بہرحال ان کی صحت کے بارے میں بہت فکر مند تھا کیونکہ وہ جسمانی طور پر روز بروز کمزور ہو رہے تھے۔ جنوری ۱۹۷۰ء کی پانچویں تاریخ کو انھیں ہلکا سا بخار آیا اور وہ بے ہوش ہو گئے اور بے ہوشی کی حالت ہی میں ۸ جنوری کی صبح کو رخصت ہو گئے۔ ہر چند میں ذہنی طور پر اس واقعہ کے لیے تیار تھا، مگر جب یہ واقعہ مجھے پیش آیا تو میں نے خود کو بے پتوار حالت میں پایا۔ وہ میرے گرو بھی تھے، والد بھی اور دوست بھی! جب کبھی میری زندگی میں کوئی بحران آتا تو میں فوراً ان کے پاس پہنچتا اور وہ محض چند جملوں سے مجھے شانت کر دیتے۔ مگر اب وہ نہیں تھے تو میں محسوس کر رہا تھا کہ سمندر طوفانی ہے، جہاز کا لنگر ٹوٹ گیا ہے اور ہوا نے بادبان کو تار تار کر دیا ہے۔ اس واقعہ کے تقریباً ایک ماہ بعد میں نے انور سدید کو ایک خط لکھا جس میں اپنے ان محسوسات کو بیان بھی کیا۔ بعد ازاں انور سدید نے یہ خط بھی اپنی مرتب کردہ کتاب "وزیر آغا

کے خطوط" میں شامل کرلیا۔ میں اسے دوبارہ درج کرتا ہوں:

"ایک ماہ میں آپ کے تین چار خطوط ملے مگر میں ذہنی طور پر اس قابل نہیں تھا کہ آپ کے محبت ناموں کا جواب ارسال کر سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ غم آپ کو بھی اتنا ہی ہوا ہے جتنا کہ مجھے۔ کیونکہ ان کی ذات سے آپ نے بھی ہمیشہ روشنی حاصل کی۔ مگر میرا حال یہ ہے کہ محسوس ہوتا ہے جیسے میں بھری کائنات میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ وہ نوّے برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ ذہنی طور پر میں ان کے رخصت ہو جانے کے واقعہ کے لئے بالکل تیار تھا، مگر دل دریا سمندروں ڈونگھے ہیں۔ یہ خیال نہیں تھا کہ میں خود کو رُوح کی سطح پر اس سانحہ کے لئے تیار نہیں پاؤں گا۔ ان کی وفات کے بعد بتدریج یہ احساس مجھ پر مسلّط ہوتا چلا گیا کہ مجھ میں لاکھوں برس کا بڑھاپا سما گیا ہے جیسے میں نے بڑھاپا اپنے والد سے وراثت میں لیا ہے اور تھکاوٹ میرے ہر بُنِ مو میں سرایت کر گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ احساس بھی مجھے گرفت میں لیتا چلا گیا ہے کہ مجھے ایک "بارِ گراں" منتقل کر دیا گیا ہے جسے اُٹھا کر مجھے اپنے حصّے کی مسافت طے کرنی ہے۔ یہ تو سنا تھا کہ زندگی مشعل برداروں کا ایک قافلہ ہے اور ہر شخص کو اس سفر کے دوران ایک مقرر فاصلہ شمع اٹھا کر طے کرنا ہوتا ہے۔ پھر وہ شمع اگلے مسافر کے حوالے کر کے خود سڑک کنارے ڈھیر ہو جاتا ہے۔ مگر یہ نہیں سُنا تھا کہ وہ بوجھ ڈھونے پر بھی مامور ہے۔۔۔ ــــ وہ تجربات، روایات اور ذمہ داریوں کا بارِ گراں اٹھاتا ہے اور اگلے مزدور تک پہنچا کر خود رُک جاتا ہے اور اگلا مزدور اپنے انتظار میں کھڑے مزدور تک بہ عجلت فاصلہ طے کرتا ہے۔ سو یہ مزدوری کا عمل ہے جو ازل سے جاری ہے اور شاید ابد تک جاری رہے گا۔ البتہ میری باری اب آئی ہے۔ دیکھوں میں کہاں تک اس سے عہدہ برآ ہوتا ہوں:

چلی کب ہوا، کب مٹا نقشِ پا
کب گری ریت کی وہ رِدا

جس میں جُھکتے ہوئے تُو نے مجھ سے کہا:
آگے بڑھ، آگے بڑھتا ہی جا
مُڑ کے تکنے کا اب فائدہ؟
کوئی چہرہ کوئی چاپ، ماضی کی کوئی صدا۔ کچھ نہیں اب
اے گلّے کے تنہا محافظ! ترا اب محافظ خدا!

(سفر کا دوسرا مرحلہ)

سو گلّے کے محافظ کا محافظ اب خُدا ہے۔ اس کے لیے دُعا کریں۔ والسّلام"

(۲۶)

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اپنے خاندان کے گلّے کا محافظ تو مجھے بنا دیا گیا لیکن جس گلّے میں مَیں شامل تھا اس کا محافظ اب کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سیاسی طور پر ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء کا زمانہ اہلِ وطن کے لئے انتہائی کربناک دَور تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر شے اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہی ہے۔ بے شک پاکستان کو الیکشن کے ذائقے سے آشنا ہونے کا موقع عطا ہوا تھا۔ مگر اس کے نتیجے میں قومی اتحاد کے لئے تو کجا الٹا قومی شکست و ریخت کے لئے میدان ہموار ہو گیا تھا۔ الیکشن کیا تھی ایک طرح کا فیصلہ MANDATE تھا جو مشرقی پاکستان نے پاکستان سے الگ ہونے کے لئے کیا۔ دوسری طرف اس سیاسی بحران کو سیاسی سطح پر حل کرنے کے بجائے دوسرے طریق سے حل کرنے کی کوشش کی گئی جس سے بے پناہ نفرت نے جنم لیا۔ نفرت بھی ڈریکولا کی طرح ہے۔ ڈریکولا جب اپنے "شکار" کی گردن میں اپنے دانت پیوست کر دیتا ہے تو اس کا شکار خود بھی ڈریکولا بن جاتا ہے اور یوں لمحہ بہ لمحہ ڈریکولوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے تا آنکہ نفرت دائرہ در دائرہ پھیلتی ہوئی پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ یہی کچھ ۱۹۴۷ء میں ہوا تھا اور یہی دوبارہ ۱۹۷۱ء میں ہوا۔ اس سال کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے مشرقی اور مغربی پاکستان میں جو خلیج نمودار ہوئی وہ سیاسی نوعیّت ہی کی نہیں تھی، دلوں کے درمیان بھی آ کھڑی ہوئی تھی۔ بھارت نے اس موقع سے فائدہ

اُٹھا کر اس خلیج کو مزید کشادہ کر دیا۔ بلکہ پاکستان کو ۲ دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لئے ایک اہم کردار بھی ادا کیا۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی ایک شام ہم سرگودھا شہر میں تھے کہ ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ نے زمین اور آسمان کے درمیانی خلا کو پُر کر دیا۔ یہ ایک غیر معمولی کارروائی تھی اور یقیناً کسی بُری خبر کا پیش خیمہ تھی۔ ایک ہی گھنٹے کے اندر اندر ہمیں معلوم ہو گیا کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی ہے۔ رات کو جب ہم سونے لگے تو میں نے بیوی سے کہا کہ گھر کی نچلی منزل میں جو پختہ سیڑھی ہے اس کے نیچے کی جگہ خالی کرا دیں کیونکہ رات کے دوران بھارتی ہوائی جہازوں کے حملے کا خطرہ ہے۔ اور گھر میں اس سے بہتر کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔ اس نے اُٹھ کر جگہ خالی کرا دی اور ہم سو گئے۔ رات بارہ بجے کے قریب میری نیند اچانک کھل گئی کُتّے بھونک رہے تھے۔ یوں لگا جیسے چاروں طرف کتّوں کی بھونکار ہی بھونکار ہے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ سائرن ہوا اور پھر بھارتی جہاز ہم پر منڈلانے لگے جس طرح زلزلے کی خبر انسانوں سے پہلے حیوانوں کو ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح ہوائی جہازوں کی آمد کی اطلاع انسانوں سے پہلے کتّوں کو ہو گئی تھی۔ بہرحال ہم جلدی جلدی مکان کی نچلی منزل میں سیڑھی کے نیچے گڈمڈ ہو کر بیٹھ گئے اور تا دیر توپوں اور گولوں کی آوازیں سنتے چلے گئے۔ چونکہ سرگودھا ایک بہت اہم "ہدف" تھا اس لئے ہم نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ صبح ہوتے ہی گاؤں چلے جائیں گے —— اگلی صبح ہم گاؤں جا پہنچے اور اسی رات بھارت کے ایک ہوائی جہاز نے ہمارے گاؤں کو بموں کا نشانہ بنایا۔

(۲۷)

آج تک میں اس بات کو پوری طرح جان نہیں سکا کہ ہمارے گاؤں پر بم کیوں پھینکے گئے ہو سکتا ہے کہ کسی انجان دیہاتی نے کہیں آگ تاپنے کی کوشش کی ہو اور جہاز نے اس جگہ کو نشان زد کر لیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بھارتی جہاز کا کسی پاکستانی جہاز نے تعاقب کیا ہو اور اس نے بموں سے خود کو سبک بار کرنے کی کوشش کی ہو —— زیادہ امکان دوسری بات ہی کا تھا۔ اس وقت ہم سب اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ اچانک کانوں کے پردے پھاڑ دینے والے شور کے

ساتھ ایک بھارتی ہوائی جہاز گاؤں کے درختوں کی پھننگوں کو جیسے چھوتا ہوا گزر گیا۔ اور دوسرے ہی لمحے بموں کے دھماکوں سے ہر چیز لرزہ براندام ہو گئی۔ جہاز نے کُل پانچ بم گرائے تھے۔ ایک بم گاؤں کے پاس سے گزرتی ہوئی نہر میں گرا۔ جس سے نہر ٹوٹ گئی اور سیلاب آ گیا۔ اور ایک بم ہمارے گھر سے پچاس گز کے فاصلے پر گرا جس سے گھر کا ایک حصّہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ہم اتفاق سے گھر کے دوسری جانب برآمدے میں تھے۔ اس لیے بچ گئے۔ اگر جہاز یہ آخری بم ایک سیکنڈ بعد گراتا تو سیدھا ہمارے گھر کے اُوپر گرتا۔ صبح ہوئی تو ایک عجیب منظر ہمارے سامنے تھا۔ درخت اُکھڑے پڑے تھے۔ گھر کے صحن میں جا بجا بم کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ مکان کے ایک حصّے کی کھڑکیاں اور دروازے بالکل ٹوٹ گئے تھے اور دیواروں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئی رات بھر ان پر چاند ماری کرتا رہا ہے مگر دوسری طرف میرے سینے کے اندر خوشی نے اُبھار پیدا کر دیا تھا اور مسکراہٹ میرے ہونٹوں سے جیسے چپک سی گئی تھی۔

نطشے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جو شے تمہیں مار نہ سکے وہ تمہیں مضبوط تر کر دیتی ہے اور سوسن سونٹیگ SUSAN SONTAG کا خیال ہے کہ ہر بار جب انسان موت کے لمس سے آشنا ہوتا ہے تو پھر واپس اُس جگہ نہیں آتا جہاں وہ اس لمس سے پہلے تھا۔ مراد یہ کہ موت اپنے داغ دھبّے چھوڑ جاتی ہے۔ دونوں باتیں درست ہیں۔ جب ۱۹۶۵ء میں ہمیں کار کا حادثہ پیش آیا تھا تو اس کے نتیجے میں میرا بھی وہی حال ہوا تھا جس کا ذکر نطشے نے کیا ہے اسی طرح ۱۹۷۱ء میں جب ہم لوگ بھاری بموں کی بوچھاڑ کے باوجود موت کی زد میں نہ آسکے تو اس بار بھی مَیں بہت خوش تھا۔ اور مجھ میں ایک انوکھا اعتماد آ گیا تھا۔ مَیں کہہ رہا تھا دیکھو وہ اتنی قوّت سے ہم پر حملہ آور ہوئی مگر ہمارا بال بھی بیکا نہ کر سکی۔ یقیناً ہم لوگ کسی مضبوط تر قوّت کے حصار میں ہیں۔ تاہم اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ان دونوں حادثوں نے نہ صرف مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا بلکہ اپنے پیچھے ایسے داغ بھی چھوڑے تھے جو بعد ازاں میری نظموں میں بار بار اُبھرتے رہے۔

(۲۸)

جب ۱۹۷۲ء طلوع ہوا تو جنگ ختم ہو چکی تھی۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن چکا تھا اور مغربی پاکستان جو اب مغربی نہیں رہا تھا ایک عجیب کس مپرسی کے عالم سے گزر رہا تھا۔ پاکستان کے دو نیم ہونے کے اثرات بہت گہرے تھے۔ بالخصوص ہمارے ادبا نے تو اس سانحہ کو بہت ہی محسوس کیا تھا۔ یوسف ظفر تو اس کی تاب ہی نہ لا سکے اور جلد ہی وفات پا گئے۔ میں جب آخری بار انھیں ملا تو سارا عرصہ مشرقی پاکستان کے چھن جانے کی باتیں کرتے رہے۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ بے شک انھیں دل کا عارضہ بھی تھا مگر میرا خیال ہے کہ ان کی وفات کی فوری وجہ قومی سطح کا یہ حادثہ تھا۔ کئی اور ادیب بھی اس بحران کی زد میں آ چکے تھے۔ افسانوں اور نظموں اور غزلوں میں بھی بے بسی اور یاسیت کی یہ رَو پوری طرح اُبھر آئی تھی۔ خود میں نے اس زمانے میں جو غزلیں لکھیں ان میں اس سانحے کی پرچھائیاں جگہ جگہ موجود تھیں۔ گو اُمید کی ایک آدھ چنگاری بھی کہیں نہ کہیں راکھ میں دبی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ مثلاً:

دھار سی تازہ لہو کی شبنم افشانی میں ہے
صُبح دم بھیگی ہوئی پلکوں کی تابانی میں ہے
آنکھ ہے لبریز جیسے رو پڑے گا تُو ابھی
جیسے ذلّت کا مداوا آنکھ کے پانی میں ہے
مَیں نہیں ہارا تو میرے حوصلے کی داد دے
اک نیا عزم سفر اس خستہ سامانی میں ہے
اَنگنت رنگوں کے پَر بکھرے پڑے ہیں ہر طرف
وقت کا گھائل پرندہ پھر سے جولانی میں ہے
کس گھنے جنگل میں جا کر اب چھپیں اہلِ وطن
آنکھ سی اُبھری ہوئی سُورج کی پیشانی میں ہے

ایک طرف تو میں قومی سطح پر "دو نیم" ہونے کے کربناک احساس سے گزر رہا تھا اور دوسری طرف خود میری زندگی میں بھی تقسیم کا وقت آ پہنچا تھا۔ ہر گھر انقطاع کے اس عمل سے

گزرتا ہے اور اس کا اپنا ایک SHOCK بھی ہوتا ہے جو کسی طور بھی ساؤنڈ بیریر ٹوٹنے کے SHOCK سے کم نہیں ہوتا۔ ہماری بیٹی مینا اب تعلیم سے فارغ ہو چکی تھی اور فروری ۱۹۷۲ء میں اس کی رسمِ نکاح تھی۔ ہم میاں بیوی خوش بھی تھے کہ بیٹی کی شادی کا مسئلہ (کم از کم ہمارے معاشرے میں) بہت نازک مسئلہ گنا جاتا ہے اور ہم اس مسئلہ کو حل کرنے والے تھے مگر ساتھ ہی غمزدہ بھی تھے کہ ہمارا چھوٹا سا کنبہ تقسیم ہونے کو تھا۔ اسی سے منسلک ایک یہ احساس بھی بہت توانا تھا کہ ہماری زندگیوں کا ایک دَور ختم ہوگیا اور اب اس کے بعد جو اگلا دَور آئے گا وہ نوعیت اور مزاج کے اعتبار سے پہلے دَور سے قطعاً مختلف ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ ہر شخص اپنی زندگی کو بآسانی دو اَدوار میں تقسیم کر سکتا ہے۔ یعنی بیٹی کی شادی سے پہلے کا دَور اور پھر اُس کی شادی کے بعد کا زمانہ! یکایک ہم دونوں کو یوں لگا جیسے ہم بوڑھے ہو گئے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رسمِ نکاح سے چند روز پہلے میری بیوی نے مجھ سے کہا کہ اب ہمیں اُن تمام خطوط کو تلف کر دینا چاہیئے جو ہم نے ایک دوسرے کو شادی کے پہلے دس سالوں میں لکھے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میری بیوی اکثر اپنے والدین سے ملنے لاہور چلی جاتی تھی اور پھر کافی عرصہ وہیں رہتی تھی۔ لہٰذا ہمارا رابطہ خط و کتابت ہی سے قائم رہتا تھا۔ میری بیوی نے ان سب خطوط کو محفوظ کر رکھا تھا بالکل جس طرح اس نے اپنی شادی کا سُرخ جوڑا سنبھال کر رکھ چھوڑا تھا مگر اب کہ بیٹی کی شادی تھی تو اس نے سُرخ جوڑا تو بیٹی کو تحفتہً دے دیا اور خطوط کے بارے میں تجویز پیش کی کہ انھیں نذرِ آتش کر دیا جائے۔ سردیوں کے دن تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم دونوں نے ایک پوری رات جاگ کر کاٹی۔ کوئلوں کی انگیٹھی سامنے پڑی تھی۔ وہ بآوازِ بلند اپنا لکھا ہوا خط پڑھتی اور میں اپنا! ہر خط پڑھنے کے بعد اسے انگیٹھی میں ڈال دیا جاتا اور وہ بھڑک اُٹھتا۔ یوں ساری رات خطوں کی چتائیں جلتی رہیں اور ان کے ساتھ ساتھ وہ سال اور مہینے بھی نذرِ آتش ہوتے رہے جو خوشبوؤں اور دھڑکنوں، خوشیوں اور دکھوں سے لبریز تھے۔ ہر بار جب کوئی خط پڑھا جاتا تو وہ زمانہ دائرہ نور میں آجاتا جس میں یہ خط لکھا گیا تھا اور اس زمانہ کے ساتھ ہی بہت سی یادیں بھی کَودنے لگتیں۔ پھر جب وہ خط

انگیٹھی کے سپرد کر دیا جاتا تو خط کے ساتھ ہی وہ یادیں بھی بھسم ہو جاتیں۔ رات بھر یہ کھیل ہوتا رہا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو ہماری زندگی کے ایک پورے عہد پر رات کا تسلّط قائم ہو چکا تھا۔

(۲۹)

اسی دوران میرے اندر ایک تبدیلی آ رہی تھی۔ سطح پر تو اس تبدیلی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ لیکن میری نظموں اور غزلوں میں اس کے آثار جا بجا نظر آنے لگے تھے۔ جب مئی ۱۹۷۳ء میں میری غزلوں کا مجموعہ "غزلیں" چھپا تو میں نے اس کے دیباچے میں اس تبدیلی کی طرف اشارہ کیا اور لکھا کہ بحیثیت شاعر میری ذات کئی منزلہ عمارت کی طرح ہے۔ مزید یہ کہ میں نے ایک طویل مدت عمارت کی زیریں منزل میں بسر کی ہے مگر آج سے چند سال پہلے جب سیاحت کے جذبے نے زور پکڑا اور مجھے دَم گھٹنے کا احساس ہوا تو میں ایک لمحۂ اضطراب میں زیریں منزل کو خیرباد کہہ کر بالائی منزل میں آ گیا اور یہاں آتے ہی مجھے یوں لگا جیسے ساری کائنات ہی تبدیل ہو گئی ہے:

"عجیب منظر تھا۔ شہر کے سارے مکان زمین میں دھنس گئے تھے اور ان کے مکین بونے نظر آ رہے تھے۔ آسمان اب ایک جھکی ہوئی ٹین کی چھت نہیں تھا بلکہ ایک وسیع کینوس کی طرح دُور دُور تک پھیل گیا تھا۔ چاروں طرف زمین اور آسمان گلے مل رہے تھے۔ دُور دیس کے پہاڑ ایک سُرمئی لکیر کی طرح نمودار ہو گئے تھے اور کھیتوں کا لامتناہی سلسلہ اَن گنت سلوٹوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔ تب اچانک وہ سارا شہر جو مکانوں اور گلیوں میں منقسم ہونے کے باعث مجھے کبھی پوری طرح نظر نہیں آیا تھا، ایک فردِ واحد کی طرح دکھائی دیا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور دُکھوں نے میرے دل میں چھپی ہوئی اجتماعی خوشیوں اور دُکھوں کے لیے جگہ خالی کر دی۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میں کوئی تنہا اور الگ تھلگ ہستی نہیں۔ جیسے اگر میں فرد ہوں تو سارا معاشرہ میرے دل میں کلبلا رہا ہے اور اگر میں بیج ہوں تو سارا درخت مجھ میں سمایا ہوا ہے۔"

لیکن جس اجتماعیّت سے میں آشنا ہو رہا تھا وہ محض سیاسی یا سماجی سطح کی اجتماعیّت نہیں تھی

بلکہ مزاجاً کائناتی تھی۔ اگر وہ سیاسی یا سماجی سطح کی ہوتی تو میں اپنے اُن معاصرین کی طرح جو تازہ تازہ سوشلسٹ ہوئے تھے ایک مخصوص JARGON میں باتیں کرتا اور ایسی نظمیں اور غزلیں لکھتا جن میں جلی یا خفی انداز میں اشتراکیت سے کومٹ منٹ نظر آتی، مگر میں تو یکایک "کائنات کا شہری" بن گیا تھا۔ اور اب خود کو ایک عظیم اکائی کا اٹوٹ انگ محسوس کر رہا تھا غزلوں میں تو خیر اس احساس کی نمود ایک فطری عمل تھا کیونکہ غزل کا رویّہ ہمیشہ سے اجتماعی اور آفاقی رہا ہے۔ مگر میری نظموں میں بھی کائنات کو ٹٹولنے اور "اسرار" کو جاننے کی خواہش کروٹیں لینے لگی تھی۔ یہ نہیں کہ میں دھرتی سے منقطع ہو رہا تھا ایسا ہونا ممکن نہیں تھا کیونکہ دھرتی کی کششِ ثقل بہت زیادہ تھی اور خود میری جڑیں بھی زمین میں پوری طرح اُتری ہوئی تھیں تاہم مجھ پر اچانک اس بات کا انکشاف ہو گیا تھا کہ خود زمین بھی ایک سپوتنک ہے جس میں بیٹھ کر میں پوری کائنات کی سیر کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ قطعاً غیر شعوری طور پر میں نے اس زمانے کی SPACE EXPLORATION سے اثرات قبول کر لئے تھے۔ چاند پر انسان پہنچ چکا تھا اور اب وہ زہرہ، مریخ، مشتری اور یورینس وغیرہ سے رابطہ قائم کرنے کے بعد کہکشاں کی کوکھ میں اُتر جانا چاہتا تھا۔ مگر انسان کے لیے یہ مجبوری تھی کہ اس کے بھیجے ہوئے سپوتنک مکاں کے علاوہ زماں TIME کی قید میں بھی تھے اور زیادہ سے زیادہ رفتار سے چلنے کے باوجود اس قید سے رہائی پانا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ اگر یہ سپوتنک کسی نہ کسی طرح روشنی کی رفتار سے بھی چلتے (جو ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے) تو بھی کہیں لاتعداد نُوری سالوں میں کسی قریبی کہکشاں تک پہنچ سکتے تھے لہٰذا انسان کے لئے ابدی قید اور تنہائی سے نجات کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ دوسری طرف میرے اندر سے یہ احساس اُبھرا کہ میں تو زمین کے سپوتنک میں سوار خود بھی ایک سفر میں ہوں — اور یہ سفر محض اپنے محور پر گھومنے یا سُورج کے گرد سال بھر میں ایک چکّر لگانے تک ہی محدود نہیں۔ کیونکہ میری دھرتی بیک وقت اَن گنت دائروں میں سفر کر رہی ہے۔ مثلاً وہ چوبیس گھنٹوں میں اپنے محور پر گھوم جاتی ہے۔ ایک سال میں سُورج کے گرد اپنا دائرہ مکمّل کرتی ہے پھر سورج ہے کہ ایک طرف تو مسلسل "ہر کولیس جُھرمٹ" کی جانب سفر کر رہا ہے

اور دوسری طرف اپنے سیاروں (جس میں زمین بھی شامل ہے) کے ساتھ کہکشاں کے بطون میں موجود ایک مرکزی نقطے کے گرد گردش کر رہا ہے۔ پھر ہماری یہ کہکشاں جس میں ہمارا نظامِ شمسی (دھرتی سمیت) شامل ہے کسی اور مرکزی نقطے کے گرد گھوم رہی ہے اور یہ مرکزی نقطہ کسی اور نقطے کے گرد گردش کر رہا ہے۔ اور شاید یہ سلسلہ ازلی وابدی ہے۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ میری دھرتی کا سپوت تک ہمہ وقت ان تمام دائروں میں گھومتا چلا جا رہا ہے۔ گویا میں ایک سفرِ مسلسل میں مبتلا ہوں اور ہر لمحہ کائنات کے کسی نہ کسی نئے "علاقے" سے گزر رہا ہوتا ہوں۔

کائنات کا شہری بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ کائنات کا مسافر بننے کے بعد مجھے ایک اسرار MYSTERY کا سامنا تھا جو ایک ساؤنڈ بیریر SOUND BARRIER کی طرح میرے سامنے اُبھر آیا تھا۔ میں اس بیریر BARRIER کو عبور کرنا چاہتا تھا مگر کر نہیں پا رہا تھا۔ مثلاً میری نظم "نشرگاہ" میں اس احساس نے یہ شکل اختیار کی کہ پوری کائنات ایک نشرگاہ ہے جو ہر دم بھید بھرے پیغامات نشر کر رہی ہے۔ مگر ان پیغامات کو وصول کرنے والا شاید کوئی نہیں ہے۔ تو کیا کائنات ان سب پیغامات کو صرف خود تک پہنچانے کے لیے نشر کر رہی ہے؟

عجب سلسلہ تھا
کروڑوں برس کی مسافت پہ پھیلا ہوا سارا عالم
صداؤں کی، لہروں کی اِک چیختی نشرگاہ بن چکا تھا
فقط اپنے ہونے کا اعلان کرتا چلا جا رہا تھا

یہ اعلان کس کے لئے تھا؟
تخاطب کا رُخ کون سی سمت میں تھا!
تجھے کیا خبر ہے!
تو اس نشرگاہ کا فقط ایک ادنیٰ ملازم

تو کچھ بھی نہیں جانتا ہے!

مگر شاید یہ "ادنیٰ ملازم" اب کچھ کچھ جاننے لگا تھا یا کم از کم اس "اسرار" کے بھاری دروازے پر دستک ضرور دینے لگا تھا اور جب دستک شروع ہو جائے تو ایک نہ ایک دن مکان کے اندر کا مکین دروازہ کھول ہی دیتا ہے۔ میری نظم "ناموجود کے بھاری دَر پہ" میں بھاری دروازے کو چھونے کا یہ منظر بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

سو میری اوڈیسی نے اب ایک نیا رُخ اختیار کر لیا تھا مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس نے اپنی پہلی سمت ترک کر دی تھی۔ گاؤں سے سرگودھا شہر میں پہنچتے ہی میرا جو زمینی سفر شروع ہوا تھا وہ بدستور جاری تھا۔ البتہ اب اس میں آسمانی سفر کا ایک بُعد بھی شامل ہو گیا تھا عام زندگی کا قصّہ یہ تھا کہ پاؤں کا چکّر تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ چنانچہ میں ایک بار پھر "نقلِ مکانی" کی زد پہ آ گیا۔ سرگودھا کا قیام اپنے اختتام کو پہنچا اور ہم لوگ لاہور منتقل ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ پھر ایک روز لاہور جا پہنچے اور چھاؤنی میں مال روڈ کے قریب کرائے کی ایک کوٹھی میں ڈیرے ڈال دیے۔ اس زمانے میں مَیں نے انور سدید کو ایک خط لکھا جس میں اس نقلِ مکانی کے پس منظر سے اُنھیں آگاہ کیا تھا:

"آپ بھی حیران ہوں گے کہ اس بار میرے خط کی پیشانی پہ یہ کیسا نامانوس سا ایڈریس اُبھر آیا ہے۔ قصّہ یہ ہے کہ مَیں سرگودھا سے لاہور منتقل ہو گیا ہوں مستقل طور پر نہیں کیونکہ سرگودھا بالخصوص وزیر کوٹ سے منقطع ہونا میرے لیے ناممکن ہے۔ ہوا یہ کہ بیٹا تعلیم سے فارغ ہو گیا۔ سلیم نے ضد کی کہ اگر فرسٹ ایئر فول بننا ہی ہے تو وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں بنے گا، گورنمنٹ کالج سرگودھا میں نہیں۔ اور میری بیوی کے دل میں اپنے میکے کی یاد نے کہرام برپا کر دیا اور اس نے سرگودھا میں مزید قیام کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ نہیں کہ لاہور میں واقعتاً اس کا کوئی میکہ بھی موجود ہے کیونکہ اُس کے والدین یہاں سے نقلِ مکانی کر چکے ہیں۔ میکہ اس لیے کہ وہ لاہور میں پیدا ہوئی۔ یہیں

اس نے تعلیم حاصل کی اور یہیں وہ میرے پلّو سے باندھ دی گئی۔ سو لاہور ہمیشہ اس کا میکہ بنا رہے گا۔ اس سے مفر نہیں!

بہر حال اب میں لاہور میں ہوں۔ اگر آپ چھاؤنی کی طرف آئیں تو میاں میر پُل کو عبور کرنے کے بعد آپ کو اپنی بائیں طرف سٹیڈیم نظر آئے گا۔ اس کے بالکل سامنے ایک شکستہ حال، قرونِ وسطیٰ کے عہد کی ایک کوٹھی آپ کو نظر آئے گی۔ یہی کوٹھی میں نے کرایہ پر لے لی ہے۔ عمارت اس کی نہایت فرسودہ لیکن لان بہت کشادہ ہیں۔ ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس کے چاروں طرف کوئی دیوار، جنگلہ یا باڑ نہیں ہے چنانچہ لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے میں بآسانی مال روڈ پر آجاتا ہوں اور اگر مال روڈ پر چلنے والی کاریں پسند کریں تو بغیر کسی رکاوٹ کے ہمارے لان میں آسکتی ہیں۔ اس علاقے میں چوری چکاری بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے ہم نے دو کتّے رکھ لیے ہیں اب چین ہی چین ہے۔ وغیرہ.....

(انور سدید کے نام ایک خط ۱۱ر جولائی ۱۹۷۳ء)

(۳۰)

کوٹھی واقعی شکستہ حال تھی۔ میں نے زیبِ داستان کے لئے انور سدید کے نام لکھے گئے خط میں اس کی شکستہ حالی کا نقشہ نہیں کھینچا تھا۔ مجھے یہ بات تو پسند تھی کہ اس کوٹھی میں آکر مجھے گاؤں کی سی فضا میسّر آئی تھی۔ مگر کوٹھی کے کمروں میں جاکر ہول آتا تھا۔ یہ کوٹھی متروکہ املاک کے زمرے میں شامل تھی۔ میں اس کے کمروں میں جاتا تو کبھی مجھے صلاح الدین اکبر کا افسانہ "البم اور سائے" یاد آجاتا اور کبھی مجید امجد کی نظم "متروکہ مکان"۔ صاف محسوس ہوتا کہ اس کوٹھی کے مکین یہاں سے چلے جانے کے باوجود ابھی تک یہیں رہ رہے ہیں۔ ہم نے دو برس اس کوٹھی میں گزارے مگر سچّی بات یہ ہے کہ مصیبتوں میں مبتلا ہو کر گزارے۔ گھر کے کسی بھی فرد کا مزاج نارمل نہ رہا۔ حتّٰی کہ ہمارے کتّے بھی خون خوار ہو گئے اور بلا وجہ بھونکنے اور راہ گیروں پر حملے

کرنے لگے۔ گھر پہ ایک گہری اُداسی نے قبضہ جما لیا۔ اور ہم بیمار رہنے لگے۔ مینا تو بہت ہی بیمار ہو گئی۔ یہی حال سلیم اور اس کی ماں کا بھی تھا۔ مَیں بیمار تو نہ ہوا مگر جسمانی طور پر لڑکھڑاہٹ کا شکار ہو گیا۔ انھیں دنوں ایک روز میں اور انور سدید شیزان سے چائے پی کر باہر نکلے تو سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے مَیں اچانک نیچے گر گیا اور میری پیشانی زخمی ہو گئی۔ انور سدید مجھے ہسپتال لے گئے۔ جہاں ڈاکٹر نے میرے زخم کو سیا اور مجھے انٹی ٹیٹنس کا ٹیکہ لگا دیا۔ میری بیوی کا خیال تھا کہ کوٹھی منحوس ہے۔ نیز یہ کہ اس میں "کچھ" ہے جو ہمارے سکون و قرار کو درہم برہم کر رہا ہے۔ میں اُس کی اس قسم کی باتوں کو کوئی اہمیّت دینے کے لیے تیار نہیں تھا مگر اتنا مجھے بھی محسوس ہو رہا تھا کہ ہم ویسے نہیں رہے جیسے اس کوٹھی میں آنے سے قبل تھے۔

جب صورتِ حال کچھ زیادہ ہی پُراسرار ہونے لگی تو میری بیوی نے کہا کہ ہم لاہور میں ایک اپنا گھر بنا لیں۔ میں نے کہا چیل کے گھونسلے میں ماس ٹھہرتا ہی نہیں۔ اگر ٹھہرے تو بات بنے مگر وہ مُصر رہی کہ سرگودھا کا گھر بیچ کر لاہور میں گھر خرید لیا جائے مگر میرے لئے یہ ناممکن تھا۔ میں دراصل سرگودھا کے گھر میں پوری طرح جذب ہو چکا تھا۔ اور اس کے ساتھ میری اَن گنت یادیں وابستہ تھیں۔ میں خود کو اُس سے منقطع نہیں کر سکتا تھا۔ سو مَیں نے سوچا کہ اسے بنک کے پاس گروی رکھ کر رقم حاصل کر لی جائے تاکہ لاہور میں مکان خریدنا ممکن ہو، مگر بوجوہ یہ بھی نہ ہو سکا۔ بعد ازاں جب ۱۹۷۷ء میں زرعی اصلاحات کا زمانہ آیا تو سلیم نے اپنی زمین کا ایک حصہ بیچ کر لاہور میں ایک کوٹھی خرید لی۔ گو اس عمل سے ہمارے پاس زمین بہت کم رہ گئی مگر لاہور میں ایک ٹھکانہ تو میسّر آ گیا۔ مگر یہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ لاہور میں رہتے ہوئے دھن دولت نہ ہونے کے باعث ہم اپنا کوئی مکان نہ بنا سکے۔ سارا عرصہ کرایہ کی اس کوٹھی ہی میں رہے۔

(۳۱)

میری زندگی میں یہ دوسرا موقع تھا کہ مَیں لاہور میں ایک طویل عرصہ کے لیے قیام کر رہا تھا مگر عجیب بات یہ ہے کہ دوسری بار کے اس قیام کے دوران بھی مَیں قریب قریب

اُسی احساسی صورتِ حال سے گزرا جس سے مَیں تعلیم کے ایّام میں گزرا تھا۔ یعنی اجنبیّت اور تنہائی کا احساس! فرق یہ تھا کہ تعلیم حاصل کرنے کے زمانے میں تو میں اپنی فطری جھجک کے باعث خود میں سمٹا رہا جب کہ اِس بار کوئی ایسی جھجک سدِّ راہ نہیں تھی۔ اس بار اجنبیّت اور احساسِ تنہائی کا باعث اہلِ لاہور کا رویّہ تھا۔ یہ نہیں کہ اہلِ لاہور ملنسار نہیں تھے یا میل جول کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ ان کی نیاز مندی تو مثالی حیثیت رکھتی ہے مگر کچھ ہی عرصہ کے قیام کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ وہ باہر سے آنے والوں کو دل میں جگہ دینے پر مائل نہیں تھے۔ وہ مصافحہ کرتے، پھر معانقہ کرتے، پھر خیر خیریت دریافت کرتے، پوچھتے کہ کب آئے، کب رخصت ہوں گے، پھر "سلاما لیکم" اور یہ جا وہ جا! یہ عام رویّہ تھا وہ "جان پہچان" کی سطح پر تو فی الفور آجاتے لیکن دوستی کی سطح پر آنے میں بہت دیر کر دیتے۔ میرا خیال تھا کہ وہ باہر سے آنے والے سے پہلے ایک "آزمائشی دَور" سے گزرنے کا بے آواز مطالبہ کرتے ہیں اور جب وہ کئی سال کے بعد اپنے "دیہاتی پن" کو درخت کی چھال کی طرح اُتار پھینکنے میں کامیاب ہوتا ہے تو اُسے اپنی "مُعطّر تنہائیوں" میں داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔ بعد ازاں تجربے نے بتایا کہ اہلِ لاہور شخصی ترجیحات کی زد پر ہیں۔ اور اسی بنا پر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ چکے ہیں۔ ان ٹولیوں میں بھی خلوص اور محبّت کا وہ رشتہ نہیں جو شہر سے باہر کی مخلوق میں ہے۔ میں نے اکثر دیکھا کہ جہاں چار ادیب جمع ہوتے تو جملہ بازی کا مظاہرہ کرتے، گفتار کے جوہر دکھاتے، کالج کے طالب علموں کی طرح ایک دوسرے کے ہاتھوں پر ہاتھ مارتے، قہقہے لگاتے اور ایک دوسرے کے نجی معاملات سے پوری واقفیّت کا مظاہرہ کرتے۔ یوں لگتا جیسے وہ یک جان سو قالب ہیں۔ مگر جیسے ہی ان میں سے کوئی رخصت ہوتا تو فوراً اس کی بُرائی شروع کر دیتے مگر یہ تو ان کا آپس کا رویّہ تھا۔ میری صورت یہ تھی کہ وہ مجھے بڑے احترام سے بٹھاتے، خیر خیریت دریافت کرتے مگر ایک مناسب فاصلہ ہمیشہ قائم رکھتے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ ان کی محفل سے اُٹھ آنے کے بعد وہ مجھ سے کیا سلوک کرتے ہوں گے۔ ممکن ہے میری بھی بُرائی ہی کرتے ہوں کیوں کہ یہ ان کا عام رویّہ تھا —— اس سب کے باوجود مَیں نے "فاصلہ" کی پروا نہ کی اور اُن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے سوچا کہ دوست مجھے

گھر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چلتے رہیں تو وہ قائم رہتی ہے نہ چلیں تو نیچے سے گھاس نکل کر اسے ڈھانپ لیتی ہے۔ لہٰذا مجھے اس پگڈنڈی پر بار بار چلنا چاہئے۔ سرگودھا میں رہنے کے باعث میں نے وہاں جو حلقۂ احباب پیدا کیا تھا اس کی وجہ یہی تھی۔ وہاں ہم سب ایک کنبے کی طرح رہتے تھے۔ ظفر چودھری، انور سدید، سُہیل بخاری، رحمٰن قریشی، انور عزیز، عصمت اللہ، رشید قیصرانی، غلام جیلانی اصغر، خورشید رضوی، سجّاد نقوی، اختر امان، عبدالرشید اشک، رشک تُرابی اور بعد ازاں انجم نیازی، پرویز بزمی، راغب شکیب، جمیل یوسف، صوفی فقیر محمد اور صاحبزادہ عباس ۔ ایک ایسا حلقہ سا بن گیا تھا جس میں ہر شخص دوسرے کی خوشی اور غمی میں بھرپور شرکت کرتا۔ بعد ازاں جب سرگودھا میں بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن قائم ہوا تو چند سالوں کے لیے غالب احمد بھی سرگودھا میں آکر رہے اور ان سے بھی ایک ایسا ہی رشتہ قائم ہو گیا۔ اسی طرح راولپنڈی میں پُر خلوص احباب کا جو حلقہ بنا تھا اس کی وجہ بھی میرا ہر سال مری کا قیام تھا جس کے دوران ان سے طویل ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ یوسف ظفر، ضمیر جعفری، مشتاق قمر، جمیل ملک، جمیل آذر، رشید نثار، رشید امجد، احمد ظفر، توصیف تبسّم، اعجاز راہی، شبنم مناروی، سرور کامران، نثار ناسک اور بعد ازاں اکبر حمیدی، بشیر سیفی ان سب سے میرے مراسم تھے۔

مگر میری لاہور یاترا ہمیشہ مختصر ہوتی اس لیے میں لاہور کے ادبا کے قریب نہ آسکا تھا اور قریب نہ آنے کے باعث بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ چنانچہ اب کہ میں مستقل طور پر لاہور کا باسی بن جانے کے لیے آیا تو میں سب سے پہلے "پُل" بنانے کی طرف راغب ہوا۔ نیز جہاں جہاں "پُل" ٹوٹ گئے تھے انہیں دوبارہ تعمیر کرنے کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب سے میل جول کا آغاز تو سرگودھا ہی سے ہو چکا تھا۔ تاہم ان سے دوسری بار اور پھر بار بار ملنا ضروری تھا۔ سو میں ان کے گھر گیا۔ میری بیوی بھی ہمراہ تھی۔ وہاں میں نے ڈاکٹر صاحب کو ان کے اصل رُوپ میں دیکھا اور نہال ہو گیا۔ دراصل پبلک میں آکر ہر شخص حفاظتِ خود اختیاری کے تحت زرہ بکتر پہننے پر مجبور ہوتا ہے۔ تاہم گھر پہنچتے ہی وہ اسے اُتار پھینکتا ہے اور اپنے واقعی رُوپ میں سامنے آجاتا ہے۔ لہٰذا لوگوں سے ریستورانوں اور دفتروں کے بجائے ان کے گھروں میں ملنا چاہئے۔ مگر اہلِ لاہور اس بات کو ذرا کم ہی

پسند کرتے ہیں کہ لوگ انہیں گھروں میں آکر ملیں۔ مخصوص دوستوں کی بات نہیں کرتا۔ البتہ "واقف کاروں اور کرم فرماؤں" کے معاملے میں ان کا یہی روّیہ ہوتا ہے۔ مگر ڈاکٹر سید عبداللہ کا معاملہ جداگانہ نوعیت کا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر خوش ہوئے اور نہایت خلوص سے پیش آئے۔

سید صاحب کے علاوہ میں منیر نیازی، اظہر جاوید، محمد طفیل، انتظار حسین اور بعض دوسرے ادباسے بھی بطورِ خاص ملا تاکہ سابقہ کدورتیں اور رنجشیں دھل جائیں۔ پلک جھپکنے میں یہ سب کچھ ہوگیا۔ میں اسی دوران شام کو سلاطین ہوٹل میں بیٹھنے لگا تھا۔ جہاں آہستہ آہستہ ادبا بھی آنا شروع ہو گئے۔ چنانچہ شام کو دو تین گھنٹوں کے لئے ایک میلہ سا لگ جاتا۔ میں نے انور سدید کے نام ایک خط میں اس صورتِ حال کے بارے میں لکھا کہ

"میں اب ریستوران سلاطین میں بیٹھنے لگا ہوں۔ عارف صاحب، صلاح الدین ندیم صاحب اور کبھی کبھار عطاء الحق قاسمی صاحب، میرزا ادیب اور امجد اسلام امجد صاحب بھی آجاتے ہیں۔ جیسے جیسے یہ خبر عام ہو رہی ہے کہ اوراق والے سلاطین میں بیٹھتے ہیں، ادبا کا رُخ بھی سلاطین کی طرف ہو رہا ہے۔ سلاطین کے پروپرائٹر صاحب بھی بہت خوش ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ہوٹل کے باہر مرغوں کی لٹکتی ہوئی لاشوں میں چند اور لاشوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ اگلی بار آپ لاہور آئیں تو آپ کو سلاطین میں چائے پلائی جائے وغیرہ........"

مگر یہ سب تعلقات اور میل جول کے مظاہرے محض بالائی سطح تک محدود تھے۔ وہ جسے صحیح معنوں میں دوستی کا نام ملنا چاہئے صرف میل جول کا نام نہیں ہے۔ اس کے لئے احساسی سطح پر ایک دوسرے کے قریب آنا بہت ضروری ہے۔ لاہور میں رہتے ہوئے بالائی سطح کے میل جول کی حد تک تو میں کامیاب ہوا لیکن احساسی سطح کی ہم آہنگی کے مواقع ذرا کم ہی آئے۔ اب میں جب پلٹ کر اس سارے دَور پر ایک نظر ڈالتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ میں اس قیام کے دَوران تین چار سے زیادہ دوست نہ بنا سکا۔ ان میں سے شہزاد احمد

اور ذوالفقار احمد تابش کا نام بطورِ خاص لوں گا جن سے دوستی لاہور کے قیام کے دوران ہی پروان چڑھی اس دوستی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں ان سے مکالمہ کر سکتا تھا۔ بہر حال لاہور میں چند دوستوں کا مل جانا بھی غنیمت تھا۔ کیونکہ لاہور کی فضا دوستی کے لئے کچھ زیادہ سازگار نہیں تھی۔

(۳۲)

سلیم کو گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ خود میں نے ایک بار پھر گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا ہے چنانچہ میں تقریباً ہر روز گورنمنٹ کالج جاتا۔ میرزا ریاض کے کمرے میں سب لوگ جمع ہو جاتے۔ چائے کا دور چلتا۔ مگر ادب کی کم، ملازمتوں اور سکینڈلز کی باتیں زیادہ ہوتیں۔ مشکور حسین یاد ہمہ وقت مرکزِ گفتگو بلکہ مرکزِ نگاہ تھے۔ سب کو ہنساتے، ہر روز اپنے بارے میں ایسے ایسے "انکشافات" کرتے کہ ہم سب ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے ——— کالج میں مرزا منوّر، غلام الثقلین نقوی، صابر لودھی، سلیم اختر، اصغر سلیم، ملک بشیر الرحمٰن اور مشرف انصاری ——— ان سب سے خوب باتیں ہوتیں۔ غلام الثقلین نقوی تو خیر لاہوری ادبا میں شامل ہی نہیں تھے۔ ملازمت کی مجبوری تھی ورنہ وہ شاید لاہور میں رہنا بھی پسند نہ کرتے۔ صابر لودھی سے ملاقاتوں کا سلسلہ تو اسی روز شروع ہو گیا تھا جب اوراق کے اجرا کے فوراً بعد میں نے ان کی بیگم فرخندہ لودھی کا افسانہ "پاربتی" شائع کیا تھا اور جو شائع ہوتے ہی مشہور ہو گیا تھا۔ فرخندہ لودھی اور غلام الثقلین نقوی ——— دونوں اپنے اپنے میدان میں بہت اچھے افسانہ نگار تھے۔ اگر زمانہ ساز ہوتے تو مفادات کی فصل کاٹتے جیسا کہ ان کے معاصرین کاٹ رہے تھے۔ مگر اصلاً دیہاتی ہونے کے باعث دونوں نے اپنے اپنے گھروں میں پناہ لے لی تھی اور کارواں آگے بڑھ گیا تھا۔ میرزا ریاض کے لیے ادب زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں تھا۔ ان کی زیادہ تر مصروفیات غیر ادبی تھیں۔ سلیم اختر بہت AMBITIOUS تھے اور جلد از جلد اپنے لیے ادب کے میدان میں کوئی "مقام" بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے "اوراق" کو بطورِ زینہ استعمال کیا۔ اور مدیرانِ اوراق نے اس سلسلے میں ان کی بھرپور معاونت کی۔ مرزا منوّر سرگودھا کے رہنے والے ہیں۔ لہٰذا لاہور میں رہنے کے باوجود جذباتی

طور پر "سرگودھا" ہی میں مقیم تھے۔ ان سے زیادہ تر سرگودھا کی شخصیتوں کے بارے میں ہی گفتگو ہوتی۔ میں گورنمنٹ کالج جاتا تو ان سب کرم فرماؤں سے ملتا۔ مگر میری اصل ملاقات گورنمنٹ کالج سے ہوتی۔ میں پورے کالج میں گھومتا۔ ان کمروں کو جاکر دیکھتا، جن میں میں بطور طالب علم بیٹھا کرتا تھا۔ ایک روز میں نے اپنا مخصوص ڈیسک DESK بھی تلاش کر لیا (یا کم از کم اس وہم میں مبتلا ہوا کہ یہ میرا ہی ڈیسک تھا) اس پر کھدے ہوئے حروف مدھم پڑ گئے تھے مگر میں کسی نہ کسی طرح ان میں اپنے نام کی پرچھائیں دیکھنے لگا تھا۔ گورنمنٹ کالج میں گھومتے ہوئے بیس سال پہلے کی یادیں مجھے اپنے گھیرے میں لے لیتیں، یوں محسوس ہوتا جیسے ایچ۔ جی ویلز کی ٹائم مشین میں بیٹھ کر میں دوبارہ اُس زمانے میں چلا گیا ہوں جب میں ایک سائے کی طرح گورنمنٹ کالج میں پھرا کرتا تھا۔ کئی چہرے میرے ذہن کی سکرین پر اُبھر آئے۔ مجھے ان کے نام بھول گئے تھے، مگر ان کے خدوخال پوری طرح یاد تھے۔ البتہ اُستادوں کے چہرے دل پر اس طور نقش تھے کہ ان کے ناموں کے بھلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پرنسپل سوندھی، پروفیسر سراج، صوفی تبسم ——— کوئی طالب علم ان کے ناموں کو کیسے بھلا سکتا ہے!

میں تقریباً ہر روز گورنمنٹ کالج جاتا مگر ہفتے میں ایک بار اورینٹل کالج کا بھی ایک چکر لگاتا۔ اورینٹل کالج اُردو ادبا کا گڑھ تھا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ لاہور کی ادبی زندگی کا دل تھا۔ وہاں جب بھی جاتا بہت سے ادیبوں سے ملاقات ہو جاتی۔ بالخصوص باہر سے آنے والے ادبا سے تو اورینٹل کالج ہی میں ملاقات ہوتی۔ ان دنوں اورینٹل کالج کی سیاست اپنے عروج پر تھی۔ کالج دائیں اور بائیں بازو کے ادبا میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اور فضا میں خاصا تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ میں ڈاکٹر وحید قریشی کے کمرے میں جا بیٹھتا تو وہاں زیادہ تر ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ان کے ساتھیوں کا "ذکرِ خیر" ہوتا اور جب ڈاکٹر عبادت بریلوی کے کمرے میں جاتا تو وہاں ڈاکٹر وحید قریشی اور ان کے رفقا "موضوعِ گفتگو" ہوتے۔ مجھے ان باتوں میں دلچسپی نہیں تھی۔ لہٰذا موضوع بدلنے کی کوشش کرتا، لیکن بات چند قدم لڑکھڑا کر چلنے کے بعد واپس اپنے "اصل مقام" پر آجاتی اور اصل مقام پر پہنچتے ہی اس میں بلا کی روانی اور زور پیدا ہو جاتا۔ دونوں حضرات سے میرے مراسم بہت پرانے تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی سے مراسم کا آغاز تو ان ایام میں ہی ہو گیا تھا جب

میں نے ان کی زیرِ نگرانی پی۔ایچ۔ڈی کا تھیسس لکھنا شروع کیا۔ "زیرِ نگرانی" اس لیے کہ وہ یونیورسٹی کی طرف سے میرے نگران مقرر ہوئے تھے۔ ورنہ چونکہ میرا موضوع ان کے لیے اجنبی تھا اس لیے وہ اس سلسلے میں میری رہنمائی کرنے سے معذور تھے۔ البتہ ان دنوں وقار عظیم صاحب نے میرے تھیسس کے سلسلے میں بعض اوقات نہایت قیمتی مشورے دیے تھے۔ تثلیث کے تیسرے سرے پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی تھے۔ مگران کا "اندازِ گفتگو" مجھے پسند نہیں تھا۔ نہایت رعونت سے باتیں کرتے اور لاہور کے ادبا کی "جہالت" کا بطورِ خاص ذکر کرتے۔ میرے لیے اس قسم کی باتیں سننا سوہانِ روح سے کم نہ تھا۔ مگر مجبوراً سنتا۔ پھر جب مولانا صلاح الدین احمد سے ملاقات ہوتی اور میں انھیں ڈاکٹر صاحب کے "خیالاتِ عالیہ" سے آگاہ کرتا تو مولانا مطلق رنجیدہ نہ ہوتے بلکہ ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے اور اس قہقہے کی آبشار میرے دل کی ساری کدورت کو دھو ڈالتی۔ مگر یہ تو ۱۹۵۶ء سے پہلے کی باتیں ہیں۔ میں دراصل ۱۹۷۳ء کے بعد کے زمانے کا ذکر کر رہا تھا۔ اس زمانے میں اورینٹل کالج کی روحِ رواں ڈاکٹر وحید قریشی تھے ـــــ ڈاکٹر وحید قریشی ہمہ وقت خوش باش رہتے۔ میں جب انھیں کسی نہ کسی طرح عبادت بریلوی کے موضوع سے الگ کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو ان کی طبیعت کی جولانی قابلِ دید ہوتی۔ دوستوں کے دوست تھے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ دوستی اور دشمنی کے معاملے میں انتہا پسند تھے۔

اورینٹل کالج ہی میں مجھے سجاد باقر رضوی، تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر سہیل احمد خاں سے ملاقات کے مواقع ملے۔ ان سے زیادہ تر جدید ادب کے بارے میں باتیں ہوئیں۔ مجھے ان تینوں حضرات کی یہ بات بہت پسند تھی کہ انھوں نے اورینٹل کالج کی کلاسیکی فضا میں جدیدیت کا چراغ روشن کر رکھا تھا۔ میں خواجہ محمد زکریا سے بطورِ خاص ملتا۔ اس لیے بھی کہ خوش باشی بلکہ یار باشی کے اعتبار سے وہ میرے دیرینہ دوست حمید صاحب سے مشابہ تھے۔ معمولی سی بات پر بھرپور قہقہہ لگاتے مگر اس قہقہے کا مقصد داد طلب کرنا نہ ہوتا!

(۳۳)

لاہور میں رہتے ہوئے میں دائرہ در دائرہ پھیل رہا تھا۔ گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج

کے علاوہ بعض دوسرے کالجوں بالخصوص ایم ۔ اے ۔ او کالج بھی جاتا کیونکہ وہاں عارف عبدالمتین صاحب پڑھاتے تھے ۔ عارف عبدالمتین صاحب کا ایک اپنا حلقہ بھی تھا ۔ جسے لوگ "ادب کا چشتیہ ہائی سکول" بروزن "ادب کا لکھنؤ سکول" کہہ کر پکارتے ۔ علاوہ ازیں میں لاہور کی تنقیدی مجالس میں بھی شرکت کرتا ۔ باہر سے آنے والے سکالرز کی تقاریر سنتا ۔ بعض اوقات مشاعروں میں بھی حاضری دیتا ۔ اور مختلف کالجوں میں ہونے والے تقریری مقابلوں میں جج کے فرائض بھی ادا کرتا ۔ یہ سب کچھ ہوتا ، مگر اس سب کے باوجود میں محسوس کرتا کہ میں ایک OUTSIDER ہوں ۔ ممکن ہے اس میں قصور میرا اپنا بھی ہو ۔ کیونکہ میں طبعاً ایک دیہاتی ہوں اور گو میں نے بار بار دیہات سے شہر کی طرف ہجرت کی ہے تاہم شاید میں کبھی دیہاتی پن سے خود کو آزاد نہیں کر سکا ۔ دیہات میرے دل بلکہ روح کے اندر گھاس کی طرح اگا ہوا ہے اور اس کی جڑیں بہت دور تک اتری ہوئی ہیں ۔ گھاس کو اوپر سے کاٹو یا اس کی جڑوں کو نکال پھینکو تو بھی یہ موجود رہتی ہیں ۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو گاؤں سے شہر کی طرف آتے ہیں کہ گاؤں ان کے تصورات میں "جنتِ گم گشتہ" کی طرح سدا فروزاں رہتا ہے ۔ سو لاہور میں رہتے ہوئے اگر میں ایک OUT SIDER بنا رہا تو اس میں کچھ قصور میرا بھی ہوگا ۔ مگر اس کی غالب وجہ اہلِ لاہور کا رویہّ ہی تھا کہ وہ میل جول کے معاملہ میں تو گرم گفتاری کا مظاہرہ کرتے تھے مگر شاید ٹوٹ کر پیار کرنے کے قائل نہیں تھے ۔ چنانچہ ایک بار میں نے اپنے ایک شعر میں اس احساس کو سمیٹ بھی لیا تھا ۔ ع :

کبھی گلے نہ لگایا مجھے مگر پھر بھی
طواف کرنے پڑے شہرِ بے ثمر کے مجھے

لاہور میں دوسرا غالب احساس یہ تھا کہ یہاں "روشنیاں" بہت ہیں ۔ فیض بھی جب ایک طویل مدت کے بعد لاہور آئے تو انہیں روشنیوں کے وجود ہی کا احساس ہوا تھا ۔ پورا شہر بقعۂ نور بنا رہتا ۔ دکانوں اور سڑکوں کی چندھیا دینے والی روشنی کے علاوہ شادی کے منور گھروں کا منظر بھی دیدنی ہوتا ۔ یوں لگتا جیسے سمندر میں روشنی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے وجود میں آ گئے ہیں ۔ تہواروں کے موقع پر یہ جزیرے ایک دوسرے کے ساتھ

جڑ کر روشنی کا بحرِ اعظم بن جاتے، مگر مجھے محسوس ہوتا کہ شہر کی روشنی نے آسمان کی روشنی کو بجھا دیا ہے۔ گاؤں میں صورت یہ تھی کہ رات بھیگتے ہی گاؤں تو بجھ جاتا لیکن آسمان پر کروڑوں ستارے قمقموں کی طرح روشن ہو جاتے۔ ایک بار وجیہہ الدین احمد میرے پاس گاؤں میں ایک رات کے لئے ٹھہرے اور گئی رات تک آسمان کے نیچے لیٹے ستاروں کو دیکھتے رہے۔ کہنے لگے کہ اتنے ستارے تو میں نے پہلے کبھی دیکھے ہی نہیں تھے۔ وجہ شاید یہ تھی کہ جب گھر اور سڑکیں روشنی میں ملفوف ہوں تو روشنی بجائے خود زمین اور آسمان کے درمیان ایک دیوار سی بن جاتی ہے۔ سو شہریوں کو رات کے آسمان کو دیکھنے کا موقع ذرا کم ہی ملتا ہے۔ میرا معاملہ یہ تھا کہ لاہور میں رہتے ہوئے میں اب آسمان کی روشنی کے بجائے زمین کی روشنی کو دیکھنے لگا تھا۔ اور روشنی کا یہ مظاہرہ مجھے قطعاً مصنوعی نظر آیا تھا۔ انھیں دنوں ایک روز جب کسی تہوار کے موقع پر پورا شہر سلفے کی ایک لاٹ بنا ہوا تھا تو میں نے ایک غزل کہی جس کے مطلع میں روشنیوں کے اس میلے کا بطورِ خاص ذکر تھا۔ مطلع تھا ؎

صُبح کی آنکھ ہنسے شام کا تارا ناچے
رات بھر شہر مگر سائے کا سارا ناچے

(۳۴)

لیکن لاہور میں رہتے ہوئے غالب ترین احساس یہ تھا کہ پورا شہر ہزارہا گھروں اور سڑکوں اور بڑی بڑی عمارتوں میں منقسم ہونے کے باوجود اپنی ایک اکائی بھی رکھتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شروع شروع میں مجھے شہر کی یہ اکائی نظر نہیں آئی تھی۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرا اور میں لاہور کو قریب سے دیکھنے کے قابل ہوا تو اس "اکائی" کے خدوخال واضح ہوتے چلے گئے۔ شہر کی اس اکائی سے میری پہلی ملاقات تو اس روز ہوئی جب میں رات کے پچھلے پہر (غالباً راولپنڈی جانے کے لیے) بیدار ہوا تھا۔ چاروں طرف "سناٹا" تھا۔ پھر اچانک مجھے ریل کی مدھم سی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد سڑکوں پر موٹروں اور رکشاؤں کی اکا

ڈکا آوازیں اُبھرنے لگیں۔ پھر دُور کسی لاؤڈ سپیکر نے کسی دوسرے لاؤڈ سپیکر کو للکارا اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر کے سارے لاؤڈ سپیکر ایک دوسرے سے مناظرہ کرنے لگے۔ پھر ایک گہری بھنبھناہٹ سی چاروں طرف اگ آئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی سویا ہوا عفریت ہولے ہولے جاگ رہا ہے۔ ہر طرف پھنکاریں ہی پھنکاریں تھیں پھر بھاری ٹرکوں کے چلنے کی آواز، بریکوں کی چیخیں، فیکٹریوں کے بلاوے، ایک بھنبھناہٹ تھی کہ لحظہ بہ لحظہ میرے قریب آ رہی تھی، پھر معاً دہ ہمسائے کے ریڈیو سے ایک بھاری بھرکم آواز میں ڈھل کر ابھری اور مجھے آوازوں کے کارواں میں شامل ہونے کی دعوت دینے لگی۔

مگر لاہور کی "اکائی" سے یہ میری واحد ملاقات نہیں تھی۔ میں جتنا عرصہ لاہور میں رہا اس کے وجود سے بار بار آشنا ہوتا رہا۔ صبح سے "یہ ہستی" بیدار ہوتی، دو ایک جمائیاں لیتی پھر اُٹھ کر بے تحاشا دوڑنے لگتی۔ کسی سیّال شے کی طرح کاروں، تانگوں، رکشاؤں، ٹیلی فون اور بجلی کے تاروں، زیرِ زمین پائپوں اور زیرِ فلک پتنگوں، چیلوں اور جہازوں میں منتقل ہو کر ایک کہرام برپا کر دیتی۔ دوپہر کے قریب اس کی رفتار میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا۔ شام کو تھک ہار کر سُست روی کا مظاہرہ کرتی۔ آدھی رات کے قریب سو جاتی۔ مگر پھر علی الصبح دوبارہ کسمسا کر بیدار ہو جاتی۔ اس کے معمولات میں کبھی فرق نہ آتا۔ شدہ شدہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہ ایک آہنی عفریت ہے۔ جس نے شہر کی پوری آبادی کو اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا ہے یا شاید یہ کیکڑا ہے جس کی ٹانگیں لمبی لمبی شاہراہوں کی صورت شہر کے باہر دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں اور وہاں سے اپنے لئے خوراک حاصل کرتی ہیں۔ انھیں دنوں میں نے نثرِ لطیف کا ایک ٹکڑا لکھا تاکہ اپنے اس تاثر کو محفوظ کر لوں۔ بعد ازاں میں نے اسے "اوراق" میں شائع بھی کر دیا۔ قندِ مکرر کا لطف لینے کے لیے اسے یہاں دوبارہ درج کرتا ہوں:

اوشا مشرق کی کھڑکی میں ابھی نمودار نہیں ہوئی
مگر کھڑکی کے پٹ کھول دیے گئے ہیں
اور ریشمی پردے سرسرانے لگے ہیں۔

آسمان کے کمبل میں جگہ جگہ سوراخ ہیں۔
اور زمین پر بوجھل شہر
ایک تھکے ہارے عفریت کی طرح خراٹے لے رہا ہے
ایک لجلجے کیکڑے کی طرح کراہ رہا ہے
اس کی بوجھل آنکھیں کہرے میں چمک رہی ہیں!
ابھی اوشارانی کھڑکی میں آکھڑی ہوگی
اور یہ عفریت انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھے گا
اوشا گھبرا کر دوبارہ پردے میں چلی جائے گی
اور کھڑکی میں بیٹھی ہوئی فاختائیں اور کبوتر
ڈر کر اڑ جائیں گے
اور عفریت ایک بھیانک قہقہہ لگائے گا
اس کی آنکھوں سے شعلے برسیں گے
اس کے دہن کی چمنی سے دھواں اُٹھنے لگے گا!

اس کیکڑے کی ٹانگیں ان گنت ہیں
روشنی ہوئی تو یہ ایک مہیب سا ناچ ناچیں گی
اور ان پر بیٹھی ہوئی چیونٹیاں
یکایک دوڑنے لگیں گی

مگر ابھی یہ عفریت سویا پڑا ہے
فقط اس کے کراہنے کی آواز آ رہی ہے
اور اوشارانی ابھی کھڑکی میں نہیں آئی

چلو اس کے بیدار ہونے سے پہلے
ایک بار پھر سو جائیں
اور خواب دیکھیں
بے کنار وسعتوں میں پھیلی ہوئی
ٹیڑھی ترچھی لکیروں کے خواب!
رنگوں کے چیتھڑوں
اور آوازوں کے ہیولوں
اور پیشانیوں پر اُبھری ہوئی
لاتعداد آنکھوں کے خواب!

عجب تماشا ہے
باہر کی آنکھ بند کرتا ہوں
تو اندر کی آنکھ کھُل جاتی ہے۔

قیام

۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۰ء

بادل برس کے کُھل گیا رُت مہرباں ہوئی

بوڑھی زمیں نے تن کے کہا: مَیں جواں ہوئی

۱

واقعی میں اب "اندر کی آنکھ" کے کھلنے کے تجربے سے گزرنے لگا تھا۔ اب میں اکثر خود سے پوچھتا کہ میں اتنے بڑے شہر میں بیٹھا کیا کر رہا ہوں۔ مجھے یوں لگتا جیسے شہر کے باسی چھوٹے چھوٹے لاتعداد نقطوں کی طرح شیشے کے ایک بڑے مرتبان میں ہمہ وقت ملنے اور بچھڑنے کے عمل میں مبتلا ہیں۔ کبھی ایک دوسرے کے اتنے قریب آجاتے ہیں کہ ایک سیاہ "دھبہ" بن جاتے ہیں۔ کبھی اتنے بکھر جاتے ہیں کہ پورا مرتبان چیچک زدہ چہرے کی طرح دکھائی دینے لگتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا جیسے میں بھی ایک نقطہ ہوں اور نقطوں کے اس جمِ غفیر میں شامل ہوں۔ دراصل لاہور شہر کے باسی کسی پُراسرار آواز پر ہر دم "لبیک" کہنے کے عادی تھے۔ یہی آواز اُن کے لیے ہر بحران کے موقع پر فیصلہ کرتی، نیز عام زندگی میں بھی ان کے اجتماعی رویوں کو مرتب کرنے میں مددگار ثابت ہوتی۔ وہ جو انسان کے اندر ایک طرح کی MIND-SPACE ہوتی ہے، بڑے شہر میں رہتے ہوئے منہدم ہونے لگتی ہے۔ سنا ہے جب روم جل رہا تھا تو نیرو بانسری بجانے میں منہمک تھا۔ اصل بات شاید یہ تھی کہ نیرو کی بانسری کی آواز ہی سے روم جل اٹھا تھا۔ ہر بڑے شہر کی ایک اجتماعی پُراسرار آواز ہوتی ہے جو شہر کو جب "نذرِ آتش" کرتی ہے تو وہ بھڑکتے ہوئے جذبات کے ساتھ متحرک

ہو جاتا ہے۔ پھر جب یہ آواز تھمتی ہے تو وہ بھی رُک جاتا ہے۔ لاہور میں رہتے ہوئے جب میں کچھ عرصہ کے لئے اس آواز کے بُلاوے پر جاگنے اور سونے لگا تو مجھے یوں لگا جیسے میری رُوح کو قتل کیا جا رہا ہے یا کم از کم اس کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ یہ احساس صرف مجھے ہی نہیں تھا۔ ازمنۂ قدیم ہی سے انسان بڑے شہر میں دم گھٹنے کے احساس سے آشنا رہا ہے۔ جب آلِ ابراہیم نے اُر سے ہجرت کی تو اس کی بڑی وجہ بھی یہی تھی کہ اس کے لیے "شہر کا تشدّد" ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ حقیقت غالباً یہ ہے کہ شہر میں رہتے ہوئے رُوح کا تیسرا بُعد باقی نہیں رہتا۔ اگر ایک عام فلم دیکھنے کے بعد تھری ڈی فلم دیکھی جائے تو اُس گہرائی کا (جو تیسرے بُعد کی حیثیت رکھتی ہے) صحیح طور سے ادراک ہو سکتا ہے رُوح کے اندر بھی یہ "بُعد" ہوتا ہے جو انسان کو موقع عطا کرتا ہے کہ وہ اپنے ماحول کو "تیسری آنکھ" سے دیکھے۔ لیکن اگر یہ تیسری آنکھ وجود میں نہ آئے یا وجود میں آنے کے بعد کسی نہ کسی طرح بند ہو جائے تو پھر انسان اپنے ماحول میں جیسے جذب ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ہاں انفرادیّت کے وجود میں آنے کا عمل رُک جاتا ہے۔ لاہور میں رہتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ بحیثیت مجموعی یہ بڑا شہر MIND-SPACE سے محروم ہو چکا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے اندر کی آواز کا مطیع ہے۔ مگر اس احساس کی نمود بجائے خود اس بات پر دال تھی کہ میں اس آواز کا مطیع نہیں تھا اور اپنے اور اس کے ربطِ باہم پر غور کرنے کے قابل تھا۔ اور سچّی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس احساس ہی نے شہر کے تشدّد سے بچایا اور میں جلد از جلد لاہور کو الوداع کہہ کر واپس گاؤں جانے کے خواب دیکھنے لگا۔

۲

اور پھر وہ دن طلوع ہوا جب ہم سب نے رختِ سفر باندھا اور لاہور کو الوداع کہہ کر واپس اپنے گاؤں آ گئے۔ میرے لیے سرگودھا اور پھر لاہور کا قیام اٹھارہ برس کا ایک طویل بن باس تھا جو ۱۹۵۷ء میں شروع ہوا اور اب ۱۹۷۵ء میں اپنے اختتام کو پہنچا۔ گاؤں میں کوئی بھرت تو میرا خیر مقدم کرنے کے لیے موجود نہیں تھا۔ البتہ مجھے یہ محسوس ہو رہا

تھا کہ پورا گاؤں —— اس کے کسان، چڑیاں، مویشی، درخت، کھیت، ہوا اور فضا نے بھرت کا رُوپ دھار لیا ہے۔ اور ہر شے مجھے جی جان سے خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ انھیں دنوں میں نے انور سدید کو متعدّد خطوط لکھے جن میں اپنے اندر کے نئے موسم کا حال بیان کیا تھا۔ ان خطوط سے دو اقتباسات درج کرتا ہوں :

" سو بھائی صاحب! اب میں وزیرکوٹ کا باسی ہوں۔ میں اب اس ارادے کے ساتھ آیا ہوں کہ باقی زندگی یہیں بسر کروں گا۔ یہاں کے لوگ ہماری آمد پر بہت خوش ہیں۔ ہم نے مقفّل کمروں کے دروازے کھلوائے ہیں حویلی کی دیواروں پر سفیدی کرائی ہے۔ بیوی برسوں کے جمع شدہ کوڑا کرکٹ کو ٹھکانے لگانے میں مصروف ہے اور میں ایک مدت کے بعد درختوں اور پرندوں اور کسانوں سے صحیح معنوں میں معانقہ کر رہا ہوں۔ لاہور کے قیام کے دوران میں جب کبھی یہاں آکر چند روز کے لیے ٹھہرتا تو سب لوگ مجھ سے دُور دُور ہی رہتے۔ کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ میں ایک مہاجر پرندہ ہوں، چند روز میں اڑ جاؤں گا۔ مگر اب انھیں معلوم ہے کہ میں ان کے ساتھ ہمیشہ کے لیے رہنے آیا ہوں۔ سو وہ سب خوش ہیں اور میری خوشی؟ مجھے ویسی ہی خوشی ملی ہے جیسی بچپن میں گرمیوں کی چھٹیوں کے موقع پر ملا کرتی تھی "۔

(انور سدید کے نام ایک خط ۵ اگست ۱۹۷۵ء)

" دراصل میں ان دنوں خط لکھنے کی ایک مشین بن گیا ہوں پچھلے ایک ہفتہ میں میں نے اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں کو کم و بیش ایک سو خطوط لکھے ہیں۔ بس ان تک یہ خوش خبری پہنچانے کے لیے کہ قیدِ بامشقت کے ایّام تمام ہوئے۔ لاہور کی پہنائی ہوئی بیڑیاں کٹ گئیں اور اب میں ایک آزاد پرندے کی طرح پرفشاں ہوں۔ انور صاحب! آزادی کا احساس تو قید سے رہائی کے بعد ہی ہوتا ہے ورنہ آزادی کے دونوں جانب اگر قید نہ ہو تو پھر آزادی بھی قید ہی کی ایک صورت ہے۔ ٹھیک ہے نا! —— لاہور

سے آنے کے بعد چند ہی دنوں میں مَیں نے خود کو دوبارہ گاؤں کی آہستہ خرام زندگی سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔ لاہور میں منجملہ دوسری باتوں کے مَیں سحر خیزی کی عادت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ مگر اب یہ حال ہے کہ ابھی سپیدۂ سحر کی موہوم سی لکیر ہی اُبھرتی ہے اور میرے کمرے کے سامنے پیپل پر پرندوں کی پہلی چہکار بمشکل جنم لیتی ہے کہ مَیں بیدار ہو جاتا ہوں اور کمرے کے باہر تھڑے پر کرسی بچھا کر نیم دراز ہو جاتا ہوں اور پیپل کی دنیا کو ہولے ہولے بیدار ہوتے دیکھتا رہتا ہوں۔ یہ پیپل میرے گاؤں کے چند معمّر ترین درختوں میں سے ایک ہے باقی بیشتر درخت مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں اور بیشتر میرے اپنے ہاتھوں کے لگائے ہوئے ہیں۔ مگر پیپل کا یہ درخت اُس وقت بھی جوان تھا جب مَیں نے ابھی ہوش نہیں سنبھالا تھا۔ وہ ابھی بوڑھا نہیں ہوا البتہ میں خود بڑھاپے کی دہلیز پر آ گیا ہوں مگر میرا یہ احساس ہے کہ پیپل کا یہ درخت مجھے پہچانتا ہے۔ اس میں ایک عجیب سا بزرگانہ وقار ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے اس سے ڈر بھی لگتا ہے۔"

(انور سدید کے نام ایک خط، ۲۵ اگست ۱۹۷۵ء)

مگر میرا یہ احساس اضطراری نوعیت کا نہیں تھا۔ آج بھی مجھے پیپل کا یہ درخت کسی زندہ ہستی کے رُوپ میں نظر آتا ہے کھجور کے درخت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ آدھا انسان اور آدھا درخت ہے یہ بات پیپل پر بھی صادق آتی ہے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں اپنے کسی دوست کے ساتھ باہر تھڑے پر بیٹھا باتیں کر رہا ہوتا اور باتوں کے دوران ہم یکا یک ہنس پڑتے تو ہوا نہ ہونے کے باوجود پیپل کے پتّے یکا یک پھڑ پھڑا اُٹھتے جیسے تالیاں بجا رہے ہوں! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار قیوم نظر، امجد الطاف اور ریاض احمد میرے پاس گاؤں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ شام کا وقت تھا ہم باہر تھڑے پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ معاً پیپل کا یہ درخت بھی ہماری گفتگو میں شریک ہو گیا اور وقفے وقفے سے تالیاں پیٹنے لگا۔ اس بات کا احساس سب سے پہلے ریاض احمد کو ہوا اور انھوں نے جلد ہی ہمیں بھی اس کی طرف متوجّہ کر دیا پھر ہم تا دیر پیپل کے "ردِ عمل" کو دیکھتے رہے بلکہ یہ کہنا

چاہیئے کہ اس کے ساتھ مذاق کرتے رہے۔ ہر بار جب کسی لطیفے پر ایک قہقہہ بلند ہوتا تو ریاض احمد کہتے، دیکھو اب یہ تالی بجائے گا سو وہ تالی بجاتا حالانکہ ہوا کا کوئی مریل سا جھونکا بھی دُور دُور تک موجود نہ ہوتا۔ مجھے وہ دن بھی اچھی طرح یاد ہے جب عطاء الحق قاسمی اپنی کتاب کی تقریبِ رونمائی کے لیے سرگودھا آئے اور میں شام کو انہیں اور گلزار وفا چودھری کو ایک رات کے لیے اپنے گاؤں لے آیا۔ اس شام بھی ہم تادیر باہر تھڑے پر بیٹھے رہے۔ بات بات پر قہقہے بلند ہوتے مگر میں نے دیکھا کہ اس بار پیپل نے ہماری باتوں میں شرکت نہ کی۔ نہ جھوما نہ تالی بجائی نہ آہ بھری! نہ جانے کیوں؟ میرا خیال ہے کہ یہ پیپل ایک نہایت مردم شناس درخت ہے۔ صرف پُرخلوص دوستوں کی محفل ہی میں کُھلتا ہے۔

(۳)

لاہور سے "رہائی" پانے کا احساس محض بالائی سطح کے "ردِّ عمل" تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ میری نظموں کے اندر سے بھی لَو دینے لگا تھا۔ خطوط کی حد تک تو اس نے فوری اظہار میں خود کو صرف کر ڈالا مگر نظموں کے اندر آہستہ آہستہ پروان چڑھا اور برسوں بعد بھی میری نظموں اور غزلوں میں اپنی جھلک دکھاتا رہا۔ مثلاً لاہور سے آنے کے تقریباً ایک سال بعد میں نے ایک نظم لکھی جس کا عنوان تھا "ہوا کے جھونکے نے پنکھ کھولے"

نظم مکمّل ہوئی تو میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس میں رہائی کا وہی احساس موجود تھا جس کا اظہار میں نے بار بار دوستوں سے کیا تھا۔ مگر اب یہ احساس شعری کیفیات میں لپٹا ہوا برآمد ہوا تو اس کی صورت ہی کچھ اور تھی۔ شہر اس کی گلیاں اور گلیوں کے فرش پر لیٹی ہوئی بے لباس مخلوق حبس اور گرمی کے دائرے میں قید تھی۔ اور ہوا کے ایک جھونکے کو ترس رہی تھی اور جھونکا تھا کہ خود ایک پنجرے میں مقیّد تھا۔ قرائن کہتے ہیں کہ یہ جھونکا شاعر کا ہمزاد تھا اور اپنے بندی خانے سے نجات کا آرزومند تھا۔ پھر جب کسی نے اُسے پنجرے سے رہا کیا تو وہ ایک آزاد پرندے کی طرح فضا میں

اُڑنے لگا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ میں "آزادی" کے اس احساس سے جسے میں نے ایک خوش خبری کی صورت دُور دُور تک پھیلایا تھا، ایک حد تک ڈرا بھی ہوا تھا۔ بالائی سطح پر تو مجھے اس "خوف" کا علم تک نہیں تھا۔ لیکن جب میں نے نظم لکھی تو مجھے محسوس ہوا کہ میری حالت تو اُس پرندے کی سی ہے جو برسوں کی قید کے بعد پنجرے سے باہر آتا ہے تو آزادی کی کشادہ فضا سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ یہی بات معاشرتی انقلاب کے موقع پر بھی بار بار سامنے آتی ہے کہ وہ طبقہ جس کی خاطر انقلاب لایا گیا تھا۔ فوری طور پر آزادی کو قبول کرنے سے ہچکچاتا ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ انقلاب سے پہلے کی فضا اس کے لیے ایک قید بامشقت کی صورت تھی، وہ کم از کم کچھ عرصہ کے لئے انقلابی تبدیلیوں کے خلاف "ردِ عمل" کا مظاہرہ ضرور کرتا ہے۔ سو میرا حال تھا کہ یکایک ایک بند ماحول سے ایک کشادہ فضا میں آنے پر "آزادی" کی چکا چوند نے میری آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔

(۴)

لاہور میں رہتے ہوئے مجھے "رفتار" کا احساس ہمہ وقت رہتا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ تغیر کو ثبات ہے اور ہر نیا لمحہ ایک نئی صُورتِ حال کو سامنے لاتا ہے مگر اس کا تجربہ مجھے لاہور میں قیام پذیر ہونے کے دوران ہی ہوا۔ گاؤں کی سڑکیں تو زیادہ تر جامد تصویروں کی طرح ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان پر راہرو کبھی کبھار ہی دکھائی دیتا ہے مگر شہر کی سڑکیں قدموں اور ٹائروں تلے کراہ رہی ہوتی ہیں اور ان کی صُورت ہر لمحے کے بعد تبدیل ہو جاتی ہے۔ پھر اس پر چلنے والے قدم اور ٹائر آہستہ روی کے بجائے تیز رفتاری کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ شہر کے آسمان پر تیز رفتار ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ ایک اور ہی منظر دکھاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے پورا شہر ایک اومنی بس ہے جسے کوئی شرابی ڈرائیور چلا رہا ہے لہٰذا اومنی بس نہ صرف ایک غیر معمولی رفتار سے رواں دواں ہے

بلکہ زگ زیگ انداز میں بھی چل رہی ہے۔ لاہور شہر کی ہر دم تغیّر پذیر فضا میں میرے دماغ کی لہروں کا آہنگ بھی ۲۴ فریم فی سیکنڈ کے عین مطابق تھا۔ اور یہ آہنگ وہی تھا جس کا مظاہرہ فلم دیکھنے کے دوران ہوتا ہے یعنی سکرین پر جب ۲۴ تصویریں فی سیکنڈ کے حساب سے گزرتی ہیں تو حرکت کا احساس جاگتا ہے جو اصلاً فریب نظر کے سوا اور کچھ نہیں۔ مگر جب میں واپس گاؤں آیا تو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے بریک سی لگا دی ہے اور میری رفتار ۲۴ فریم فی سیکنڈ سے کم ہو گئی ہے یہ وہی صورت تھی جو فلم کے سلوموشن SLOW - MOTION میں آجانے پر نظر آتی ہے۔ یعنی جب پردۂ فلم پر حرکت تو دکھائی دیتی ہے، لیکن تصویروں کے درمیانی وقفے کے بڑھ جانے کے باعث ہر شے سست روی کا مظاہرہ کرنے لگتی ہے۔ بہت عرصہ پہلے میں نے اپنے انشائیہ "سست روی" میں شہر اور گاؤں کی رفتار کے اس فرق کو گرفت میں لیا تھا۔ میں نے لکھا تھا:

"شہر کی تیز رفتار زندگی کے بعد دھیرے دھیرے بُجھتی ہوئی یہ شام، یہ سست رو پرندے، یہ تھکا ہوا گاؤں، یہ بیل گاڑی اور اس کا گاڑی بان مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چلتی ہوئی فلم یکلخت سست رو ہو گئی ہے اور ہر شے مضحکہ خیز آہستگی کا مظاہرہ کرنے لگی ہے۔"

اسی انشائیہ میں میں نے گاؤں کی اس رفتار کے بارے میں لکھا تھا کہ

"گاؤں کی رفتار خود فطرت کی رفتار ہے ___ کبھی آپ نے غور فرمایا کہ فطرت کی رفتار کیا ہے؟ ___ اس پودے پر نگاہ ڈالیے! کئی ماہ پہلے کی بات ہے کہ یہ پودا زمین کی سطح کے نیچے اپنے بیج کے خول کو توڑ کر باہر نکلا تھا پھر اس نے کمال آہستگی سے مٹّی میں سے اپنا سر باہر نکالا اور بڑے مزے سے آہستہ آہستہ بلند ہوتا رہا۔ اس میں وہ قوّتِ نمو تھی جو زندگی کا امتیازی وصف ہے اور اسی قوّتِ نمو کے بل بوتے پر اس نے تخلیق کے جُملہ مراحل ایک صبر آزما آہستگی سے طے کیے۔ یہ نکلا، بڑھا پھیلا، پھول نکالے، بیج بنائے اور اپنی ساری انفرادیت، ساری قوّتِ نمو بیج کے

خول میں داخل کر کے جس آہستگی سے آیا تھا اسی آہستگی سے رخصت ہو گیا، پھر مر گیا۔ کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا، کوئی لہر نہیں مچلی، کوئی طوفان نہیں آیا۔ مسرت، غم، تنہائی کوئی بات بھی تو اس پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ تاہم یہ ننھا سا نازک سا خوبصورت پودا فطرت کا صحیح نمائندہ تھا۔ اس کی رفتار کا مظہر تھا —— رفتار جو قوتِ بالیدگی اور حدتِ نمو کی رفتار ہے۔ یہ رفتار میل و فرسنگ کے تابع نہیں بلکہ کائنات کے مخصوص تحرّک کی پیداوار ہے۔ طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب اور موسموں کے ادل بدل سے اس رفتار کی تشکیل ہوئی ہے۔"

سو جب میں لاہور سے واپس گاؤں پہنچا تو سب سے پہلے مجھے فطرت کی اس رفتار کا احساس ہوا اور میرے دماغ کی لہروں کا آہنگ سست رفتاری کا مظاہرہ کرنے لگا۔ جب ماحول کی رفتار سست پڑ جائے تو قدرتی بات ہے کہ اس ماحول کے ناظر کی رفتار بھی کم ہو جاتی ہے اور اشیا اپنے صحیح تناظر میں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ مراقبے یا سمادھی میں چلے جانے والوں کا کمال یہ ہے کہ وہ الٹی گنگا بہاتے ہیں یعنی ماحول کی تیز رفتاری کے باوصف اپنے دماغ کی رفتار کو کم کر لیتے ہیں یعنی اپنی رفتار کو پہلے تو ۲۴ فریم فی سیکنڈ کی رفتار سے کم کر کے ۸ فریم فی سیکنڈ کی اس سطح پر لے آتے ہیں جسے کیتھ فلائڈ (KETH FLOYD) نے ALFA -BRAIN WAVE RHYTHM کا نام دیا ہے۔ پھر اُسے DELTA RHYTHM کی سطح پر لے آتے ہیں جس کی رفتار ڈیڑھ فریم فی سیکنڈ ہے۔ یہ آہنگ کی آخری رفتار ہے کیونکہ اس کے بعد جب ایک فریم فی سیکنڈ کی نوبت آئے تو فلم ایک جامد تصویر کی طرح سامنے آئے گی، ساری حرکت ختم ہو جائے گی اور وقت کی رفتار رُک جائے گی۔ اسی کو موت کا نام بھی ملا ہے۔ گویا سمادھی لگانے یا مراقبہ میں جانے والا اپنی رفتار کو سست کرتے کرتے موت کی دہلیز تک آ جاتا ہے۔ مگر اس دہلیز کو پار نہیں کرتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب فلم سست رفتار ہوتی ہے تو تصویروں کا درمیانی وقفہ بڑھنے لگتا ہے یعنی ۲ تصویروں کے درمیان ایک جھری نمودار ہو جاتی ہے۔ پھر یہ جھری لحظہ بہ لحظہ کشادہ ہو کر پہلے کھڑکی

پھر دروازہ اور آخر میں دالان بن جاتی ہے اور سمادھی لگانے والا اُس میں سے اس ابدیّت کو دیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو چلتی ہوئی تصویروں کے پیچھے ایک بے داغ چادر کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ ابدیت کا یہ نظّارہ اسے بے پناہ مسرّت مہیّا کرتا ہے۔

مگر شہر میں رہتے ہوئے بعض اوقات جب میرے دماغ کے آہنگ کی رفتار عام رفتار سے تجاوز کرتی تو مجھے محسوس ہوتا کہ میں متّواج سمندر سے کٹ کر ایک جزیرے میں تبدیل ہو رہا ہوں اور جزیرے کی خوبی یہ ہے کہ وہاں سے آپ متّواج سمندر کا بآسانی نظّارہ کر سکتے ہیں جبکہ سمندر کی موجوں پر بہنے کی صورت میں آپ چند گز سے آگے دیکھ ہی نہیں سکتے۔ "دیکھنے" کے لیئے پیچھے ہٹنا یعنی اپنی رفتار کو کم کرنا ضروری ہے۔ سو جب میں شہر کی ہاؤ ہو اور ہنگامہ خیزی میں رہتے ہوئے جزیرے کا باسی بن جاتا تو مجھے شہر ایک اور ہی تناظر میں دکھائی دینے لگتا ۔۔ میں نے اپنے ایک انشائیہ "جہاں کوئی نہ ہو" میں اس تجربے کو بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر گوتم اپنی رفتار کو کم کرنے یعنی نروان حاصل کرنے کے لیے جنگل کے بجائے کسی بڑے شہر کا رُخ کرتا تو بہ آسانی اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا تھا کیونکہ بڑا شہر بھی انسان کو وہی احساسِ تنہائی بخشتا ہے جو ایک خاموش جنگل!

سو جب گاؤں واپس آکر میں نے شہر کو فاصلے سے دیکھا تو مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ محض DELTA RHYTHM کی سطح پر اتر آنے ہی سے "دوسری طرف" کی زیارت نہیں ہوتی بلکہ رفتار جب عام رفتار سے تجاوز کر جائے تو بھی انسان "ٹھہراؤ" اور شانتی کی طرف ہی اپنا قدم بڑھاتا ہے۔ کولن ولسن COLIN WILSON نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر آپ ایک سائیکل پر سوار ہو کر نہایت تیز رفتاری سے کسی لوہے کی سلاخوں والے جنگلے کے ساتھ سے گزریں تو آپ کو محسوس ہو گا کہ سلاخیں غائب ہو گئی ہیں اور جنگلے کے پار کا منظر آپ کو صاف دکھائی دینے لگا ہے۔ یہ وہی بات ہے کہ جب فلم کی رفتار کم ہو جائے تو تصویروں کا درمیانی وقفہ نظر آنے لگتا ہے یا جب عارفِ کامل لمحوں کی رفتار کو کم کر لے تو ان کے درمیان کھڑکیاں نمودار ہو جاتی ہیں جن میں سے وہ ایک "جہانِ دیگر" کا نظّارہ کرنے لگتا ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا تو کیا کم سے کم رفتار اور زیادہ سے

زیادہ رفتار ایک ہی شے کے دو نام ہیں؟ مجھے معلوم تھا کہ سب سے زیادہ رفتار روشنی کی ہے یعنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ! میں نے خود سے سوال کیا ہے کہ جب آواز کی مخصوص رفتار کا BARRIER ٹوٹتا ہے تو ایک دھماکہ ہوتا ہے۔ روشنی کی مخصوص رفتار کا BARRIER ٹوٹے تو پھر کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ میں اس سوال کا جواب فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اتنا مجھے معلوم ہو گیا کہ جب کوئی روشنی کی رفتار سے زیادہ رفتار کے ساتھ چلے تو وہ منزل کی طرف روانہ ہونے سے پہلے ہی منزل پر پہنچ جائے گا،

YOU ARRIVE BEFORE YOU START.

جس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ حرکت ختم ہو جائے گی، وقت رُک جاتے گا اور روشنی کی ایک ازلی و ابدی کیفیّت کے سوا کچھ باقی نہیں رہے گا۔ اس مقام کے حصول پر حیرت بھی ختم ہو جائے گی اور حیرت کے ختم ہونے پر ECSTACY بھی باقی نہیں رہے گی۔ ویدانت میں اسے "بدیہہ مکت" کا نام ملا ہے جس میں مبتلا ہونے کے بعد عارف واپس نہیں آ سکتا۔ تصوّف میں اسے ایک مستقل حیرت کا عالم قرار دیا گیا ہے جو اصلاً حیرت کے فقدان کا عالم ہے۔ کیونکہ حیرت تو فاصلے کے بغیر جنم لے ہی نہیں سکتی۔ جب عارف یکتائی کے عالم میں چلا جاتا ہے تو حیرت کیسی؟ بس اس قسم کے خیالات تھے جنھوں نے لاہور سے گاؤں پہنچنے پر مجھے آہستہ آہستہ گھیرے میں لینا شروع کیا اور پھر یکایک میری نظروں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا اور میں حقیقت کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ جب گاؤں آنے کے تقریباً ایک سال بعد میں نے "تصوّراتِ عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں" لکھنا شروع کی تو مجھے اس زاویۂ نگاہ نے اقبال کے حوالے سے "تخلیقی عمل" کے مراحل کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے کا موقع فراہم کر دیا۔

(۵)

"تخلیقی عمل" لکھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جب مخالف قوتیں آپس میں ٹکرا کر

بے ہیئت ہو جاتی ہیں تو اس بے ہیئتی میں سے "تخلیق" ایک جست لگا کر باہر آتی ہے۔ میں نے اس جست کی نوعیت کے بارے میں بھی چند باتیں کہی تھیں۔ مثلاً یہ کہ جب بے ہیئتی کا عالم طاری ہوتا ہے تو یہ دراصل سانس رُکنے کی کیفیت کے مترادف ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے کسی اندھے کنویں میں بند کر دیا جائے اور وہ روشنی کی ایک جھلک پانے کے لیے تڑپنے لگے۔ پھر جب کسی نہ کسی طرح کنویں پر سے پتھر ہٹ جائے اور اسے دُور روشنی کا نقطہ سا دکھائی دے تو وہ پروانے کی طرح اس کی طرف لپکنے کے لیے تیار ہو جائے۔ چنانچہ اندھیرے کی دنیا سے روشنی کے نقطے کی طرف اس کی جست ہی "تخلیق" کے وجود میں آنے کا واقعہ ہے۔ اب سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اندھے کنویں میں قید ہو جانے کی اس تمثیل کے پسِ پشت ایک تلمیح کارفرما تھی جو مجھے اُس وقت دکھائی نہیں دی تھی۔ یعقوبؑ اور یوسفؑ اصلاً ایک جان دو قالب تھے۔ یعقوبؑ کی بینائی یوسفؑ تھا اور یوسفؑ اندھے کنویں میں قید تھا۔ لٰہذا یوسفؑ کا کنویں کی قید سے باہر آنے کا مطلب یعقوبؑ کی بینائی کے واپس آجانے کے مترادف تھا۔ گویا تخلیقی عمل کے دوران ہر تخلیق کار کو اصلاً "بینائی" حاصل ہوتی ہے اور یہی وہ جست ہے جو طویل بے ہیئتی کے عالم سے نکلنے کا ذریعہ بھی ہے اور اس کا ثمر بھی!——

مگر "تصوراتِ عشق و خرد" لکھتے ہوئے مجھ پر تخلیقی عمل کے یہ مختلف مراحل ایک نئی روشنی میں منکشف ہوئے۔ دراصل میرے لیے اب بے ہیئتی (یا طوفان) کا عالم ایک تیز رفتار طواف کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ تصوّف میں پروانے کی تمثیل پیش ہوئی ہے جو خود کو شمع کے سپرد کر کے جلا ڈالتا ہے۔ مگر مجھے اس تمثیل میں ایک اور ہی جہانِ معنی نظر آیا۔ میں نے دیکھا کہ پروانہ عشق کی قوّت سے لیس ہو کر شمع (یعنی حُسنِ ازل) کے گرد جب طواف کرتا ہے تو اس کی رفتار عام رفتار (یعنی ۲۴ فریم فی سیکنڈ) سے تجاوز کر جاتی ہے اور لمحہ بہ لمحہ تیز تر ہونے لگتی ہے تا آنکہ ایک مقام ایسا آتا ہے جب پروانہ شمع کے بہت قریب جا پہنچتا ہے اور مزید قریب ہونے کے لیے اپنے پَروں کو جلا ڈالتا ہے (یعنی ان کی قربانی پیش کر دیتا ہے) کیونکہ پَر تو محض ایک ذریعہ ہیں۔ جب منزل پر

پہنچ گئے تو پھر ذریعہ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ تخلیقی عمل میں اگلا مرحلہ یہ نہیں کہ پروانہ خود کو شمع کے سپرد کر کے اس میں جذب ہو جائے بلکہ یہ ہے کہ وہ شمع کو چھو کر اس سے کسب نور کرے اور پھر واپس آ کر اس نُور کی ترسیل کرنے میں کامیاب ہو۔۔۔ پروانے اور شمع کی اس تمثیل کا اطلاق اگر پیغمبر یا فن کار یا عارف پر کیا جائے تو پھر صورتِ حال یوں اُبھرتی ہے کہ پیغمبر جب واپس آتا ہے تو نُورِ ازل کی مدد سے پورے معاشرے کو منوّر کر دیتا ہے، تخلیق کار جب لوٹتا ہے تو رنگ، سنگ، لفظ یا آواز کی قلبِ ماہیّت کرتا ہے اور عارف جب واپس آتا ہے تو اپنے تجربے کو بیان کرتا ہے (تجربے کو وہ منتقل صرف اسی صورت میں کر سکتا ہے اگر عارف ہونے کے علاوہ وہ ایک تخلیق کار بھی ہو) دوسرے لفظوں میں تخلیقی عمل کی تکمیل تجربے کی منتقلی میں ہے نہ کہ اس کے بیان میں!

چنانچہ میں نے "تصوّراتِ عشق و خرد" لکھتے ہوئے عشق کو منزل نہیں بلکہ ایک ذریعہ قرار دیا۔ میرے خیال کے مطابق عشق ایک ایسی قوّت MOTOR-FORCE تھی جسے سالک اپنی ذات کے سپوتنک کو مدار میں لانے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ مدار میں آنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک تیز رفتار طواف میں مبتلا ہو گیا ہے۔ مگر اس طواف کے دائرے کو توڑنا بھی ضروری ہے ورنہ یہ بھی ایک قید ہے اور اسے توڑنے کے لیے بھی عشق کی قوّت ہی درکار ہے۔ چنانچہ جب سالک یا تخلیق کار طواف کے مرحلے کو عبور کر جاتا ہے تو اس کی رفتار DELT-RHTHM کے اس مقام پر آ جاتی ہے جسے ڈیڑھ فریم فی سیکنڈ متصوّر کیا گیا ہے۔ تصوّف کے مطابق سالک اس مقام کو بھی عبور کرتا ہے اور پھر اس مقام پر جا پہنچتا ہے جو مقام ہونے کے ساتھ ساتھ "بے مقام" بھی ہے۔ یعنی وہ مقام جہاں قطرہ سمندر میں جذب ہو کر اپنی ہستی کو مٹا دیتا ہے یا یوں کہیئے کہ خود سمندر بن جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ تخلیقی عمل کا مرحلہ نہیں تھا۔ کیونکہ تخلیقی عمل میں تو "واپسی" ضروری ہے ورنہ "تخلیق" وجود ہی میں نہ آ سکے۔ لہٰذا فن کار "حُسنِ لازوال" کے لمس سے تو آشنا ہوتا ہے مگر اس میں جذب نہیں ہوتا۔ اور نہ ایک مستقل عالمِ حیرت ہی میں مبتلا ہوتا ہے۔ اپنے وجود کو "برقرار" رکھنے کی یہ سعی ہی اسے تخلیق کار کے منصب پر

فائز کرتی ہے۔

مگر کتاب لکھتے ہوئے مجھے سب سے زیادہ اس خیال نے تقویت دی کہ انتہائی رفتار اور انتہائی سکون (ٹھہراؤ) دراصل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ چاہے انسان سمادھی یا مراقبے کے ذریعہ اپنی رفتار کو کم کرتے کرتے آخری مقام تک پہنچے یا تخلیقی عمل کے تیز رفتار طواف میں مبتلا ہو کر منزل کے قریب آئے، مآل کار وہ ایک ایسے مقام پر ہی پہنچتا ہے جہاں حرکت اور ٹھہراؤ میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ تخلیق کار اس آخری مقام سے ہمیشہ ذرا ورے ہی رہتا ہے ورنہ وہ تخلیق کر ہی نہ سکے۔ یہ آخری مقام اصلاً "اَب" کا وہ نقطہ ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ بیک وقت "ہے" بھی اور "نہیں" بھی۔ میرا خیال یہ تھا کہ اگر "اب" کا یہ مقام تقسیم نہیں ہو سکتا تو پھر اسے "ہونے" کے بجائے "نہ ہونے" کا عالم کہنا چاہیئے۔ ایک ایسا مقام جہاں آگہی تک ختم ہو جاتی ہے۔ آگہی کا مطلب ہی یہ ہے کہ سالک کو THE OTHER کے وجود کا ادراک ہو رہا ہے۔ لہٰذا ازلی و ابدی حقیقت کو ذرا فاصلے سے (چاہے یہ فاصلہ تلوار کی دھار سے بھی کم ہو) دیکھنا ضروری ہے۔ انجذاب یا مستقل حیرت کی صورت میں یہ فاصلہ باقی نہیں رہے گا اور اس فاصلہ کے منہا ہوتے ہی آگہی اور اس کے ساتھ ECSTACY بھی ختم ہو جائے گی۔ سو "تخلیقی عمل" میں تخلیق کا "لمس" کے مقام تک پہنچتا ہے "جذب" کے مقام تک نہیں۔

تخلیقی عمل کے اس پیٹرن سے آگاہی نے مجھے اقبال کے تصوراتِ عشق و خرد کو سمجھنے میں بہت مدد دی۔ میں نے دیکھا کہ اقبال "بے خودی" کے عالم میں بھی "خودی" کو برقرار رکھنے پر زور دیتا ہے اور یہ وہی خودی ہے جو تخلیق کار کو انجذاب کے عمل سے بچا کر اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے قابل بناتی ہے۔ اقبال کا یہ کہنا کہ رسولِ اکرمؐ نے معراج کے موقع پر نورِ ازل کے روبرو کھڑے ہو کر اپنے وجود کو برقرار رکھا بجائے خود تخلیقی عمل کا عطر تھا۔ کیونکہ یہ وحدتِ وجودی مسلک کے متوازی ایک ایسے مسلک کو پیش کر رہا تھا جس کے مطابق "غرقِ نور" ہونے کے بجائے "اکتسابِ نور" کرنا زیادہ نتیجہ خیز عمل تھا۔

(۶)

میں نے اقبال اکادمی کی فرمائش پر یہ کتاب لکھی تھی اور اقبال اکادمی والوں نے کتاب مکمل کرنے کے لئے مجھے چند ماہ کی مہلت دی تھی۔ ایک دیہاتی ہونے کے ناطے میں نے اس فرمائش کو مارشل لا کا حکم سمجھا اور اس ارادے کے ساتھ کتاب لکھنے کا آغاز کیا کہ مجھے اس کا مسودہ یکم دسمبر ۱۹۷۶ء تک بہر صورت تیار کرنا ہے۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ دوسرے لکھنے والوں نے اس سلسلے میں کسی ضابطے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا اور مقررہ تاریخ کے کئی ماہ بعد تک بھی اپنے مسودات اقبال اکادمی کو ارسال نہیں کئے تھے۔ مگر میں نے خود پر پابندی عائد کر کے کام شروع کر دیا اور مسلسل تین ماہ دن رات ایک کر کے کتاب لکھ ڈالی مگر میرا خیال یہ بھی ہے کہ میں نے کتاب خود نہیں لکھی تھی بلکہ کتاب نے خود کو مجھ سے لکھوایا تھا۔ اگر کتاب کا موضوع مجھے اتنی قوّت کے ساتھ اپنی گرفت میں نہ لیتا تو اپنے تمام تر دیہاتی پن کے باوصف میں شاید یہ کتاب بروقت لکھنے میں کامیاب نہ ہو پاتا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی دوسری نوعیّت کا تھا۔ میں نے کتاب لکھنی شروع کی تو اس نیّت کے ساتھ کہ موقع کی مناسبت سے مجھے ایک کتاب لکھنی ہے اور جیسے تیسے اسے مکمل کرنا ہے اور بروقت مکمل کرنا ہے۔ مگر ابھی میں نے کتاب کے بمشکل چند صفحات ہی لکھے تھے کہ میری ذات کی باگ میرے ہاتھوں سے نکل کر کتاب کے ہاتھوں میں چلی گئی اور میں بے پتوار ہونے کی کیفیّت میں مبتلا ہو کر ایک تار لکھتا چلا گیا۔ جب ۵ نومبر ۱۹۷۶ء کو میں نے کتاب مکمل کی تو یوں لگا جیسے میں یہ سارا عرصہ کسی طلسم ہوشربا کی قید میں تھا۔ اور اب تازہ تازہ اس سے برآمد ہوا ہوں۔ میں نے اسی روز انور سدید کو ایک خط لکھا جس میں اپنی اس صورتِ حال کا بالتفصیل ذکر کیا۔ میں نے لکھا:

"لیجئے جناب آج میں نے اپنی کتاب "تصوراتِ عشق و خرد ــــــ اقبال کی نظر میں" مکمل کر لی ہے۔ اقبال اکادمی والوں سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ کتاب کا مسوّدہ یکم دسمبر تک بھجوا دوں گا۔ اب صورت

یہ ہے کہ وقت کی کمی کے باعث میں اسے خود توفیئر نہیں کر سکتا۔ البتہ گاؤں کے ایک "پڑھے لکھے نوجوان" کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔ وہ اسے صاف کر کے لکھ دے گا۔ میں اس پر ایک نظر ڈالوں گا پھر یکم دسمبر کو اسے ڈاک کے سپرد کر دوں گا۔

انور صاحب! میں نے یہ کتاب پورے تین ماہ میں مکمل کرلی ہے یعنی اسے ۵ راگست کو لکھنا شروع کیا اور ۵ رنومبر کو مکمل کرلی۔ اس عرصہ میں مجھے نہیں معلوم کہ کب سورج نکلا اور کب غروب ہوا۔ کب میں سویا اور کب میں نے کھانا کھایا بس ایک خواب کی سی کیفیت تھی سوتے جاگنے کا سا عالم! اس سے پہلے میں "اُردو شاعری کا مزاج" اور "تخلیقی عمل" لکھتے ہوئے بھی شدید ارتکاز کی زد میں آیا تھا۔ مگر ان دونوں کتابوں کا عرصۂ تخلیق سال ہا سال پر پھیلا ہوا تھا۔ مثلاً "اُردو شاعری کا مزاج" تقریباً پانچ برس میں مکمل ہوئی اور "تخلیقی عمل" نے بھی چار پانچ سال لے لئے۔ لہٰذا ان کتابوں کو لکھتے ہوئے ارتکاز کی ڈور وقفے وقفے سے ٹوٹ سی جاتی تھی اور میں سُکھ کے کچھ سانس لے سکتا تھا۔ مگر "تصوّراتِ عشق و خرد" صرف تین ماہ میں مکمل ہوئی اور یہ تین ماہ کا عرصہ ایک تنی ہوئی رسّی پر چلنے میں صرف ہوا۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ ایک بار کسی شخص نے نیاگرا آبشار کو ایک تنی ہوئی رسّی پر چل کر عبور کیا تھا۔ آپ تصوّر کر سکتے ہیں کہ اس شخص کے ارتکاز کا کیا عالم ہوگا کیونکہ توجّہ کے رتّی بھر اِدھر اُدھر ہونے سے وہ دریا میں گر کر جاں بحق ہو سکتا تھا۔ بس یہی حال میرا تھا۔ میں نے یہ عرصہ سُولی پر گزارا ہے۔ مگر آپ یقین کریں کہ جتنی کرب انگیز مسرّت مجھے یہ کتاب لکھتے ہوئے ملی نہ پہلے کبھی ملی تھی نہ آیندہ شاید ملے گی۔ مصنّف خود اپنی تصنیف کا صحیح جج نہیں ہوتا اس لئے ممکن ہے میری بات یکسر غلط ہو مگر اس وقت مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آج سے تیس برس پہلے میں نے جس سفر کا آغاز کیا تھا وہ اس کتاب کی تکمیل پر اب ختم ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں نے خود کو پوری طرح کتاب میں منتقل

کر دیا ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ اس کتاب کو لکھنے سے پہلے میں نے ایک کتاب "آشوبِ آگہی" لکھنا شروع کی تھی۔ وہی جس کے کچھ حصّے "اوراق" میں شائع ہو چکے ہیں۔ احباب نے ان حصّوں کو اس قدر پسند کیا کہ میں نے سوچا اس کتاب پر کام جاری رہنا چاہئے کہ یہ ایک خیال انگیز تصنیف ثابت ہو سکتی ہے۔ مگر جب مجھے درمیان میں اس کتاب کو روک کر "تصوّراتِ عشق و خرد" لکھنا پڑی تو وہ سالہا سال کا مطالعہ جو میں نے "آشوبِ آگہی" کے لئے کر رکھا تھا ایک پُراسرار طریق سے "تصوّراتِ عشق و خرد" میں جذب ہوتا چلا گیا اور آج کہ میں نے اس کتاب کو مکمل کیا ہے تو ساتھ ہی اپنی نامکمل کتاب "آشوبِ آگہی" کی لحد پر فاتحہ بھی پڑھی ہے۔ بھائی جان! میری یہ نئی کتاب ایک قاتل ہے کیونکہ اس نے ایک کتاب کو قتل کر کے اور پھر اس کی قبر کو مسمار کر کے اس پر اپنا رنگ محل تعمیر کیا ہے"!

۷

لاہور سے گاؤں پہنچنے پر میں کچھ عرصہ تو اپنی نئی نویلی "آزادی" کے نشے میں سرشار رہا۔۔۔ پھر جب نشہ اُترا اور آنکھوں کے سامنے سے دھند ہٹ گئی تو میں اپنے ارد گرد کے ماحول کو غور سے دیکھنے لگا۔ میں تقریباً اٹھارہ برس بعد گاؤں میں دوبارہ مقیم ہوا تھا۔ لہٰذا اب گاؤں وہ نہیں تھا جسے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس میں کئی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ پہلی تبدیلی تو یہ تھی کہ گاؤں کے سکول میں بچوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ گاؤں کے کئی لڑکے باہر کے مڈل اور ہائی سکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اور بعض تو کالجوں میں بھی پہنچ چکے تھے۔ جب میں گاؤں سے گیا تھا تو سکول ویران تھا۔ سکول کا واحد ماسٹر جو خود کو ہیڈ ماسٹر کہتا تھا اکثر میرے پاس آ کر شکایت کرتا کہ سکول میں بچّوں کی تعداد بہت کم ہے اگر تعداد میں اضافہ نہ ہوا تو سکول بند ہو جائے گا۔ سو میں نے گاؤں والوں کو تعلیم کی خوبیوں کا احساس دلانا شروع کیا وہ میری باتیں سنتے تو ہنسنے لگتے۔ کہتے آغا جی! یہ لڑکے پڑھ لکھ گئے تو کھیتوں

ہیں کام کون کرے گا۔ میں ان سے کہتا۔ اللہ نے تم لوگوں کو اولاد کے معاملے میں اس قدر نوازا ہے کہ اگر ان میں سے ایک آدھ کو تم نے تعلیم دلوا دی تو تم پر کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا؟ بلبشتر لوگ تو نہ مانے مگر بعض مجھے خوش کرنے کے لئے اپنے خونِ جگر کی ایک آدھ بوند سکول کو دان دینے پر رضامند ہو گئے۔ پھر میں نے سکول کو ایک تفریح گاہ کی صورت دینے کا ارادہ کیا تاکہ بچّے از خود اس کی طرف کھچے چلے آئیں۔ بچّوں کے کھیلنے کے لیے ایک پارک بنایا، پھولوں کی کیاریاں لگوائیں، نئی چٹائیاں، بلیک بورڈ، گھنٹی اور کرسیاں مہیّا کیں، کھیل کا سامان لاکر دیا وغیرہ مگر اس سب کے باوجود سکول میں بچّوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہوا۔ میں نے یہ پیش کش بھی کی کہ جو لڑکا مڈل ہائی سکول یا کالج تک پہنچے گا میں اس کی فیس وغیرہ خود ادا کروں گا۔ اس رعایت کا بھی صرف چند لڑکوں ہی نے فائدہ اٹھایا۔

مگر یہ تو اٹھارہ برس پہلے کی باتیں تھیں۔ جب میں لاہور سے واپس آ کر گاؤں میں دوبارہ مقیم ہوا تو میں نے دیکھا کہ سکول میں خاصی چہل پہل تھی لڑکے سکول کی وردی میں ملبوس میرے گھر کے سامنے سے گزر کر سکول جاتے تو بطخوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے قطار میں چلتے۔ مجھے دیکھتے ہی السّلام علیکم کے فلک شگاف نعرے لگاتے۔ مگر بیک وقت نہیں۔ ایک لڑکا السّلام علیکم کے جواب میں وعلیکم السّلام سُن لیتا تو دوسرا السّلام علیکم کا نعرہ لگاتا اور مجھے دوبارہ وعلیکم کہنا پڑتا۔ لڑکوں کی پوری قطار سے وعلیکم السّلام۔ وعلیکم السّلام کہتے کہتے میرا گلا سوکھ جاتا۔ وہ اس کارروائی سے لطف اندوز ہوتے۔ میرا خیال ہے وہ ازراہِ احترام کم اور ازراہِ شرارت زیادہ اس کارروائی میں حصّہ لیتے۔ مگر میں نے دیکھا کہ گاؤں میں ایک اور پود بھی پروان چڑھ رہی تھی جو سکول پہنچنے کی عمر سے کم ہونے کے باعث ابھی زیادہ تر گلیوں ہی میں گھومتی پھرتی تھی۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ اس نئی پود سے میں اسی رشتہ میں منسلک ہوں جس میں دادا اور پوتا منسلک ہوتے ہیں۔ باپ اور بیٹے کے رشتے میں تمام تر شفقت اور احترام کے باوجود کسی نہ کسی سطح پر

CONFRONTATION ضرور موجود رہتی ہے۔ مگر دادا اور پوتا کے درمیان ایک عجیب سی اپنائیت اور بے تکلفی اُبھر آتی ہے۔ پوتا دادا کو از سرِ نو دریافت کرتا ہے۔ یہی حال نسلوں کا ہے ہر نسل اپنی پیش رو نسل سے تو بغاوت کرتی ہے لیکن اس سے پہلے کی نسل سے ایک انوکھے رشتے میں منسلک ہو کر اسے از سرِ نو دریافت بھی کرتی ہے۔ تجربے اور روایت میں شاید پوتے اور دادا ہی کا رشتہ ہے۔ سو جب گاؤں کی نئی پود نے میری طرف پیش قدمی کی تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک اور ہی مخلوق سے مصافحہ کر رہا ہوں۔ جب میں گاؤں کے بازاروں میں سے گزرتا تو تین تین چار چار برس کے بچّے مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکتے۔ اپنی توتلی زبانوں سے مجھے سلام کرتے۔ جب میں کسی بچّے کے سلام کا جواب دیتا تو وہ خوش ہو کر اپنے ساتھی سے کہتا۔ دیکھ! اس نے میرے سلام کا جواب دیا۔ بعض آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملاتے۔ بعض کے ہاتھ کیچڑ میں لت پت ہوتے۔ میں ان سے کہتا جاؤ پہلے ہاتھ دھو کر آؤ۔ پھر میں ہاتھ ملاؤں گا۔ وہ مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ان میں سے اکثر لباس سے بے نیاز صرف اپنے جسم کی کھال میں ملبوس ہوتے مگر اس بات کی انھیں کوئی پروا نہیں تھی۔

مجھے گاؤں میں دوسری بڑی تبدیلی یہ نظر آئی کہ اب لوگ مذہب کی طرف زیادہ مائل ہو گئے تھے۔ مسلمان ہی نہیں عیسائی بھی۔ اب اس سلسلے میں خاصے بیدار تھے۔ گاؤں میں محرّم کی تقریبات تو ابتدا ہی سے ہو رہی تھیں مگر اب جوش و خروش بڑھ گیا تھا۔ میرے بچپن میں عاشورے کے روز ارد گرد سے دو تین ہزار افراد جمع ہو جاتے تھے۔ اب تعداد دس ہزار سے زیادہ ہو چکی تھی۔ مسجد بھی آباد ہو گئی تھی۔ صبح سویرے گاؤں کی لڑکیاں اور لڑکے مولوی صاحب سے درسِ قرآن لینے کے لئے پہنچنے لگے تھے۔ مولوی صاحب کی صحت بھی پہلے سے بہت بہتر ہو گئی تھی۔ جب فرصت ملتی تو میرے پاس چلے آتے اور اس "تبدیلی" پر طمانیّت کا اظہار کرتے۔ ویسے میرا خیال یہ تھا کہ تبدیلی صرف ہمارے گاؤں میں ہی نہیں آئی تھی بلکہ اُس بڑی تبدیلی کا ایک حصّہ تھی جس سے پورا ملک آشنا ہو رہا تھا اس کی متعدد وجوہ میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ملک میں خوش حالی کی ایک لہر سی آ گئی تھی اور جب خوش حالی آ جائے تو دو

باتیں فی الفور ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ایک تو یہ کہ لوگ اپنے حسب نسب میں دلچسپی لینے لگتے ہیں یعنی خود کو اپنے ماضی سے منسلک کر لیتے ہیں۔ (مثلاً جب ہمارے گاؤں میں خوش حالی کی یہ لہر آئی تو متعدد افراد نے سب سے پہلے اپنے بزرگوں کی قبروں کو پختہ کرایا اور ہر جمعرات کو قبروں پر دیئے جلانے لگے ورنہ اس سے پہلے بہت کم ایسا ہوتا تھا) دوسرے یہ کہ لوگ مذہبی رسوم میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔خوشحالی کی یہ لہر قطعاً مصنوعی تھی۔کچھ روپیہ تو سمندر پار سے آیا تھا اور کچھ دیہاتیوں نے بنکوں سے بطور قرضہ لیا تھا۔اور کچھ تجارت کے ذریعہ کمایا تھا۔پورے ملک میں پیداوار کم مگر اشیا کا لین دین (جسے تجارت کا نام ملا ہے) زیادہ تھا۔ سو لوگوں کے پاس روپے کی فراوانی ہوگئی تھی۔چنانچہ وہ اب اس "دولت" کی حفاظت اور اس میں مزید اضافہ کے لیے قطعاً غیر شعوری طور پر پیر پرستی کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ دولت آجانے سے عیّاشی بھی بڑھ گئی تھی مگر ساتھ ہی اندر کی کثافت کو دھونے کے لیے ظواہر پرستی کا رجحان بھی تیز ہوگیا تھا۔یہ بھی ایک طرح کا کاروبار تھا جسے منافقت کی اساس پر استوار کیا گیا تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ ملک کا مستقبل کچھ زیادہ روشن نظر نہیں آرہا تھا۔سقوطِ ڈھاکہ کے بعد لوگ اندر سے ٹوٹ گئے تھے، وہ اس خوف میں مبتلا ہوگئے تھے کہ کہیں مشرقی پاکستان کا سانحہ مغربی پاکستان میں بھی ظہور پذیر نہ ہوجائے۔سیاسی استحکام کے امکانات بھی کم نظر آرہے تھے۔بھٹّو حکومت نے بظاہر استحکام کی صورت پیدا کی تھی مگر انتشار کی کیفیت بھی کم توانا نہیں تھی۔پورے ملک میں دائیں اور بائیں کی تفریق پیدا ہوگئی تھی اور اب روز بروز بڑھ رہی تھی۔کچھ خبر نہیں تھی کہ کل کیا ہوگا۔عیش پسندی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کیونکہ جب مستقبل خطرے میں ہو تو انسان کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لطف کشید کر لینے کی طرف مائل ہوتا ہے۔مجھے اُس ریڑھی والے کا قصّہ یاد ہے جس کی ریوڑیوں پر سکول کے لڑکوں نے ہلّہ بول دیا تھا۔جب اس نے دیکھا کہ اب ریوڑیوں کو بچانا ممکن نہیں رہا تو وہ خود بھی اس لوٹ مار میں شامل ہوگیا۔اور مٹھّیاں بھربھر کر اپنی ہی ریوڑیاں چبانے لگا۔سو اب پوری پاکستانی قوم اپنی ہی ریوڑیوں پر ٹوٹ پڑی تھی محض اس لیے کہ شاید

پھر پوڑیاں کھانے کا موقع نہ ملے۔ مگر ساتھ ہی مستقبل کے اِس خوف نے انھیں اوہام میں بھی مبتلا کر دیا تھا۔ گنڈا تعویذ، جنتر منتر، درگاہوں پہ حاضری ــــــ یہ سب باتیں عام ہو گئی تھیں۔ میرا خیال ہے یہ سب کچھ غیر محفوظ ہونے کے احساس ہی کا شاخسانہ تھا۔ ہر شخص اپنی جان اور مال کی حفاظت کے لیے سہارے کا متمنّی تھا۔ ملک کا ایک بڑا طبقہ پیروں اور گدّی نشینوں کی طرف راغب ہو رہا تھا۔ انھیں دنوں قریبی گاؤں کے ایک پیر صاحب سے میری دوستی ہو گئی ۔ ایک روز میں لاہور جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ پیر صاحب تشریف لے آئے اور فرمایا کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ میں نے سفر کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے کہا کہ لاہور میں ایک ڈپٹی سیکرٹری صاحب ان کے مرید ہیں انھوں نے دُعا کے لئے بلایا ہے۔ میں نے پوچھا کہ لاہور میں ان کے کُل کتنے مرید ہیں تو ہنسنے لگے۔ کہا کہ سینکڑوں ہیں۔ میں نے ایک اور ڈپٹی سیکرٹری کا پوچھا کہ کیا وہ بھی ان کے مریدوں میں شامل ہیں تو انھوں نے کہا نہیں وہ تو کسی اور محکمہ کے ہیں۔ میرے مرید تو صرف محکمہ ــــــ ؟ سے تعلق رکھتے ہیں ــــــ تو یہ حال تھا! لوگ درگاہوں اور خانقاہوں اور پیروں کی حفاظت میں آ گئے تھے۔

(۸)

مجھے تیسری بڑی تبدیلی گاؤں والوں کے معیارِ زندگی کے سلسلے میں نظر آئی۔ اٹھارہ برس پہلے صورت یہ تھی کہ گاؤں کے مرد زیادہ تر صرف تہمد میں ملبوس نظر آتے اور عورتوں کی قمیصوں میں جا بجا پیوند دکھائی دیتے، مگر اب گاؤں کے بیشتر مردوں بالخصوص نوجوان لڑکوں نے عوامی سُوٹ پہننا شروع کر دیا تھا۔ عورتوں کا لباس تو بالکل تبدیل ہو چکا تھا یعنی نہ صرف یہ کہ وہ صاف ستھرے رنگدار کپڑے پہننے لگی تھیں بلکہ انھوں نے قمیصوں کے گھیرے بھی تنگ کر لئے تھے۔ گاؤں میں بجلی تو ۱۹۵۸ء ہی میں آ گئی تھی مگر یہ ایک طویل عرصہ تک گاؤں والوں کے تصرّف میں نہ آ سکی۔ یہ نہیں کہ انہیں بجلی کے استعمال کی اجازت نہیں تھی بلکہ صرف یہ کہ انھیں بجلی سے مستفید ہونے کی استطاعت نہیں تھی۔ پھر جب خوش حالی آ گئی تو اس کے ساتھ ہی ان کے گھروں میں بجلی بھی آ گئی اور بجلی کے آتے ہی ان کے گھر اور دماغ روشن ہو گئے۔ بیٹری

سے چلنے والا ریڈیو تو اس قدر عام ہو گیا تھا کہ مزدور بھی موسیقی کے بغیر کام نہیں کرتے تھے۔
میں نے اکثر دیکھا کہ مزدور کھیت میں کام کر رہے ہوتے تو ساتھ ساتھ ریڈیو پر نور جہاں اور لتا منگیشکر کے گانے بھی سُنتے۔ ریڈیو سُننے کا میلان اب اتنا عام ہو گیا تھا کہ لڑکے بالے جب بھینس کو نہلانے کے لئے نہر میں اُتارتے تو ریڈیو بھینس کی پیٹھ پر رکھ دیتے۔ بھینس نہاتی رہتی اور ریڈیو بجتا رہتا۔ محاورہ تو بھینس کے آگے بین بجانے کا ہے۔ مگر نئے زمانے کے مطابق اب اسے "بھینس کے آگے ریڈیو بجانے" میں تبدیل کر دینا چاہیئے —— ساتھ ہی اس کا مفہوم بھی بدل جانا چاہیئے۔ کیونکہ پُرانے زمانے کی بھینس تو بین میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی تھی مگر نئے زمانے کی بھینسیں ریڈیو کے فرمائشی پروگرام بغور سُنتی ہیں۔ بلکہ ریڈیو کی آواز نہ آئے تو نہانے ہی سے انکار کر دیتی ہیں۔

گاؤں میں خوش حالی تو آگئی تھی اور گاؤں والوں کا معیارِ زندگی بھی بہتر ہو گیا تھا۔ مگر جو خوش حالی شہروں میں آئی تھی اس کا عشرِ عشیر بھی دیہات تک نہیں پہنچا تھا۔ چند مکانات پختہ ضرور ہو گئے تھے مگر بیشتر لوگ ابھی کچے مکانوں میں اپنی بھینسوں اور بکریوں کی معیت میں رہ رہے تھے۔ زیادہ تر سڑکیں کچی تھیں۔ طبی سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ پندرہ بیس میل کے دائرے میں بمشکل ایک آدھ ڈسپنسری نظر آتی۔ اعلیٰ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ یوں لگتا جیسے شہروں اور دیہاتوں میں دو بالکل مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک قوم کو زندگی کی بیشتر مراعات حاصل ہیں جبکہ دوسری ان مراعات سے ایک بڑی حد تک محروم ہے حالانکہ وہی سب سے زیادہ ٹیکس دیتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ شہری مخلوق حکمران ہے اور دیہاتی مخلوق محکوم! نیز یہ کہ دیہاتی مخلوق سے حاصل ہونے والا ٹیکس نوعیت کے اعتبار سے ٹیکس کم جرمانہ زیادہ ہے۔ کیونکہ ٹیکس کی رقم تو پوری آبادی میں برابری کی بنیاد پر خرچ ہوتی ہے جبکہ وطنِ عزیز میں صورت یہ تھی کہ اس کی آمدنی کا اسّی فی صد سے زیادہ حصّہ شہروں پر خرچ ہو رہا تھا۔

(۹)

گاؤں کی زندگی کا تمام تر دارومدار زراعت پر تھا اور تبدیلی زراعت کے میدان میں

بھی آگئی تھی۔ جب میں نے کالج سے آنے کے بعد زراعت کو اپنا پیشہ بنایا تھا تو فی ایکڑ پیداوار انتہائی کم تھی۔ مصنوعی کھاد کا تو کسی نے نام تک سُنا نہیں تھا۔ انھیں دنوں ایک روز میں زرعی یونیورسٹی فیصل آباد (اُن دنوں لائلپور) کے ڈاکٹر صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ انھوں نے مجھے تین چار چھوٹے چھوٹے گملے منگا کر دکھائے جن میں پودے اُگے ہوئے تھے میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک گملے کا پودا دوسروں سے زیادہ صحت مند اور قد میں بڑا تھا۔ پھر انھوں نے ایک چھوٹے سے تھیلے میں سے "چینی" نکال کر شیشے کی میز پر پھیلا دی اور کہا کہ یہ کارروائی اس کا شاخسانہ ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا اب چینی کو بطور کھاد استعمال کیا جائے گا تو وہ ہنسنے لگے۔ کہا کہ یہ چینی نہیں ہے بلکہ مصنوعی کھاد ہے جس نے امریکی زراعت میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ ہم لوگ اب اس کے تجربات کر رہے ہیں اگر تجربات کامیاب ہو گئے تو یہاں بھی زرعی انقلاب آجائے گا۔ یہ غالباً ۱۹۵۲ء کی بات ہے، مگر طویل عرصہ تک اس سلسلہ میں کوئی انقلاب نہ آیا۔ پھر جب ایوب خاں کا دَور آیا اور نواب صاحب کالاباغ مغربی پاکستان کے گورنر مقرر ہوتے تو اس انقلاب کا آغاز ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں زیادہ خدمات نواب صاحب کالاباغ کی تھیں کیونکہ ایک زمیندار ہونے کے ناطے انھیں زراعت میں زیادہ دلچسپی تھی۔

صورتِ حال یہ تھی کہ مصنوعی کھاد کے استعمال سے فصل کا قد بڑھ جاتا تھا۔ پھر جب فصل پر پھول آجاتے اور اس کا اُوپر والا حصّہ بوجھل ہو جاتا تو لمبا نازک تنا اس کا بوجھ سہار نہ سکتا۔ اور معمولی سی ہوا بھی اسے زمین بوس کر دیتی۔ جب کبھی تُند و تیز ہوائیں چلتیں تو اگلی صبح یوں لگتا جیسے کھیت پر کسی نے سڑک کوٹنے والا انجن چلا دیا ہے: ع:

صبح تک محفلیں ویران فضا خون آشام

لہٰذا ایسی اقسام پیدا کی گئیں جن کا قد ٹھگنا تھا۔ ٹھگنے قد والی اقسام کے زمین بوس ہونے کا خطرہ کم ہوتا ہے۔ حد یہ کہ وہ مصنوعی کھاد کے استعمال کے باوجود زمین بوس نہیں ہوتیں۔ چنانچہ پیداوار میں یک لخت اضافہ ہو گیا۔ پہلے کھیت سے زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس من گندم حاصل ہوتی تھی اب تیس۳۰ پینتیس۳۵ من تک حاصل ہونے لگی۔ مگر پیداوار میں اضافے

کے ساتھ ایک مصیبت بھی آ گئی۔ وہ یہ کہ جب مصنوعی کھاد کے استعمال سے فصلوں کا رنگ گہرا سبز ہو گیا تو حشرات الارض کی عید ہو گئی۔ انھیں نرم و نازک زود ہضم، رس بھری فصلیں نظر آئیں تو وہ اُن پر ٹوٹ پڑے اور اس کارِ خیر کے لیے انھوں نے اپنی نسلوں میں بے پناہ اضافہ شروع کر دیا۔ باغات، کپاس، گنّا، سبزیات — جہاں جہاں مصنوعی کھاد استعمال ہوتی کیڑوں کا حملہ تیز ہو جاتا۔ کپاس پر بطورِ خاص سُنڈیوں کا حملہ بہت سخت ہوتا۔ پہلے صرف ایک قسم کی سُنڈی یعنی چتکبری کبھی کبھار درشن دیتی تھی مگر اب دو اور اقسام کی سنڈیوں نے بھی حملہ کر دیا۔ ان میں سے ایک پیلے رنگ کی سنڈی تھی اور دوسری امریکی سنڈی جس کا نام "ہیلی اوتھس" تھا غالباً بیج کے ذریعے امریکہ سے یہاں پہنچی تھی۔ یہ تینوں سنڈیاں کبھی مل کر اور کبھی باری باری فصل پر حملہ آور ہوتیں۔ ان کا مزاج بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ پیلے رنگ کی سُنڈی کا انداز کمیونسٹوں ایسا تھا۔ وہ پھلوں میں داخل ہوتی تو اُوپر سے پھول کی پتّیوں کو جوڑ کر ایک خیمہ سا بنا لیتی۔ ٹینڈے میں نہ جانے کس طرح داخل ہوتی کہ بظاہر ٹینڈا صاف ستھرا اور بیماری سے محفوظ دکھائی دیتا۔ مگر جب توڑا جاتا تو وہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہوتا۔ شب خون مارنے کا یہ انداز پیلے رنگ کی سُنڈی میں عام تھا۔ امریکی سُنڈی کے مزاج میں ساری امریکی تہذیب سمٹی ہوئی تھی۔ وہ جب ٹینڈے پر حملہ کرتی تو اس کے اندر کی ساری غلاظت ٹینڈے کے اوپر چپک جاتی۔ دور ہی سے نظر آ جاتا کہ امریکی سنڈی اپنے کام میں مصروف ہے۔ تیسری سُنڈی چتکبرے رنگ کی تھی۔ اس میں باقی دونوں سُنڈیوں کے خصائص یکجا ہو گئے تھے۔ مگر اس کا رویّہ زیادہ تر منافقانہ تھا۔ اس میں پاکستان کے بعض چتکبرے افراد کا رویّہ بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔

سُنڈیوں، جوؤں، رس چوسنے والے اور پتّوں کو کھانے والے قسم قسم کے کیڑوں سے بچاؤ کے لیے زہر پاشی کا سلسلہ شروع ہوا تو ہماری زراعت میں ایک اور بُعد کا اضافہ ہو گیا۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ "سبز انقلاب" کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں تو میں صرف تین اجزا کا نام لوں گا۔ یعنی مصنوعی کھاد، ٹھگنے قد کی اقسام اور زہر پاشی!

——— ! جہاں جہاں ان تینوں کے سلسلے میں توازن قائم ہوا فصل کی پیداوار میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ مگر جہاں توازن قائم نہ ہو سکا وہاں بھی پیداوار پہلے سے زیادہ ہو گئی۔ مگر اب زراعت محض زراعت نہ رہی بلکہ ایک صنعت کا درجہ اختیار کر گئی اور جب کوئی شے صنعت بن جائے تو اس میں نفع نقصان کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں اور یہیں سے پاکستانی کسان کے مصائب کا آغاز ہوا۔

(۱۰)

ابھی مجھے گاؤں میں قیام پذیر ہوئے چند روز ہی گزرے تھے کہ دز یرکوٹ کے علاوہ ارد گرد کے دیہاتوں کے کسان بھی میرے پاس آنے لگے۔ وہ تقریباً رو رہے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ کون سی ایسی فصل کاشت کریں جس سے انہیں کچھ "یافت" ہو سکے عجیب سا معاملہ تھا۔ ایک طرف تو پیداوار فی ایکڑ بڑھ گئی تھی۔ اور اجناس کی قیمتیں بھی پہلے سے زیادہ تھیں۔ مگر دوسری طرف کسان رو رہے تھے ! ——— بات دراصل یہ تھی کہ اجناس کی قیمتیں اور زراعت میں استعمال ہونے والی اشیا مثلاً ٹریکٹر، کھاد، کیڑے مار دویات کی قیمتیں حکومت خود مقرر کرتی ہے۔ اور ادپر کہیں بعض سیاسی یا معاشی ضرورتوں کے باعث گڑ بڑ تھی۔ مسئلہ قطعاً مشکل نہیں تھا حکومت کے بہت سے اداروں نے فی ایکڑ پیداوار اور فی ایکڑ اخراجات کا تخمینہ تیار کر رکھا تھا۔ اب کام صرف یہ باقی رہ گیا تھا کہ ان دونوں کو آمنے سامنے رکھ کر قیمت مقرر کر دی جاتی۔ مگر قیمت مقرر کرنے کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی کرم فرما ڈنڈی مار جاتا تھا۔ قیمت اتنی کم مقرر ہوتی کہ بمشکل اخراجات کو پورا کر سکتی۔ اُس زمانے میں اگر کسان کو بنکوں سے روپیہ بطور قرض نہ ملتا تو وہ شاید بھوکوں مر جاتا۔ کسان کا مؤقف یہ تھا کہ اگر حکومت اجناس کی قیمتوں میں اضافہ کرنے کے حق میں نہیں ہے تو وہ بھی اپنا یہ مطالبہ ترک کر دے گا بشرطیکہ حکومت زراعت میں استعمال ہونے والی INPUTS کی قیمتیں کم کر دے۔ مگر نہ تو اجناس کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا تھا اور نہ استعمال ہونے والی اشیا کی قیمتیں گھٹ رہی تھیں۔ سو کسان بہت پریشان تھا۔ مجھے زراعت کا طویل

تجربہ نتھا اس لئے میں نے انھیں باغات اور بعض دیگر اجناس کی طرف متوجہ کیا جن سے انھیں کچھ یافت ہو سکتی تھی۔ مگر باغات لگانے یا دیگر اجناس مثلاً آلو یا سبزیات لگانے کے لیے سرمایہ اور تجربہ درکار تھا نیز نقصان کا بھی اندیشہ تھا۔ اس لئے کسان اس سلسلے میں زیادہ پُرجوش نہیں تھے۔

اسی دوران بھٹّو حکومت نے دوسری بار زرعی اصلاحات نافذ کیں اور زراعت پیشہ لوگوں کے حالات مزید خراب ہو گئے۔ شہر میں رہنے والے لوگ سمجھتے ہیں کہ زرعی اصلاحات کا مطلب فی کس زمین کی ملکیّت کو کم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ حالانکہ اصلاحات کو پورے زرعی نظام کا احاطہ کرنا چاہیئے۔ میں مانتا ہوں کہ اگر کسی شخص کے پاس ہزاروں ایکڑ اراضی ہو تو فاضل زمین اس کے پاس نہیں رہنی چاہیئے لیکن اگر کسی شخص کے پاس چند سو ایکڑ اراضی ہو اور وہ اس سے اچھی خاصی پیداوار بھی حاصل کر رہا ہو مگر اس سے زمین چھین کر ایسے لوگوں میں تقسیم کر دی جائے جنھیں زراعت کی الف ب سے بھی واقفیّت نہ ہو تو اس سے پوری زرعی معیشت تباہ ہو سکتی ہے۔ زرعی اصلاحات کے موقع پر صورت یہ تھی کہ سابقہ زرعی اصلاحات کی رُو سے اب کوئی شخص بھی ۱۵۰ ایکڑ سے زیادہ زمین اپنے قبضے میں رکھنے کا مجاز نہیں تھا۔ پھر بھی ضروری سمجھا گیا کہ زمین کی حدِ ملکیّت کم کر کے فی کس ۱۰۰ ایکڑ کر دی جائے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ زراعت سے منسلک وہ درمیانی طبقہ جو مشینی کاشت کو اپنا رہا تھا، بددل ہو گیا۔ صنعت کار اور تجارت پیشہ لوگ شور مچا رہے تھے کہ حدِ ملکیّت مزید کم کر دینی چاہیئے سو کسانوں کا درمیانی طبقہ زمین کی کوالٹی کو بہتر بنانے اور زرعی مشینیں خریدنے کے سلسلے میں ہچکچاہٹ محسوس کرنے لگا۔ وہ کہتا کیا خبر کل میرے پاس زمین کا یہ قطعہ رہے گا بھی کہ نہیں!

عجیب بات تھی — پُوری دُنیا میں حتّٰی کہ سوشلسٹ ملکوں میں بھی زمین کو نسبتاً بڑے ٹکڑوں میں تبدیل کیا جا رہا تھا تاکہ مشینی کاشت کے امکانات روشن ہوں جب کہ وطنِ عزیز میں حدِ ملکیّت کم کی جا رہی تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ زمین کو مزید ٹکڑوں میں بٹنے سے روکا جاتا۔ مگر زرعی اصلاحات نے بس یہی ایک ”خدمت“ سرانجام دی کہ زمین کو مزید چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ جس سے زرعی معیشت عدمِ توازن کا شکار ہو گئی!

میرا اپنا خیال یہ تھا کہ محض سیاسی وجوہ کی بنا پر نئی زرعی اصلاحات نافذ کرنے کے بجائے سابقہ زرعی اصلاحات کے اسقام کو دُور کرنا چاہیئے تھا۔ مثلاً عام خیال یہ تھا کہ بعض لوگوں نے (اور ایک خاص صوبے کے بعض لوگوں نے) کسی نہ کسی طرح زرعی اصلاحات سے خود کو بچا رکھا تھا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ ایسے لوگوں پر زرعی اصلاحات کی تلوار چلائی جاتی۔ مگر انھیں تو کسی نے نہ پوچھا۔ مزید زرعی اصلاحات کر کے ان لوگوں کو دوبارہ تہِ تیغ کر ڈالا جو پہلے ہی اس کا وار سہہ چکے تھے۔ پنجاب کے کسانوں کو بالخصوص اس سے بہت نقصان پہنچا لیکن شہری حضرات کو اس بات کا علم نہیں ہے۔

(۱۱)

گاؤں میں دوبارہ قیام کے بعد مجھ پر آہستہ آہستہ یہ بات آئینہ ہوتی چلی گئی کہ وہ طبقاتی آویزش جو پاکستانی شہروں میں خاصی نمایاں تھی اب دیہات میں بھی شروع ہوگئی ہے۔ شہروں میں تو ایّوب کے دَور ہی میں دائیں اور بائیں بازو کے طبقات ایک دوسرے کے مقابل آگئے تھے اور یہ بات صرف پاکستان تک ہی محدود نہیں تھی، ساری دُنیا دو متحارب گروپوں میں تقسیم ہوگئی تھی، جن میں سے ایک کی قیادت روس اور دوسرے کی امریکہ کر رہا تھا۔ ایّوب کے زمانے کی بات ہے کہ ایک روز انور عزیز صاحب نے (جو بعد ازاں بھٹّو حکومت میں اور اب دوبارہ وفاقی وزیر مقرر ہوئے ہیں) اس صورتِ حال پر بہت عمدہ تبصرہ کیا۔ اُن دنوں وہ سرگودھا میں رہتے تھے ان کے والد ڈاکٹر عزیز نے مجھے بیٹا بنایا ہوا تھا اور اس اعتبار سے انور عزیز میرے بھائی تھے۔ چنانچہ جیسا کہ بھائیوں کا دستور ہے وہ اور میں اور عصمت اللہ دن رات ایک ساتھ رہتے۔ ہماری دوستی اتنی پکّی تھی کہ ہم بغیر بحث کے ایک دوسرے کی بات مانتے ہی نہیں تھے۔ مگر ایک روز انور عزیز نے ایسی بات کہی کہ خلافِ معمول میں نے اور عصمت اللہ نے بغیر کسی بحث کے ان سے صوفی صد اتفاق کر لیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ جس طرح گاؤں میں جب دو زمیندار ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوتے ہیں تو گاؤں کے ادنیٰ باسی بھی تقسیم ہو جاتے ہیں، کچھ

لوگ ایک زمیندار سے اور کچھ دوسرے زمیندار سے منسلک ہو کر بآوازِ بلند ایک دوسرے پر کیچڑ اڑانے لگتے ہیں۔ سو یہی حال ہم چھوٹے چھوٹے ملکوں کا ہے کہ ہم بھی دو بڑی طاقتوں کی لڑائی میں ادنیٰ لوگوں کا رول ادا کر رہے ہیں۔ بات بالکل صحیح تھی۔ اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا:

بُدّھو میاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں
گو خاکِ راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

مگر شہری زندگی میں یہ آویزش جو HAVES اور HAVE - NOTS کے درمیان شروع ہوئی تھی اب دوسرے شعبوں میں بھی سرائیت کر گئی تھی۔ ادب میں بالخصوص اس نے تند و تیز مباحث کی صورت اختیار کر لی تھی۔ آدھے ادیب سبز رنگ میں بھیگ گئے تھے۔ باقی نے سُرخ رنگ قبول کر لیا تھا۔ صرف چند ادیب ایسے تھے جو ادب کو کسی بھی ازم کے لئے آلۂ کار بنانے پر رضامند نہیں تھے۔ وہ کہتے کہ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ ادیب کی کس ازم سے وابستگی ہے بالکل جیسے ہمیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ کس مذہب یا فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمیں تو غرض اس بات سے ہے کہ کیا اس نے ادب پارہ تخلیق کیا ہے یا پمفلٹ؟ "اوراق" اسی گروہ کی آواز تھا اور آزاد خیال LIBERAL - MINDED ہونے کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتا تھا مگر جیسا کہ ہوتا آیا ہے، بین بین چلنے والا ہمیشہ دونوں متحارب گروہوں کی نفرت اور تشدّد کا نشانہ بنتا ہے لہٰذا اوراق اور مدیرِ اوراق بھی دونوں متحارب گروہوں کی نفرت کا ہدف بنے۔ تاہم وہ اپنے مسلک پر قائم رہے۔ انھیں دنوں جب ہمارے دائیں اور بائیں بازو کے ادبا ایک دوسرے کے گریبانوں پہ جھپٹ رہے تھے تو میں نے اوراق کے ایک اداریے میں لکھا:

"۱۹۶۶ء میں جب اوراق پہلی مرتبہ منصّۂ شہود پر آیا تو ہمارے بعض مہربانوں نے بغیر کسی جھجک کے اعلان فرمایا کہ یہ بائیں بازو کا پرچہ ہے۔ ۱۹۷۲ء میں جب اوراق کا دورِ ثانی شروع ہوا تو ہمارے بعض دیگر کرم فرماؤں نے بغیر کسی توقف کے اسے دائیں بازو کے کھاتے میں ڈال دیا۔ ہماری نظروں میں قصور ان میں سے کسی ایک گروہ کا نہیں۔ جب ساری زندگی دائیں اور بائیں کے

پھیر میں گرفتار ہو تو ادب بے چارہ اس ہیر پھیر سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے؟
اب ہم کس طرح اپنے ان مہربانوں اور کرم فرماؤں کو بتائیں کہ ادب، ادب ہے
اسے دائیں اور بائیں، سُرخ، سبز یا سیاہ میں تقسیم کر کے ایک کی حمایت اور
دوسروں کی مذمّت کرنا ایک بالکل غلط نظریہ ہے۔ ہمیں اس سے کوئی غرض
نہیں کہ کسی ادب پارے کا خالق کس گروہ سے منسلک یا کس نظریے کا قتیل ہے۔
ہمیں تو محض یہ دیکھنا ہے کہ اس نے ادب پیدا کیا ہے یا پمفلٹ! ادب کی
ہر صورت ہمارے لئے ایک قیمتی اثاثہ ہے چاہے اسے سُرخ رنگ کی
پلیٹ میں رکھ کر پیش کیا جائے یا سبز رنگ کی پلیٹ میں! پمفلٹ کی صورت
میں ہم اظہارِ ہمدردی ہی کر سکتے ہیں۔"

دائیں اور بائیں بازو کی یہ آویزش متعدی بیماری کی طرح اب شہروں سے دیہات میں بھی پھیلنے لگی تھی گو شدت اور شدّت کے اعتبار سے یہ ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ دراصل ہر گاؤں کے اندر ایک مِنی MINI شہر چھپا ہوتا ہے۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹّی خاصی زرخیز ثابت ہو سکتی ہے اور بعض لوگ اس کے لئے نمی کا بطورِ خاص اہتمام بھی کرتے ہیں۔ ہر گاؤں میں ایک طبقہ تو زراعت سے براہِ راست متعلق ہوتا ہے۔ اس میں بڑے کاشتکار، چھوٹے کاشت کار، مزارعین اور ٹھیکیداران وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ پرندوں کی طرح اپنا رزق زمین سے حاصل کرتے ہیں۔ دوسرا طبقہ دُکانداروں کے علاوہ کمیوں مثلاً جولاہوں، موچیوں، لوہاروں، ترکھانوں، کمہاروں، نائیوں، دھوبیوں اور تیلیوں وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ سب لوگ پیشہ کے اعتبار سے دکاندار ہوتے ہیں یعنی خود پیدا نہیں کرتے بلکہ پیدا شدہ اشیاء کو کوٹتے، تراشتے، بناتے، پیٹتے یا دھوتے ہیں۔ اور اس کی اُجرت وصول کرتے ہیں۔ ہزارہا سال سے یہ دونوں طبقے ہر گاؤں میں موجود رہے ہیں۔ اور ان میں کبھی تصادم نہیں ہوا مگر دونوں میں زیرِ زمین نفرت ضرور موجود رہی ہے۔ جب میں دوسری بار گاؤں میں آ کر مقیم ہوا تو میں نے دیکھا کہ دکانداران کا یہ طبقہ نہ صرف کسانوں کے مقابلے میں زیادہ خوشحال تھا بلکہ اس کے ہاں زیادہ تعلیم

بھی آگئی تھی۔ چونکہ ان لوگوں کی مانگ خلیج کے ممالک نیز خود پاکستان کے شہروں میں زیادہ تھی لہٰذا انھوں نے اپنے ایک دو بیٹوں کو بیرونِ ملک بھیج کر روپیہ کمایا تھا۔ بعض نے تو شہروں میں اپنے لیے جائیداد بھی پیدا کرلی تھی اور بعض نے اپنے بچّوں کو اعلیٰ تعلیم بھی دلوادی تھی۔ لہٰذا جب بھٹّو دور میں طبقاتی آویزش کو ہوا ملی تو ہر گاؤں کے اندر کا مِنی شہر فعّال ہوگیا۔ بایں ہمہ جہاں تک گاؤں کی زندگی کا تعلق ہے مَیں ان دنوں اس نتیجے پر پہنچا کہ آویزش کاشتکاروں اور دکانداروں کے درمیان نہیں تھی بلکہ زرعی مزدوروں اور گاؤں کے صاحبِ جائیداد لوگوں کے درمیان تھی۔ چنانچہ مجھے دکاندار اور کاشتکار ایک پلڑے میں اور زرعی مزدور دوسرے پلڑے میں نظر آئے۔ دراصل آج بھی ہمارے دیہات میں زرعی مزدور ہی سب سے زیادہ پس ماندہ ہیں۔ یہ طبقہ بھوکوں تو نہیں مرتا۔ مگر دکانداروں اور کسانوں کے مقابلے میں اس کی حالت بہت پتلی ہے۔ میرے خیال میں اگر حکومت دیہات میں چھوٹی صنعتیں قائم کرلے تو ان زرعی مزدوروں کی حالت بہتر ہوسکتی ہے۔

(۱۲)

جون ۱۹۷۸ء میں مَیں نے ایک چھوٹا سا سفر کیا۔ دراصل یہ سفر بھی نہیں تھا۔ بس ایک روز محض منہ کا مزہ بدلنے کے لیے مَیں نے سوچا کہ چلو وادئ کاغان کو دیکھنے کی دیرینہ آرزو کی تکمیل کرتے ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں جمیل آذر اور مشتاق قمر سے رابطہ قائم کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پہلے ہی پا بہ رکاب بیٹھے تھے۔ اِدھر ایبٹ آباد میں سعید احمد اختر صاحب بطور ایڈیشنل کمشنر آچکے تھے اور وہ مجھے بار بار لکھ چکے تھے کہ میں ایبٹ آباد آؤں۔ سو ہم تینوں (یعنی دی تھری مسکیٹرز) نے فیصلہ کیا کہ پہلے ایک روز اختر صاحب کے پاس ایبٹ آباد میں دَم لیں گے۔ پھر دَم لے کر آگے بڑھیں گے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار سیاحت کے بہت شوقین ہیں۔ اور ایبٹ آباد سے لے کر وادئ کاغان اور سوات تک کے علاقے کو اپنے قدموں تلے بار بار روند چکے ہیں۔ لاہور میں جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی تو وہ وادئ

کاغان کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے۔ دراصل ان کی اس تعریف ہی نے میرے شوق کو تازیانہ لگایا تھا۔ باتوں باتوں میں میں نے انھیں بتایا کہ میں جون میں وادیٔ کاغان جانے کا آرزومند ہوں تو انھوں نے جوابِ آں غزل کے طور پر مجھے اطلاع دی کہ وہ خود بھی انہی دنوں کاغان جا رہے ہیں۔ مجھ سے انھوں نے ایبٹ آباد پہنچنے کی تاریخ دریافت کی اور پھر وعدہ کیا کہ وہ اور ممتاز منگلوری اسی روز ایبٹ آباد پہنچ جائیں گے اور پھر قافلہ کاغان کے لئے روانہ ہو جائے گا۔

سو ایک روز ہم لوگ ۲ کاروں میں کاغان کی طرف روانہ ہو گئے۔ مگر جلد ہی ہمیں محسوس ہوا کہ ہم آزاد نہیں تھے بلکہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے قبضۂ قدرت میں تھے۔ وہ جگہ جگہ کاریں رکوا کر ہمیں اس علاقے کی آب و ہوا، تاریخ، ثقافت وغیرہ پر لیکچر دیتے۔ ہر جگہ ان کے جاننے والے موجود تھے۔ ہم تینوں کہ آزاد پنچھیوں کی طرح سفر کرنے کے آرزومند تھے، ہمیں جلد ہی محسوس ہو گیا کہ ہم نے پرائمری سکول میں داخلہ لے لیا ہے۔ تاہم جب ہم بالاکوٹ سے آگے بڑھے تو سفر اتنا خطرناک ہو گیا کہ ہم اپنے ہیڈ ماسٹر کو بھی بھول گئے۔ ارادہ یہ تھا کہ ہم لوگ شام تک جھیل سیف الملوک جا پہنچیں گے۔ مگر راستے میں شوگران تھا جسے دیکھے بغیر آگے جانا ممکن نہیں تھا۔ شوگران تک پہنچنے کا راستہ بھی کم خطرناک نہیں تھا۔ مگر ہم جیسے تیسے وہاں پہنچ ہی گئے اور وہاں پہنچ کر ہمیں محسوس ہوا کہ ہم ایک اور ہی دُنیا میں آ گئے ہیں۔ سامنے بلند و بالا برف پوش پہاڑ تھے۔ ذرا چھوٹے قد کے پہاڑ جنگلوں کی سیاہ چادر میں ملبوس تھے اور جڑی بوٹیاں اتنی زیادہ تھیں کہ چلنا بھی مشکل تھا۔ جلد ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ اس علاقے کی وجۂ شہرت اس کے پہاڑ نہیں بلکہ جڑی بوٹیاں ہیں۔ جس پہاڑی بنگلے میں ہم ٹھہرے تھے وہاں پہلے ہی کچھ غیر ملکی رہ رہے تھے۔ انھوں نے زمین پر جڑی بوٹیوں کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اُسار رکھی تھیں۔ اور ان بوٹیوں پر غور کرنے میں اس قدر منہمک تھے کہ محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان پر ڈاکٹریٹ کا تھیسس لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے افکار و گفتار میں مزید تیزی آ گئی تھی۔ وہ اردگرد

کے پہاڑوں اور پہاڑی چشموں پر لیکچر دینے کے علاوہ جڑی بوٹیوں کے بارے میں بھی معلومات کے ڈھیر لگا رہے تھے۔ مگر ہماری حالت، حالتِ زار میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم تینوں بوٹیاں نگل کر پہاڑ سے نیچے کود جاتے، میں نے یہ تجویز پیش کی کہ چونکہ آگے راستہ نہایت دشوار گزار ہے اور صرف ڈاکٹر صاحب ہی اتنے خطرناک راستے کو بخیر و خوبی طے کر سکتے ہیں اس لیے ہم ان سے لوٹ جانے کی اجازت لے لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ہماری اس تجویز میں ہمارے اعلانِ شکست کو پڑھ کر بخوشی ہمیں اجازت دے دی اور ہم اسی شام واپس بالاکوٹ آ گئے۔ رات ہم نے دریا کے کنارے کے ایک ہوٹل میں بسر کی۔ اس رات ہوٹل میں ہم تینوں کے علاوہ اور کوئی مسافر نہیں تھا۔ مشتاق قمر کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ ہوٹل والوں نے یہ ہوٹل محض مسافروں کو لوٹنے کے لئے تعمیر کر رکھا ہے۔ اس لیے رات بارہ بجے کے قریب وہ ہم پر حملہ آور ہوں گے اور ہمیں لوٹ لیں گے۔ منیجر اور ویٹر دونوں کی آنکھوں میں انھیں خونی ڈورے بھی نظر آ گئے تھے جو مجھے اور جمیل آذر کو کوششِ بسیار کے باوجود نظر نہیں آئے تھے۔ مگر رات کے واقعے نے ثابت کر دیا کہ مشتاق قمر کے خدشات سو فی صد درست تھے۔ واقعی آدھی رات کے قریب ہم تینوں لٹ گئے۔

ہوا یہ کہ رات بارہ بجے کے لگ بھگ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ جمیل آذر خوابِ خرگوش میں مبتلا خراٹے لے رہے تھے، جبکہ مشتاق قمر بستر میں بیٹھے ڈاکوؤں کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے مشتاق قمر کی "سمادھی" میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور کمرے سے نکل کر بالکونی میں جا کھڑا ہوا۔ بس اسی لمحے میں تو لٹ گیا۔ میرے سامنے ایک تیز رفتار، چمکدار، سفید جھاگ میں لپٹا ہوا دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کے باہر بتدریج اوپر اٹھنے والی پہاڑیوں پر جا بجا روشنی کے بلبلے سے نظر آ رہے تھے۔ اور اوپر آسمان پر انھیں سے ملتے جلتے ستاروں کے روشن بلبلے نمودار ہو گئے تھے۔ ایک لحظہ کے لیے مجھے یوں لگا جیسے زمین آئینہ ہے جس میں آسمان منعکس ہو رہا ہے۔ دوسرے لمحے مجھے یوں لگا جیسے زمین اور آسمان کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں ہے جہاں زمین ختم ہوئی ہے وہیں سے آسمان کا آغاز ہو گیا ہے اور جہاں آسمان اپنی آخری حد کو پہنچا

ہے وہیں سے دوبارہ زمین شروع ہوگئی ہے۔ایک عجیب سا خوابناک منظر تھا جس میں جھاگ اڑاتے ہوئے تُند و تیز دریا کی روانی نے ایک انوکھی کیفیت شامل کر دی تھی۔ پورا منظر جیسے بولنے لگا تھا اور لمحہ بہ لمحہ مجھے خود میں جذب کرتا جا رہا تھا۔ مگر اس سے قبل کہ میں اس روشنی میں جذب ہو کر خود بھی ایک روشن بلبلے میں تبدیل ہو جاتا، میں نے جمیل آذر اور مشتاق قمر کو آواز دی کہ فوراً باہر بالکنی میں آ جائیں۔ مشتاق قمر سمجھے کہ بالآخر ان کے محبوب ڈاکو آ پہنچے ہیں لہٰذا وہ تو لپک کر باہر آ گئے البتہ جمیل آذر آنکھوں سے نیند کو پونچھتے ہوئے راستہ ٹٹول کر باہر پہنچے۔ اور پھر باہر آتے ہی وہ دونوں بھی ہوٹل، ڈاکو، سفر کی کوفت اور ڈاکٹر غلام حسین کے لیکچر ۔۔۔ سب کچھ بھول گئے اور گُم صُم ۔۔۔ حیرت زدہ تا دیر اس ملکوتی منظر میں گاہے ڈوبتے گاہے اُبھرتے جذب ہوتے رہے۔

مجھے زندگی میں اور بھی بہت سے حسین مناظر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن جو روحانی کیف مجھے اس منظر میں ملا پہلے کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس منظر کی اہم ترین خصوصیت اس کی سحر طراز "روشنی" تھی۔ ممکن ہے اس کا تعلق اُن روشنیوں[1] سے بھی ہو جو اس منظر کی لحد میں دفن تھیں اور جن کے لمس سے میرا لاشعور آشنا ہو گیا تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس روشنی کا ادراک اُس نئی ذہنی اور احساسی واردات سے بھی منسلک تھا جس میں سے میں ان دنوں گزرنے لگا تھا۔

(۱۳)

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ رُوح کو جسم کے مقابلے میں زیادہ جگہ یعنی SPACE درکار ہے تو یہ بات اس منظر سے پھوٹنے والی رُوحانی مسرت کو دیکھ کر مجھے بالکل سچ لگی۔ واقعی جسم کی جغرافیائی حدود تو متعین ہیں وہ ان حدود سے باہر نہیں جا سکتا۔ مگر رُوح بعض اوقات جسم کے اندر خود کو ایک قیدی کی طرح محسوس کرتی ہے اور جب کبھی اسے جسم سے باہر کوئی حسین چہرہ، کوئی خوابناک منظر، دُور یوں تک پھیلا ہوا صحرا، بلند و بالا پہاڑ یا ستاروں بھرا آسمان

---

[1] سید احمد شہیدؒ اور سید اسمعیل شہیدؒ۔

نظر آتا ہے تو وہ جسم سے منقطع ہوئے بغیر باہر کو لپکتی ہے اور باہر کی SPACE کو آنِ واحد میں جیسے اوڑھ لیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ رُوحانی تجربہ رُوح کی اس جَست ہی کا دوسرا نام ہے۔ اپنی زندگی کے اُن ایّام میں (جن کا ذکر یہاں مقصود ہے) میری رُوح بھی SPACE کی تلاش میں تھی۔ چنانچہ جب بالاکوٹ میں اُسے لحظہ بھر کے لئے جسم سے بلند و بالا ہونے کا موقع ملا تو اس نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا مگر اس کے علاوہ بھی مجھے ہمہ وقت یہ محسوس ہو رہا تھا کہ مَیں کسی تاریک غار سے باہر آکر ایک انوکھی روشنی میں نہانے لگا ہوں یہ ایک طرح سے میرا "دوسرا جنم" بھی تھا ——
چنانچہ بالاکوٹ کے تجربے میں مجھے پگھلے ہوئے سونے کا جو سمندر اپنے چاروں طرف نظر آیا تھا وہ اب رُوپ بدل بدل کر میری نظموں میں اُبھرنے لگا تھا۔ مثلاً نظم "دُھوپ" کا یہ حصّہ:

یہ اُجلی تمازت کا سیلِ رواں
میرے خستہ بدن سے تھکاوٹ کی میلی تہوں کو اتارے
میرے بند کانوں میں بھونروں کی باتی کا امرت گرائے
مجھے اپنے پھیلے ہوئے زرد دامن میں بھر لے
میں سونے لگوں تو مجھے گدگدائے
میں جاگوں تو میرے پپوٹوں پہ
کرنوں کی، خوابوں کی برکھا انڈیلے
یہ اُجلی تمازت کا سیلِ رواں اب
مجھے پار کر کے تیرے در پہ دستک اگر دے رہا ہے
تو اپنے مقفّل کواڑوں کو تُو کھول —— باہر نکل
ہاتھ اپنے ہلا کر اسے اپنی جانب بُلا
اپنے خستہ بدن پر سے تُو اپنی میّت کا پتّھر ہٹا
گھاس کو اِذن دے وہ حسیں سبز قالین اپنا بچھائے

درختوں پہ گجرے نظر آئیں، طائر چہکنے لگیں
برف پگھلے
غصیلی، سرافراز، بے رحم ٹھنڈی ہوا اپنے گھر کو سدھارے
دُکھی فرش سے ماورا عرش تک
دُھوپ کا اِک تمتماتا سمندر رہے موجزن
جس میں تُو —— اور مَیں
سُرخ بجروں کی صُورت، نہ ڈوبیں نہ اُبھریں
فقط دُھوپ کو اپنے چہروں پہ مَل کر کہیں
ہم اَمر ہو گئے ہیں!

مگر نظم "بیکراں وسعتوں میں تنہا" تک پہنچتے پہنچتے میری رُوح نے اپنے پھیلاؤ کے لیے نُوری سالوں پر پھیلی ہوئی SPACE بھی دریافت کر لی تھی جس کے مرکز میں مجھے "سُرخ روشنائی" کا ایک نقطہ نظر آ گیا تھا۔ یہ ایک طرح کا کائنات سے باہر نکل کر کائنات کو دیکھنے کا ایک انوکھا تجربہ بھی تھا۔ میرا خیال ہے کہ اصلاً تجربہ وہی تھا جُو "اک سیّال سونے کا ساگر دست بستہ کھڑا ہوں" اور "دُھوپ" میں اُبھرا تھا —— اس فرق کے ساتھ کہ اُن نظموں نے مجھے تجربے کے ابتدائی مراحل سے آشنا کیا تھا یعنی روشنی کی برکھا میں بھیگنے یا روشنی میں جذب ہونے کی کیفیات سے مگر "بیکراں وسعتوں میں تنہا" تک پہنچتے پہنچتے میں تجربے کے آخری مراحل سے گزرنے لگا تھا۔ یعنی روشنی کو چھُو کر پیچھے ہٹنے اور پھر فاصلے سے پُوری منوّر کائنات کو دیکھنے پر قادر ہو رہا تھا! نظم کا آخری بند یہ تھا:

مَیں سُرخ دھبّہ ہوں
کپکپاتے مہیب عکسوں کا سلسلہ ہوں
تمام چہرے جو تیرے اندر سے جھانکتے ہیں
میرے ہی چہرے کی جھلکیاں ہیں
میرے ہی سینے کی دھڑکنیں ہیں

یہ تیز رنگوں کے تُند دریا
جو دُکھ کے کوہِ گراں سے رِس کر
زمیں کی بنجر، اُداس سی سلطنت کو چھُو کر
اِس ایک بے انت سُرخ نقطے کے بحرِ ظلمات میں گرے ہیں
مرے ہی بے نام دست و پا ہیں
یہ جگمگاتی سی کہکشائیں جو ابتدا سے
خلا کی ظلمت میں قید باہر کو اُڑ رہی ہیں۔
گرہیں بنی ہیں
وہ میں کھڑی ہیں
وہیں ——— جہاں سُرخ روشنائی کا ایک قطرہ
کسی قلم کی کثیف نب سے ٹپک پڑا ہے
وہ ایک قطرہ جو میرا دل ہے
جو میرے عکسوں کا سلسلہ ہے
جو میرے ہونے سے سُرخرُو ہے
جو میری پابستہ آرزو ہے!

(۱۴)

خود سے باہر نکل کر خود کو دیکھنے کے اس تجربے نے مجھے ایک عجیب سے عالم میں پہنچا دیا تھا۔ میں شام کو جب کھیتوں میں چہل قدمی کرتا تو دیکھتا کہ چاروں طرف دُور دُور تک کوئی ذی رُوح نہیں ہے۔ میرے پاؤں کے نیچے زمین ہے جس نے افق کے ساتھ ساتھ گھومتے ہوئے ایک دائرہ سا بنا لیا ہے۔ اُوپر آسمان ہے جو جُھک کر افق سے آملا ہے اور یوں خود بھی ایک عظیم دائرے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ مجھے زمین اور آسمان کے دائرے افق کے کناروں پہ ایک دوسرے پر منطبق ہوتے ہوئے نظر آتے بالکل جیسے ایک پیالے پر

دوسرا پیالہ اوندھا رکھ دیا جائے تو ایک گیند سا بن جاتا ہے۔ میں محسوس کرتا کہ میں اس گیند کا مرکزہ ہوں۔ پھر میں چاہتا کہ میں مرکزہ نہ رہوں کیونکہ مجھے دو پیالوں کے اندر محبوس ہونا اچھا نہ لگتا۔ سو میں تیز تیز قدم اٹھاتا اپنی جگہ سے دُور ہٹنے کی کوشش کرتا مگر جب رُکتا اور چاروں طرف نظر دوڑاتا تو دیکھتا کہ میں تو اسی طرح اس گیند میں بند ہوں جیسا کہ چند لمحے پہلے تھا۔ سو میں دائرے سے باہر نکل کر خود کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں مانتا ہوں کہ آزادی کا یہ تابناک لمحہ زیادہ دیر پا نہیں تھا۔ میں بہ مشکل دائرے سے نکل پاتا تھا کہ دوبارہ اس میں قید ہو جاتا تھا تاہم باہر نکلنے کی ایک صورت تو پیدا ہو گئی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ میں خود کو پھیلتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔ یہ پھیلاؤ بھی محض چند لمحات کے لیے تھا مگر اس سے مجھے آزادی کا احساس ضرور ہوا۔ وجہ یہ کہ روشن نقطے کا پھیلاؤ افق کی لکیروں کو مٹا دیتا تھا اور جب لکیریں مٹ جاتی تھیں تو گویا حدیں مسمار ہو جاتی تھیں اور لامحدودیت کا ایک بے کراں احساس مجھے پل بھر کے لیے جیسے چھو لیتا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ جب لامحدودیت کا یہ احساس مجھ پر چھا جاتا تو میں سارے کا سارا لامحدودیت پر منطبق ہو کر تنہا ہو جاتا۔ احساسات تک ختم ہو جاتے، حیرت بھی باقی نہ رہتی۔ وجود کا نام و نشان تک نظر نہ آتا۔ ہر شئے نیست ہو جاتی اور میرا دم اُکھڑ جاتا۔ سو میں ڈوبتے ہوئے شخص کی طرح آخری بار ہاتھ پیر مارتے ہوئے سطح پر آجاتا اور پھر ذرا فاصلے سے خود کو لامحدودیت کی دہلیز پر کھڑے دیکھتا۔ تب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ "نروان" جس کے لیے خلقِ خدا ہزاروں برس سے دیوانی ہو رہی ہے جب حاصل ہوتا ہے تو کچھ باقی نہیں رہتا اور جب کچھ باقی نہ رہے تو اس کے ساتھ ہی جنم جنم کے اُس دُکھ کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے جس سے نجات پانے کے لیے خلقِ خدا نے نروان کی خواہش کی تھی مگر میں سوچتا کہ یہ تو وہی بات ہوئی کہ مرض کو ختم کرنے کے لئے مریض کو بھی ختم کر دیا جائے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری!

لہٰذا نروان میں جہاں دُکھ ختم ہوتے وہاں خوشیاں بھی جاں بحق ہو جاتیں۔ مجھے نروان ایک بہت بڑی نفی NEGATION کے رُوپ میں دکھائی دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ

اصل کیفیت تو وہ ہے جو نروان سے ذرا پہلے حاصل ہوتی ہے یعنی جب سالک لامحدودیت کے لمحے سے آشنا تو ہوتا ہے مگر اس میں جذب ہو کر فنا نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ میں دیکھتا کہ تمام آنکھوں سے مَیں خود ہی جھانک رہا ہوں اور تمام دریا میرے ہی دست و بازو میں اور میرے دل ساگر میں گر رہے ہیں۔ مگر میں نہ تو دوسری اَن گنت آنکھوں کے وجود سے منکر ہوں اور نہ اپنے دست و بازو کو فریبِ نظر کہہ کر مسترد ہی کر رہا ہوں — کائنات کی ہر کروٹ اپنی جگہ ایک ازلی و ابدی حقیقت ہے اور میں اس حقیقت کا مظہر ہونے کے باوجود اس کا ناظر ہوں سو یہ ناظر بننے کی سعادت ہی میری نظروں میں سب سے اہم بازیافت تھی۔ انسان کائنات کی آنکھ ہے جس سے کائنات اپنا ہی نظّارہ کرنے لگی ہے یعنی خود سے باہر نکل کر خود کو دیکھنے لگی ہے — اس انکشاف نے مجھے ایک انوکھی مسرّت سے سرشار کر دیا تھا!

سفر

۱۹۸۰ء تا ؟

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مُشتِ پَر میں تھا

۱

ایک طویل بن باس کے بعد مَیں نے تقریباً پانچ برس تک قیام کر لیا تھا اور اب میرے پاؤں کے تلووں میں پھر سے کھجلی ہونے لگی تھی۔ دراصل قیام ماندگی کا ایک وقفہ ہے، جس کے بعد سفر دوبارہ شروع ہوتا ہے۔ مگر سفر کے لیے ماندگی کا یہ وقفہ بہت ضروری ہے کیونکہ اس میں انسان خود کو مجتمع کرتا ہے۔ چھلانگ لگانے والے کو دیکھئے کہ وہ پہلے خود میں سمٹتا ہے اور ذرا سا پیچھے بھی ہٹتا ہے۔ مگر اس کے بعد ایک نئی قوّت کے ساتھ آگے کی طرف لپکتا ہے۔ لہٰذا سمٹنے کے بعد مَیں اب آگے کو لپکنے کے لئے تیّار تھا۔ پھر ایک ایسا واقعہ ہوا کہ جس نے مجھے ماندگی کے عالم سے جھنجوڑ کر بیدار کر دیا۔ ویسے بھی انسانی جسم کی یہ عادت ہے کہ وہ لحظہ بھر کے لیے جاگتا ہے پھر دوبارہ خوابِ خرگوش میں چلا جاتا ہے یا کم از کم اونگھنے ضرور لگتا ہے۔ جانوروں میں تو یہ بات بہت ہی عام ہے مگر ہم انسان بھی اپنی عام زندگی میں قطعاً غیر ارادی طور پر ایک روبوٹ ROBOT کی طرح معمولات سے گزرتے چلے جاتے ہیں مگر وہ جسے بیداری کا عالم کہنا چاہئے ہم سے دُور دُور ہی رہتا ہے۔ یوگیوں اور درویشوں کے ہاں جسم کو اذیّت دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسا کر کے خود کو بیدار رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ موجودیّت والوں میں سے بعض نے تو جنگ کی حمایت محض اسی لیے کی ہے کہ اس سے پوری

قوم "بیدار" ہو جاتی ہے۔ گویا موت کا خوف ہی اس ازلی و ابدی پوستی کو جسے انسان کا نام ملا ہے نیند کے اُس عالم سے نجات دلا سکتا ہے جس میں اوّل اوّل یولی سیس کے ساتھی مبتلا ہو گئے تھے۔ میرا قصّہ یہ ہے کہ میں ایک روز کار میں لاہور جا رہا تھا (یہ غالباً جنوری ۱۹۸۰ء کا واقعہ ہے) کہ شیخوپورہ سے ذرا پہلے ریل کا پھاٹک عبور کرنے کے بعد کار خراب ہو گئی۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ٹانگیں ذرا سیدھی کرنے کے لیے کار سے باہر نکل آیا اور سڑک پر چہل قدمی کرنے لگا۔ سڑک سے کچھ ہی فاصلے پر ریل کی پٹڑی تھی۔ میں نے سوچا سڑک پر ٹریفک بہت ہے، چلو ریل کی پٹڑی پر چہل قدمی کرتے ہیں۔ سو میں ٹہلتے ہوئے چلتا وہاں جا پہنچا اور لاہور کی طرف منہ کر کے پٹڑی پر چلنے لگا۔ میں ایک سلیپر کے بعد دوسرے پر قدم رکھتا آگے کو بڑھا تو قدموں میں ایک آہنگ سا پیدا ہو گیا —— قریب ہی سڑک تھی جس پر ٹریفک نے کہرام برپا کر رکھا تھا۔ چند لمحوں کے لئے تو مجھے ہر کار، ٹرک اور بس کے دوڑنے اور ہارن بجانے کی آوازیں الگ الگ سنائی دیں پھر یہ آوازیں گڈمڈ سی ہو کر ایک گونج میں تبدیل ہو گئیں اور تب یہ گونج میرے قدموں کے آہنگ سے آملی اور میں ایک سحر زدہ انسان کی طرح دنیا و مافیہا سے بے خبر ریل کی پٹڑی پر چلتا چلا گیا۔ میں خود میں اس قدر کھو چکا تھا کہ مجھے اس بات کی خبر بھی نہ ہوئی کہ میرے عقب میں لاہور کی طرف جانے والی ایک تیز رفتار ریل گاڑی آ رہی ہے۔ انجن ڈرائیور نے جب دیکھا کہ ایک شخص لاہور کی طرف منہ کئے پٹڑی پر چل رہا ہے تو اس نے تند و تیز سیٹی کی متواتر ضربوں سے مجھے متنبہ کرنے کی کوشش کی مگر مجھے ریل کی سیٹی کی آواز تک نہ آئی۔ وجہ یہ کہ یہ آواز بھی ٹریفک کی گونج میں مل کر میرے قدموں کے آہنگ میں جذب ہو گئی تھی۔ سامنے ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ ایک گدھے والا گدھے پر چارہ لادے چلا آ رہا تھا۔ ایک لحظہ کے لیے وہ مجھے دکھائی دیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے جیسے کسی نے اٹھا کر پٹڑی سے پرے پھینک دیا اور ریل کا تیز رفتار انجن میرے کپڑوں کو چھوتا ہوا برق رفتاری سے لاہور کی طرف بڑھ گیا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے ریل کے ڈبوں کی ایک لمبی قطار شور مچاتی ہوئی گزرتی چلی گئی۔ چند ہی لمحوں میں گاڑی غائب ہو گئی تھی۔

سامنے گدھے والا حیران و ششدر کھڑا تھا مجھے اس نے سلامت دیکھا تو بے اختیار ہنس پڑا۔ کہنے لگا: "بابو تو گاڑی کے نیچے آ چلا تھا تجھے گاڑی کی سیٹی بھی سنائی نہ دی"؟ مگر میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ جواب دے بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ لحظہ بھر کے لیے میرا دماغ قطعاً ماؤف ہو گیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ میں اس کیفیت سے باہر آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ابھی ابھی موت کے چنگل سے نکل کر دوبارہ اس دنیا میں آیا ہوں اور اس کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے پورا ماحول روشن ہو گیا ہے۔ چاروں طرف ایک انوکھی گہرائی تھی، ایک نیا معنی سطح پر آ گیا تھا۔ میں نے لاہور کی طرف دیکھا تو مجھے ریل ڈوریوں میں ایک سیاہ نقطہ کی طرح نظر آئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے جسم کو خوشبودار صابن سے دھو کر شیشے کی طرح اُجلا اور منوّر کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی میری رُوح کو جیسے سنہری پَر عطا ہو گئے ہیں اور میرا پورا وجود از سر تو ہرا ہو گیا ہے۔

(۲)

میرے لیے یہ واقعہ انوکھی نوعیت کا تھا۔ کسی نے مجھے اٹھا کر ریل کی پٹڑی ہی سے نہیں اُتارا تھا بلکہ مجھے جھنجوڑ کر بیدار بھی کر دیا تھا۔ نتیجتاً میں کئی سطحوں پر متحرک ہو گیا۔ تخلیقی سطح پر اس کا نتیجہ ایک طویل نظم کی صورت میں ظاہر ہوا جس کا عنوان تھا —" آدھی صدی کے بعد" میں نے اس نظم کا ایک چھوٹا سا حصّہ اس واقعہ سے چند ماہ پہلے ہی تخلیق کر لیا تھا مگر اُس وقت مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس حصّے کے اندر ایک طویل نظم چھپی ہوئی تھی۔ یہ تو اُس روز کا واقعہ تھا جس نے مجھے تخلیقی طور پر فعّال بنایا اور مجھے جہاں اشیا میں چھپے ہوئے معانی سطح پر اُبھرے ہوئے دکھائی دئے، وہاں اس نظم کے بطون سے ایک طویل نظم کے لشکارے بھی صاف نظر آنے لگے۔ چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ نظم نے مجھے اپنی گرفت میں لے کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر دیا۔ ۲۰ر فروری ۱۹۸۰ء تک پہنچتے پہنچتے میں نے اس نظم کا ایک اور حصّہ تخلیق کر لیا تھا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے انور سدید کے نام ایک خط میں لکھا:

"آج میں نے آدھی صدی کے بعد" کا دوسرا حصّہ مکمّل کرلیا ہے، اس کا پہلا حصّہ میں نے پچھلے سال گرمیوں میں لکھا تھا مگر اُس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ کسی طویل نظم کا پہلا حصّہ ہے۔ میں نے تو بس اپنے بچپن کے نیم تاریک ایّام میں ایک چھلانگ سی لگا دی تھی اور پھر یہ ایّام یکایک منوّر سے ہو کر میرے سامنے آگئے۔ یوں لگا جیسے کوئی فلم دیکھ رہا ہوں۔ ایک مشہور نیورولوجسٹ کا کہنا ہے کہ جب IEDETIC IMAGE کی بازآفرینی کی جائے تو وہ اپنی واقعی صورت ہی کے ساتھ درشن نہیں دیتا بلکہ اپنے ساتھ منسلک خوشبو، ذائقہ یا آواز کے علاوہ اُن جذبات کو بھی لے آتا ہے جو اس لمحے شاعر کے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ اس نظم کو لکھتے ہوئے مجھے اس قول کی سچّائی کا احساس ہوا۔ واقعی وہ تمام چھوٹے چھوٹے واقعات اور جذبات جن پر وقت نے منوں مٹّی ڈال دی تھی اور جنھیں میں بالکل فراموش کر چکا تھا، بچپن کے ایّام کو ذرا سا چھیڑ دینے سے زندہ ہو کر میرے سامنے آگئے۔ نظم کا پہلا حصّہ جب مکمّل ہوا تو میں مطمئن تھا کہ میں نے اپنے بچپن سے دوبارہ ملاقات کرلی۔ اُس وقت مجھے اس بات کا سان گمان بھی نہیں تھا کہ نظم آگے بڑھے گی۔ مگر چند ہی ماہ کے بعد اندر سے آوازیں آنے لگیں اور کوئی شے لفظوں میں منتقل ہونے کے لئے مضطرب دکھائی دینے لگی۔ چنانچہ پچھلے دنوں یہ شے اپنے زور میں شعور کی سطح پر بالکل اسی طرح آگئی جیسے پودا بیج کے چھلکے کو توڑ کر سطح زمین پر آجاتا ہے۔ مگر اس کی جڑیں بہرحال زمین کے اندر ہی رہتی ہیں۔ اب میری یہ نظم پودے ہی کی طرح GROW کر رہی ہے۔ دوسرا حصّہ مکمّل ہو گیا ہے۔ اگر یہ جذبہ صادق ہے تو مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد مجھے پھر اپنے اندر سے آوازیں سنائی دینے لگیں گی۔ اور تخلیق کا یہ سفر دوبارہ شروع ہو جائے گا۔ مگر اس وقت حال یہ ہے کہ میں اس

کارتوس کی طرح خود کو محسوس کر رہا ہوں جس سے چھرّے نکل چکے ہوں اور کارتوس کی زبان پر جلے ہوئے بارود کی تلخی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہ گیا ہو۔

(انور سدید کے نام ایک خط ۲۰ فروری ۱۹۸۰ء)

اگلے چھ ماہ کے اندر یہ نظم مکمّل ہو گئی۔ مگر میرے لئے یہ نظم ایک طویل سفر تھا جو میری زندگی کے تقریباً پچاس سالوں پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اس سفر کا حال بیان کرتے ہوئے واقعات و حادثات کے بجائے اُن داخلی کیفیات کو بیان کیا تھا جو ان سے پھوٹی تھیں اور پھر مجھے بہا لے گئی تھیں۔ بعد ازاں جب یہ کتاب چھپی تو میں نے اس کے دیباچے میں اسے ایک "داخلی اوڈیسی" کا نام دیا۔ حقیقتاً یہ واپسی کا ایک سفر تھا۔ تاریخ میں اُبھرنے والے سیّاحوں نے تو ہمیشہ باہر کی دنیا کو زیرِ پا لانے کا اہتمام کیا ہے، مگر میں نے اس نظم میں "اندر" کے برِّاعظم کا منظر دکھایا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ یہ سفر بیک وقت ایک نیا سفر بھی تھا۔ اور کسی بہت پُرانے سفر کی بازیافت بھی — مُراد یوں کہ میں اپنے ہی نقوشِ قدم پر پاؤں دھرتا اُس آخری نقشِ قدم تک جا پہنچا تھا جو دراصل اس دنیا میں میرا پہلا نقشِ قدم تھا۔ نیا یوں کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے جیسے آنکھیں میچ کر اس سفر کے پچاس میل یا شاید پچاس ہزار میل طے کئے تھے مگر اب کہ میں کھُلی آنکھوں کے ساتھ دوبارہ اس راستے پر مصروفِ سفر ہوا ہوں تو مجھے وہ سب کچھ صاف نظر آنے لگا ہے جس کے نقوش تو میرے دماغ کے کمپیوٹر میں یکجا ہوتے چلے گئے تھے مگر جو مجھے ظاہر بین آنکھوں سے مطلق نظر نہیں آیا تھا۔ چنانچہ میں نے کتاب کے دیباچہ میں لکھا کہ

"میری یہ نظم بیسویں صدی کے پچاس سالوں کا احاطہ کرتی ہے۔ ان پچاس سالوں میں ملکی، غیر ملکی اور شخصی سطح پر جو واقعات رونما ہوئے وہ اس نظم کا موضوع نہیں ہیں مگر ان واقعات اور سانحات نے میری زندگی کے اندر جو گھاؤ پیدا کئے اور جو نشیب و فراز جنم دیے — ان سب کی بازآفرینی اور ان کے وسیلے سے زندگی کے پُراسرار "معنی" تک رسائی کی کوشش — بس یہی اس نظم کا میدانِ تگ و تاز ہے۔"

یہ تو تخلیقی سطح پر متحرک ہونے کی صورت تھی جس نے مجھے اپنی ذات کے اندر سفر کرنے کا موقع عطا کیا۔ مگر ریل کے واقعہ نے مجھے فکری سطح پر بھی متحرک کر دیا تھا اور مجھے کائنات کے اندر سفر کرنے کی طاقت عطا کر دی تھی۔ یہ بھی ایک طرح کا واپسی کا سفر تھا کیونکہ جب کوئی مکان SPACE میں آگے بڑھتا ہے تو دراصل زماں TIME کی ابتدا کی طرف سفر کرتا ہے۔ مثلاً جو ستارے مجھے رات کو آسمان پر دکھائی دیتے ہیں ان کی روشنی لاکھوں نوری سالوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد آج مجھ تک پہنچی ہے۔ لہٰذا وہ مجھے اپنی اُس حالت میں دکھائی دے رہے ہیں جو آج سے لاکھوں نوری سال پہلے تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بیشتر ستارے جو آج مجھے نظر آ رہے ہیں، کبھی کے ختم ہو چکے ہوں۔ مگر اس بات کی خبر مجھے آج سے لاکھوں نُوری سال بعد ہی ہو سکتی ہے۔ سو جب انسان مکان SPACE کے اندر سفر کرتا ہے تو دراصل وقت کے اندر مصروفِ خرام ہوتا ہے اور کائنات کے نقوشِ قدم پر چلتا ہوا اُس کے پہلے "نقشِ قدم" کی طرف جا رہا ہوتا ہے۔ مگر میں اپنے اس سفر کا حال تھوڑی دیر کے بعد بیان کروں گا۔ فی الحال مجھے ذات اور کائنات کے اِن دو سفروں کے درمیان اُس سفر کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرنا ہے جو میں نے ۲۷ مارچ ۱۹۸۰ء کو شروع کیا اور جو ساتویں اپریل تک جاری رہا۔

۳

ہُوا یہ کہ مجھے نئی دہلی سے ایک دعوت نامہ ملا کہ اُردو افسانہ سیمینار کے سلسلے میں بھارت آؤں۔ میرے علاوہ انتظار حسین اور احمد ہمیش کو بھی بلایا گیا تھا۔ تینوں دعوت نامے اکادمی ادبیات پاکستان کی وساطت سے ہمیں ملے تھے۔ اکادمی ہی نے ہمارے سفر کا انتظام کیا تھا۔ اور اکادمی کے سربراہ مسیح الدین صدیقی صاحب تو اس قدر خوش تھے کہ ہمیں الوداع کہنے لاہور ایرپورٹ پر بھی تشریف لے آئے تھے۔ وہاں مجھے بتایا گیا کہ یہ ایک ڈیلیگیشن ہے جس کا سربراہ میں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سربراہی کا اعزاز مجھے سینیئر ادیب ہونے کی بنا پر عطا ہوا تھا۔ احمد ہمیش تو خیر مجھ سے ویسے ہی دس برس

چھوٹے ہیں۔ لیکن یہ اندازہ لگانا بے حد مشکل تھا کہ وزیر آغا اور انتظار حسین میں سے کون سینئر ہے۔ میرا خیال ہے کہ آخری فیصلہ قرعہ اندازی کے ذریعہ یقیناً نہ ہوا ہوگا بلکہ ہماری تاریخ پیدائش کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہی صدیقی صاحب اپنے "تاریخی" فیصلہ پر پہنچے ہوں گے۔ چونکہ میں عمر میں انتظار حسین سے چند ماہ بڑا ہوں اور اس اعتبار سے وہ میرے "عزیز" ہیں لہٰذا مجھے ڈیلی گیشن کی سربراہی سونپ دی گئی۔

ہوائی جہاز میں سفر کرنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ مگر شومیٔ قسمت سے مجھے پہلا سفر کسی بوئنگ جہاز کے بجائے فوکر جہاز میں کرنا پڑا۔ ہوائی جہاز کو قریب سے دیکھنے کا بھی یہ میرا پہلا موقع تھا۔ جہاز میں بیٹھے تو محسوس ہوا کہ بس میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ پھر جب جہاز رن وے پر دوڑا اور اس کے بعد کھڑکھڑ کرتا ہوا ہوا میں اڑا تو واقعی بس میں سفر کرنے کا مزہ آ گیا۔ میرے ساتھ احمد ہمیش کو بٹھایا گیا تھا اور احمد ہمیش نان سٹاپ بول رہے تھے، بلکہ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے بول رہے تھے۔ میں نے درمیان میں ان کی گفتگو کو قطع کرتے ہوئے انھیں فوکر کی آواز کی طرف متوجہ کیا اور پوچھا کہ اگر یہ آواز اچانک بند ہو جائے تو کیا ہو؟ ——— معاً مجھے احمد ہمیش کی اس طویل گفتگو" کا پس منظر معلوم ہو گیا۔ کہنے لگے کہ میں تو پہلے ہی ڈرا ہوا ہوں مجھے مزید نہ ڈرائیں۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ میں خود بھی اندر سے ڈرا ہوا تھا اور مجھے یقین نہیں تھا کہ صدیوں کا یہ سفر (جو دراصل ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا) کبھی اختتام پذیر ہوگا بھی کہ نہیں۔ واپس آ کر میں نے ایک غزل لکھی جس کا مطلع تھا۔ ع :

کواڑ بجتے تھے اور دل میرا لرزتا تھا
میں برگِ سبز تھا لیکن ہوا سے ڈرتا تھا

جب غلام جیلانی اصغر نے یہ شعر سنا تو برملا کہا "بہت خوب! ہوائی جہاز کے سفر کے بعد انسان اسی قسم کے اشعار لکھتا ہے۔ مثلاً میرا یہ شعر سنیئے جو میں نے ہوائی جہاز میں داخل ہونے سے دو منٹ پہلے کہا تھا اور ہوائی جہاز میں داخل ہوتے ہی ایئر ہوسٹس کی نذر کر دیا تھا۔" مگر چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک شعر سنانے کے بہانے پوری غزل سنائیں گے۔ اس لیے میں نے شعر سننے سے انکار کر دیا۔

دہلی پہنچے تو ایرپورٹ پر بہت سے ادبا ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ۱۹۶۵ء کے بعد یہ غالباً پہلا موقع تھا کہ پاکستانی ادبا کا ایک وفد بھارت آیا تھا۔ لہٰذا یہ ایک اہم خبر تھی جو جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ ویسے تو یہ سیمینار صحیح معنوں میں بین الاقوامی تھا کیونکہ اس میں انگلستان، ناروے، امریکہ اور دوسرے ملکوں سے بھی مندوبین شامل ہوئے تھے۔ مگر جو شان پاکستانی وفد کی تھی اور جس گرم جوشی سے ہم تینوں کا سواگت ہو رہا تھا اس کی کوئی مثال ہی نہیں تھی۔ ایرپورٹ پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (جو افسانہ سیمینار کی رُوحِ رواں تھے) بلراج کومل (جنھیں میں سترہ برس کے بعد مل رہا تھا) محمود ہاشمی (جنھوں نے "اُردو شاعری کا مزاج" پر پہلا ہنگامہ خیز مضمون لکھا تھا اور جنھیں دیکھنے کا میں متمنی تھا) اور اور بہت سے دوسرے ادبا آئے ہوئے تھے۔ ہم لوگ یوں ملے اور چند ہی لمحوں میں یوں گھُل مل گئے جیسے ہم جنم جنم سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ پورے نو دن تک جاری رہا۔ کلام حیدری تو اگلے ہی روز اُس ہوٹل میں تشریف لے آئے جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ بہت سے موضوعات پران سے تفصیلی باتیں ہوئیں۔ رام لعل نابھوی اور آزاد گلاٹی پنجاب سے مجھے ملنے بطور خاص آئے۔ ہرچرن چاولہ اور صلاح الدین پرویز دیارِ غیر سے آئے تھے۔ ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ البتہ جگن ناتھ آزاد اور شہریار سے ملاقات نہ ہو سکی۔ دو سال بعد جب میں دوبارہ نئی دہلی گیا تو جگن ناتھ آزاد کی معیت میں خاصا وقت گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ البتہ شہریار سے دوسری بار بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ پھر ایک روز شہریار خود پاکستان آ گئے اور یوں مجھے ایک ایسے دوست سے ملنے کا موقع ملا جس سے خط وکتابت ــــــ کا آغاز آج سے تقریباً پچیس برس پہلے ہوا تھا۔

(۴)

میں ایک عرصے تک گاؤں میں رہنے کے باعث اب زنگ آلود ہونے لگا تھا۔ اگر انسان زیادہ عرصہ اپنی ہی معیت میں رہے تو شہری سوسائٹی میں رہنے کے آداب

بھول جاتا ہے۔ شہری میل جول تو لا تعداد ایسے جملوں سے عبارت ہے جنھیں ادا کرتے ہوئے انسان کو اس بات کا علم تک نہیں ہوتا کہ ان جملوں کا اصل مفہوم کیا ہے۔ یہی حال مشاعروں میں دی جانے والی داد کا ہے کہ داد دینے والا اُگالدان میں پان کی پیک گراتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ "کیا کہنا۔ سُبحان اللہ! بہت خوب۔ واہ واہ" ایسے نعرے بھی لگاتا ہے اور نہیں جانتا کہ ان نعروں کا شاعری کے اچھے یا بُرے ہونے سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ تو محض ایک خودکار مشین کی طرح مصروفِ کار رہتا ہے۔ مگر مجھے ایک خودکار مشین کی طرح بولنے کی اب پریکٹس نہیں رہی تھی۔ لہٰذا جب کوئی ملتا اور اپنا تعارف کراتا تو میری سمجھ میں نہ آتا کہ مَیں اب اس سے کیا کہوں بہرحال سیمینار کے دوران مجھے سینکڑوں اشخاص ملے۔ کچھ لوگوں کے نام سے میں آشنا تھا۔ بیشتر کے ناموں تک سے آشنا نہ تھا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ایرپورٹ کی ملاقات کے بعد اپنے کاموں میں اس قدر مصروف ہوئے کہ دوبارہ ان سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ یوں لگتا تھا جیسے اُردو سیمینار ہی کے نہیں پورے ہندوستان کے مسائل کا بوجھ اُن کی جانِ ناتواں نے اُٹھا رکھا ہے۔ دوسرے روز دوپہر کی دعوتِ عام میں مَیں نے آخر انھیں ڈھونڈ لیا کہ ایک گوشے میں کھڑے جلدی جلدی چند لقمے شکم کی نذر کر رہے تھے۔ میں ان کے قریب جا کھڑا ہوا اور کہا: "مَیں ایک صاحب سے ملنا چاہتا ہوں ان سے ملوا دیجئے۔" گوپی چند نارنگ بولے: "کہئے کہئے ابھی ملوائے دیتے ہیں۔" مَیں نے کہا: "ان صاحب کا نام ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔"! بس اسی لمحے سالن کی پلیٹ سمیت مجھ سے بغل گیر ہو گئے۔ کہا کہ بس ایک آدھ روز کی بات ہے۔ پھر سارا وقت آپ ہی کی معیت میں گزرے گا۔ مَیں نو روز دہلی میں رہا مگر یہ ساعتِ نایاب مجھے نصیب نہ ہو سکی۔

پاکستان میں سیمینار اس طور ہوتے ہیں کہ مقالہ نگار حضرات یکے دیگرے سٹیج پر آ کر اپنا مقالہ یا مقالے کی تلخیص پڑھ کر رخصت ہو جاتے ہیں اور سامعین آپس میں گفتگو کرتے یا بے معنی نظروں سے مقالہ نگار کو گھورتے رہتے ہیں۔ بھارت میں یہ دیکھا کہ جب کوئی مقالہ نگار

مقالہ پیش کرنے کے بعد سٹیج سے اُترتا تو فوراً ہی اس کا ہم شکل ایک مبصر سٹیج پر آجاتا اور مقالے کی دھجیاں بکھیرنے اور سامعین سے داد وصول کرنے کے بعد سٹیج سے نیچے اتر جاتا۔ اب وہی مقالہ نگار دوبارہ سٹیج پر آکر اپنے مقالے کی دھجیوں کو جوڑتا اور مبصر کی طرح وہ بھی سامعین سے داد وصول کرکے واپس چلا جاتا۔ پہلے ہی سیشن میں جب یہ منظر سامنے آیا تو میں نے قرۃ العین حیدر سے (جو اس سیشن کی صدارت کر رہی تھیں) پوچھا کہ کیا اس قسم کی تنقید سے سیمینار کا تقدس مجروح نہیں ہوتا؟ جواباً انہوں نے کہا کہ بھارت میں آزادیٔ اظہار کی روایت نہایت مضبوط ہے۔ لہٰذا اس طریقِ کار کو بدلنا بہت مشکل ہے۔ اگلے روز کے ایک سیشن میں مجھے بھی اپنا مقالہ پیش کرنا تھا۔ مقالہ پاکستان میں اُردو افسانے کی صورتِ حال کے موضوع پر تھا۔ میں نے مقالے میں کرلین پروسس KIRILIAN PROCESS کے حوالے سے کردار کے ڈونیم ہونے کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ پاکستان کا اُردو افسانہ کردار کے غائب حصّے کی بازیابی میں منہمک ہے تاکہ تصویر مکمل ہو سکے۔ میرے الفاظ یہ تھے:

> ”کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ علم الحیات کے میدان میں ایک ایسا تجربہ کیا گیا جس نے اہلِ نظر کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ تجربہ KIRLIAN PROCESS کے نام سے اب خاصا مشہور ہو چکا ہے۔ اس تجربے میں درخت کا ایک پتّہ لے کر اس کے اُوپر والے حصّہ کو کاٹ کر الگ رکھ لیا گیا اور باقی پتّے کی ایک نئی سائنسی تکنیک کے مطابق تصویر اُتاری گئی جب یہ تصویر ۴"×۵" کی سفید اور سیاہ فلم پر اُتر آئی تو تجربہ کرنے والے یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ تصویر میں پتّے کے اُس حصّے کا ہیولیٰ بھی موجود تھا جسے ثابت پتّے سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا تھا۔ گویا تصویر میں پتّے کے کٹے ہوئے حصّے کا ایک GHOST IMAGE بھی آگیا تھا جو ایک پرچھائیں کی طرح پتّے سے جُڑا ہوا تھا اور ثابت پتّے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے دوسری کا چاند ایک ٹوٹے ہوئے کنگن کی طرح دکھائی دیتا ہے مگر ساتھ ہی پورے کنگن کی ایک مدھم سی پرچھائیں بھی عقب سے جھانکتی ہوئی صاف

نظر آتی ہے۔"

کرلین پروسس کی توضیح کے بعد میں نے پاکستانی افسانے کے بارے میں اپنا موقف یوں پیش کیا تھا:

"اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ پاکستان کے اُردو افسانے کا بنیادی قضیہ کیا ہے تو میں کہوں گا کہ وہ ایک نفسیاتی KIRLIAN PROCESS کے ذریعے کردار کے اُس حصّے کی بازیافت میں مصروف ہے جو کسی نہ کسی طرح پورے کردار سے کٹ چکا ہے۔ نہ صرف کٹ چکا ہے بلکہ پورے معاشرے کے ذہن سے بھی محو ہو چکا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ پاکستان کے اُردو افسانے نے کردار کے اس منقطع حصّے کو دریافت کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے مگر اس سلسلے میں جو پیش رفت ہوئی ہے اس سے ایک ایسی پرچھائیں یقیناً سامنے آگئی ہے جس کے بارے میں یہ امکان ہو سکتا ہے کہ وہ پتّے کا وہی حصّہ ہے جو ثابت پتّے سے کٹ کر الگ ہو گیا تھا ---------- مشہور نیورولوجسٹ وِلڈر پن فیلڈ WILDER PENFIELD کی تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ انسانی دماغ میں تجربات کے بصری ٹیپ ریکارڈ ہمہ وقت موجود رہتے ہیں اور ان کی بازیافت ممکن ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ذات یا شخصیت کے غائب حصّے کی بازیافت نہ ہو سکے۔ پاکستان کے اُردو افسانے کا سب سے اہم کارنامہ یہی ہے کہ اس نے کردار کے حوالے سے ذات کے اس کٹے ہوئے حصّے کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو مادی زندگی میں تو نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا مگر جس کا EIDETIC IMAGE انسانی دماغ میں بدستور موجود ہے اور تخلیقی عمل کے دوران صفحۂ قرطاس پر بآسانی منتقل ہو سکتا ہے۔"

مضمون کے آخر میں بات کو سمیٹتے ہوئے میں نے لکھا تھا:

"واضح رہے کہ ثقافت درخت کی طرح ہے کہ نہ صرف اس کی جڑیں زمین

میں اُتری ہوتی ہیں بلکہ وہ درخت ہی کی طرح خود کو REGENERATE بھی
کر سکتی ہے یعنی اگر اس کی شاخ ٹوٹ جائے تو اُس مقام سے جہاں سے شاخ ٹوٹی تھی، ایک نئی
شاخ پھوٹ نکلتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ دوبارہ پھوٹنے سے پہلے یہ شاخ کہاں تھی بظاہر ہے
کہ درخت کے وجود کے اندر تھی اور وہیں اس کے ہیولیٰ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے اُردو
افسانے میں ثقافتی تناظر اور اس کی زرخیز علامتوں کو پیش کرنے کا عمل اصلاً ثقافت کے بدن
سے ایک نئی شاخ اُگانے کا عمل ہے تاکہ درخت کی تکمیل ہو سکے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ نئی شاخ
اُگ آئی ہے کیونکہ اس کے لیے طویل عرصہ درکار ہے البتہ اس شاخ کے ہیولیٰ کو
گرفت میں لینے کا جو منظر اُبھرا ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ پاکستان کے
اُردو افسانے میں پرچھائیں کی نمود کو نفسیات کے SHADOW اور مردِ دانا
یعنی WISE OLD MAN کے حوالے سے بھی سمجھا جا سکتا ہے لیکن اگر اس
پرچھائیں کو ذات کے غائب حصّے کے GHOST IMAGE کے حوالے سے سمجھنے
کی کوشش ہو تو پھر اس بات کا انکشاف ہوگا کہ پاکستان کا اُردو افسانہ ایک
تجریدی علامتی فضا میں اُس ہیولیٰ کو پکڑنے کی کوشش میں ہے جو بیک وقت
انسان کی ذات کا غائب حصّہ بھی ہے اور اس کی ثقافت کے درخت سے
پھوٹنے والی شاخِ زرّیں بھی!"

مقالے کی قرأت کے دوران ہی مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ مقالہ اکثر سامعین کے سروں کے اوپر
سے گزر رہا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنے مضمون کی بنیاد ایک ایسے سائنسی نظریے
پر رکھی تھی جس سے اکثر ادیب آشنا نہیں تھے۔ اس بات کا ثبوت مجھے اس وقت ملا جب میرے
بعد باقر مہدی سٹیج پر تشریف لائے اور میرے مقالے پر دھواں دھار تقریر کرنے کے بعد واپس
چلے گئے۔ اب مجھ سے کہا گیا کہ میں باقر مہدی کے اعتراضات کی روشنی میں اپنی صفائی پیش کروں
میں نے گزارشِ احوالِ واقعی کے طور پر کہا کہ باقر مہدی صاحب نے میرے مقالے کے بنیادی
تھیسس کے بارے میں تو سرے سے کچھ کہا ہی نہیں۔ انھوں نے تو صرف یہ بتایا ہے کہ پاکستانی
افسانہ کو اگر طبقاتی کشمکش کے حوالے سے دیکھا جائے تو پھر مقالہ یوں لکھا جانا چاہیئے۔ اگر وہ

میرے مقالے کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال کریں تو میں بخوشی جواب دینے کو تیار ہوں اس پر باقر مہدی تو چپ رہے البتہ سامعین کھلکھلا کر ہنس پڑے اور میں سٹیج پر بھی اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

۵

میں نے "جا کر" کے الفاظ محض واقعہ کی تصویر کشی کے لیے لکھ دیے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں اُس روز اور اس کے بعد جتنے بھی روز دہلی میں رہا چلنے پھرنے کی پیروڈی ہی کرتا رہا۔ کیونکہ میری ٹانگ کولھے تک سخت درد کی گرفت میں تھی۔ جب میں لاہور سے روانہ ہوا تھا تو ہلکا ہلکا درد مجھے ہو رہا تھا مگر میں نے سوچا درد ہی تو ہے دو ایک روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر سیمینار کے دوسرے روز جب مجھے سٹیج پر آنے کے لیے کہا گیا اور میں اپنی نشست سے اُٹھا تو اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میری بائیں ٹانگ پر ساری کی ساری فصیل کشورِ ہندوستان آ گری ہے۔ درد اتنا شدید تھا کہ میرے لیے ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر تھا۔ مگر وہ جو کہا گیا ہے کہ انسان کے بطون میں کہیں تھوڑی سی مقدار میں ایک "خاص قوّت" بھی موجود ہے جو بحران کے موقع پر ہی متحرک ہوتی ہے تو یہ بات مجھے اُس وقت بالکل سچ دکھائی دی۔ ایک ہزار کے لگ بھگ سامعین کی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں۔ میں اس وقت کسی کرم فرما کو مدد کے لئے بھی نہیں پکار سکتا تھا تا کہ وہ مجھے سہارا دے کر سٹیج تک پہنچائے لہٰذا میں کسی نہ کسی طرح خود کو مجتمع کر کے جیسے بھی بن پڑا اسٹیج پر پہنچا اور اپنی کرسی میں دھنس گیا۔ چہرے پر مسکراہٹ سجی تھی مگر اندر سے میں چیخ رہا تھا۔

اس کے بعد یہ درد ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے جُدا نہ ہوا۔ بلراج کومل مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور ڈاکٹر نے اس بات پر خوش ہو کر کہ اُسے اپنے پہلے پاکستانی مریض پر مشقِ ناز کا موقع ملا ہے۔ مجھے ایک ٹن کے قریب گولیاں اور کیپ سول کھانے کے لئے دے دئے اور کہا کہ میں ان گولیوں اور کیپ سولوں کو اگر کھانے میں کامیاب ہو جاؤں تو درد دُور ہو جائے گا۔ میں نے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ ان کو کھانے کے لیے مجھے کم از کم چھ ماہ کا عرصہ درکار ہوگا جس کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی نظروں میں یہ مرض رخصت

ہونے کے لئے پورے چھ ماہ کے عرصے کا طالب تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی ان ادویات سے مجھے کوئی فائدہ تو نہ ہوا البتہ ان کی پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی اور درد نے کہیں چھ ماہ کے بعد ہی مجھے اپنے چنگل سے رہا کیا۔ مگر یہ ایک الگ داستان ہے۔

ٹانگ کے اس درد نے مجھے جسمانی تکلیف کے علاوہ رُوحانی تکلیف بھی پہنچائی ۔ رُوحانی یوں کہ احباب نے میرے ویزا کی توسیع کرا دی تھی اور وہ اب چاہتے تھے کہ مَیں لکھنؤ، حیدرآباد اور بمبئی کا سفر اختیار کروں اور میں دلی خواہش کے باوجود ٹانگ کے درد کے ہاتھوں ایسا کرنے سے معذور تھا۔ سفیرِ کبیر پاکستان اُردو کانفرنس کی صدارت کے لیے مدراس جانے کے لیے پا بہ رکاب تھے۔ جب ہم لوگ دہلی پہنچ گئے تو انھوں نے کہا کہ اب ان کی جگہ پاکستانی وفد کا سربراہ مدراس جائے گا۔ میرے لیے اپنی ایک دیرینہ آرزو کو پورا کرنے کا یہ ایک شاندار موقع تھا۔ مگر یوں لگتا ہے جیسے خود میری یہ آرزو درد میں تبدیل ہو کر میرے راستہ کا سنگِ گراں بن گئی ـــــ "اُردو شاعری کا مزاج" لکھتے ہوئے مَیں نے جنوبی ہندوستان کی دراوڑی تہذیب اور اس تہذیب کے مندروں کے بارے میں خاصا مطالعہ کر رکھا تھا۔

پہلی بار جب ۱۹۴۴ء میں مجھے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا اور مَیں وہاں سے چند روز کے لیے پونا گیا تو اس وقت بھی میری یہ خواہش تھی کہ میں مدراس تک سفر کروں مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ اگر ایسا ہو بھی جاتا تو اس سفر کا مقصد سیر و سیاحت کے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔ اب صورت یہ تھی کہ میں قریب سے اس تہذیب کو دیکھنا چاہتا تھا جس کے بارے میں مَیں نے "اُردو شاعری کا مزاج" میں اتنا کچھ لکھا تھا۔ اسی طرح میری یہ دلی خواہش بھی تھی کہ مَیں بمبئی کے قریب ایلورا اور اجنتا کے غار دیکھوں۔ اگر یہ موقع مل جاتا تو مجھے نہ صرف یہ کہ گائیڈ کی ضرورت نہ پڑتی بلکہ میں انتظار حسین اور احمد ہمیش کے لیے بلا معاوضہ ایک گائیڈ کے فرائض بھی ادا کر سکتا تھا۔ علی گڑھ اور لکھنؤ جانے کی خواہش بھی تھی کیونکہ وہاں میرے بہت سے ایسے احباب تھے جو بوجوہ سیمینار میں نہ آسکے تھے۔ مگر درد کم ہونے کے بجائے روز بروز توانا ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی میرے سارے ارادوں اور خواہشوں پر اوس پڑنے لگی تھی۔ پانچویں اپریل کو حالت غیر ہو گئی۔ ٹانگ کے درد میں معدے کے درد کی آمیزش

بھی ہوگئی گویا جہلم سے آکے مل گئی گنگ و جمن کی شاخ! ساتھ ہی بخار نے آلیا۔ تب میں نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے کہا کہ مجھے پاکستان پہنچا دیجیے۔ احباب سے اجازت لینے میں بھی میں نے کامیابی حاصل کرلی اور یوں مارکوپولو صاحب نو ہی روز کے بعد واپس اپنے وطن پہنچ گئے۔

(۶)

میں دہلی میں نو روز ٹھہرا، مگر ادبا سے میری اصل ملاقات سمینار میں نہیں بلکہ ان دعوتوں میں ہوئی جو احباب نے اپنے گھروں میں دیں۔ بالخصوص ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، بلراج کومل، نریندر لوتھر، اور بعض دوسرے دوستوں کے ہاں جو دعوتیں ہوئیں ان میں مجھے متعدد ادبا کو قریب سے دیکھنے اور ان سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ آل احمد سرور، باقر مہدی، کمار پاشی، قرۃ العین حیدر، بلراج کومل، محمود ہاشمی، محمد علوی، مجتبیٰ حسین، جوگندر پال، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، مظفر حنفی، گوپال متل، فکر تونسوی، فضیل جعفری، وارث علوی، شمس الرحمن فاروقی، مہدی جعفر — ان میں سے بیشتر لوگ ان دعوتوں میں موجود ہوتے۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ جوگندر پال کو افسانہ سمینار کے کسی سیشن میں افسانہ سنانے کی دعوت نہیں ملی تھی۔ حالانکہ وہ اُردو افسانہ نگاری میں اتنے زیادہ اہم ہیں کہ انھیں نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میں نے ان دعوتوں میں یہ عجیب بات بھی دیکھی کہ ادبا آغازِ کار میں تو رُک رُک کر بولتے۔ درمیان میں سلسلۂ گفتگو ٹوٹ ٹوٹ بھی جاتا مگر جب وہ ایک دو پیگ پی لیتے تو چہکنے لگتے (بعض نہیں بھی پیتے تھے) پھر وہ اتنا بولتے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی چونکہ پاکستان کی دعوتوں میں پینے پلانے کی ایسی کوئی روایت نہیں ہے۔ اس لیے مجھے دہلی کی ان دعوتوں کا یہ انداز عجیب سا لگا یعنی ایک دو پیگ پیتے ہی میرے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کا کردار یکسر تبدیل ہو جاتا۔ پہلے وہ آہستہ آہستہ سنبھل سنبھل کر باتیں کر رہا ہوتا۔ یکایک اس کی آواز بلند ہو جاتی۔ منطق کی جگہ جذبات لے لیتے اور اس کی حرکات سے ضبط و امتناع کی ساری روایت رخصت ہو جاتی۔ ایک دعوت میں میرے قریب لنڈا ویٹنگ بیٹھی تھی اور سامنے ایک نہایت مہذّب اور شریف ادیب تشریف فرما تھے اور بڑے ادب آداب

کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ پھر باتیں کرتے کرتے ان کے چہرے پر سُرخی کی ایک لکیر سی طلوع ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ان کا خود پر کنٹرول باقی نہ رہا۔ انھوں نے ادب میں جنس کے موضوع پر گفتگو شروع کر دی جب وہ کھُل کر باتیں کرنے لگے تو لنڈا کا چہرہ سُرخ ہوگیا اور اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا کہ ان صاحب کو کیا ہوگیا ہے۔ مگر میں پہلے ہی اس قدر حیران تھا کہ بجز مزید حیران ہونے کے اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ مگر ان دعوتوں میں اس قسم کی باتیں عام تھیں۔ ایک دعوت میں تو دو سینئر ادبا کے مابین تُو تُو مَیں مَیں بھی ہوگئی اور دوسرے دوستوں کو درمیان میں کودنا پڑا۔ میرے لیے ان دعوتوں کا پہلا حصّہ باعثِ مسرّت تھا یعنی جب ادبا نارمل حالت میں ہوتے۔ جب وہ نارمل حالت میں نہ رہتے تو پھر یہ دعوت دعوت نہ رہتی ایک تماشہ بن جاتی۔

(۷)

میں دہلی سے لاہور پہنچا تو درد اور بخار کے شکنجے میں تھا۔ لاہور میں دو تین روز آرام کرنے کے بعد مَیں گاؤں چلا گیا۔ اور پھر پورے چھ ماہ تک تخت پوش پر پڑا رہا۔ گو درمیان میں جب بھی موقع ملتا ڈاکٹر کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے لاہور اور سرگودھا کا ایک چکّر لگا آتا۔ تاہم زیادہ عرصہ میں گاؤں ہی میں رہا بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ تخت پوش پر ہی رہا۔ وہیں سوتا، وہیں کھانا کھاتا اور وہیں پڑھتا یا لکھتا رہتا۔ بہ ظاہر میں رُک گیا تھا لیکن جیسا کہ میں نے اوپر لکھا میں کئی سطحوں پر ایک طویل سفر کرنے لگا تھا۔ ایک سطح تو میری داخلی سیاحت کی وہ صورت تھی جس کے تحت میں نے اپنی طویل نظم "آدھی صدی کے بعد" مکمل کی۔ دوسری فکری سفر کی وہ صورت تھی جس کے تحت مَیں نے باہر کی کائنات میں سفر کیا اور آج بھی کر رہا ہوں مگر اس سفر کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں مجھے ایک شمع بھی درکار تھی جس کی روشنی میں مَیں سفر کر سکتا اور ہر چند کہ یہ شمع میری تحویل میں تھی مگر مَیں اس کے طریق کار بلکہ طریقِ استعمال کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ شمع "آگہی" کا وہ عمل تھا جس کی مدد سے انسان نے کائنات پر سے نقاب اتارنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔

سوال یہ تھا کہ آگہی کیا ہے؟

دراصل اپنی کتاب "تخلیقی عمل" لکھنے کے فوراً بعد یہ سوال میرے سامنے اُبھر آیا تھا۔

چنانچہ میں پچھلے دس برس سے اس موضوع کے بارے میں نہ صرف سوچ بچار کرتا رہا تھا بلکہ اپنی سوچ کے نتائج کو ایک سلسلۂ مضامین کے ذریعے محفوظ بھی کرنے لگا تھا۔ اس سلسلے کے بعض مضامین "آشوبِ آگہی" کے مستقل عنوان کے تحت "اوراق" میں شائع ہو کر علمی ادبی حلقوں میں مقبول بھی ہوئے تھے۔ مگر پھر جب میں نے "تصوراتِ عشق و خرد" لکھی تو "آشوبِ آگہی" کے مضامین کا یہ سلسلہ از خود ختم ہو گیا اور آج تک دوبارہ جاری نہیں ہو سکا تاہم یہ موضوع آج بھی میرے لیے اتنا ہی جاندار اور زرخیز ہے جتنا ۱۹۷۲ء کے لگ بھگ تھا۔

میرا بنیادی مؤقف یہ تھا کہ آگہی گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہے کہ ایک حد تک کسی ایک سمت میں جانے کے بعد اپنے مرکز کی طرف لوٹتی ہے اسے چھو کر خود کو REGENERATE کرتی ہے پھر دوبارہ باہر کی طرف لپکنے لگتی ہے۔ بات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے میں نے آگہی کو منطقی سوچ اور وہبی سوچ کا آمیزہ قرار دیا اور کہا کہ انسان منطقی سوچ کے تحت باہر کی طرف لپکتا ہے تاکہ اندھیروں میں اپنے لیے روشنی کی کوئی لکیر تلاش کرے۔ لیکن جب دیکھتا ہے کہ منطقی سوچ کا زور ٹوٹ گیا ہے تو وہبی سوچ سے قوت حاصل کرنے کے لیے اپنے اندر غوّاصی کرتا ہے اور وہبی سوچ کی قوت سے متحرک ہو کر دوبارہ باہر کی طرف لپکتا ہے۔ انسان کا آشوبِ آگہی اس بات میں ہے کہ وہ سدا سے منطقی سوچ اور وہبی سوچ کے درمیان سفر کرتا رہا ہے مگر اس کا یہ عمل سسی فس کے عمل کی طرح بے معنی نہیں ہے کیونکہ اس نے ہر بار جب باہر کی طرف سفر کیا ہے تو کائنات کے کسی نہ کسی نئے حصّے کو روشنی کے دائرے میں ضرور لے آیا ہے۔ اس بات کی توضیح کرتے ہوئے میں نے آشوبِ آگہی کے پہلے ہی مضمون میں لکھا کہ:

"انسان ایک ایسا ذی رُوح ہے جسے روشنی کی مشعل (آگہی) تو حاصل ہو گئی ہے، مگر جسے ابدی تاریکی زُود یا بدیر اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور روشنی کا ننّھا سا نقطہ بجھ کر رہ جاتا ہے۔ تاہم انسان جو مشعل جلاتا ہے اس کی لَو تصوّرات، خیالات اور تخلیقی مظاہر کی صورت، مشعل کے بجھ جانے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ جیسے جیسے انسانوں کا کارواں اس اندھیری کائنات میں آگے ہی آگے بڑھتا ہے اور مشعلیں نمودار ہوتی اور بجھتی چلی جاتی ہیں، ایک پُر اسراری سی لَو (LUMINO SITY)

میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یوں کائنات آہستہ آہستہ ایک مستقل نوعیت کی پُراسرار روشنی سے منوّر ہو رہی ہے یعنی اُسے اپنی ہی ذات کی آگہی حاصل ہونے لگی ہے۔ چونکہ اُسے یہ آگہی انسان کی وساطت سے مل رہی ہے اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ ہم انسان ہی اس کائنات کی "آگہی" ہیں۔ مگر اس کی سزا ہمیں یوں ملی ہے کہ ہم آگہی کے آشوب میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ آپ چاہیں تو اس سزا کی ابتدا کو زوالِ آدم خاکی کے واقعے سے بھی منسوب کر سکتے ہیں۔"

فلسفے کا طالب علم ہونے کے باعث مجھے معلوم تھا کہ یہ موضوع بہت پرانا ہے کبھی اس نے جوہر ESSENCE اور موجود EXISTENCE کی صورت اختیار کی تھی، کبھی BEING (بحوالہ PARMENIDES) اور BECOMING (بحوالہ HERACLITUS) کی ثنویت کا روپ دھارا تھا اور کبھی رُوح اور جسم کی بحث میں خود کو اُجاگر کیا تھا مگر ان تمام مباحث میں ہمیشہ یہ ہوا کہ فلاسفر حضرات متحارب گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ نے جوہر کو مقدّم جانا، دوسرے نے موجود کو! میں نے جب اس بحث کے مدار سے باہر نکل کر اس پر ایک نظر ڈالی تو مجھے محسوس ہوا کہ سوچ کے یہ دونوں رویّے ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کو کروٹ دیتے ہیں۔ انسان وہبی سوچ کے ذریعے اپنی ذات میں مستور ایک زبردست قوّت کو بروئے کار لاتا ہے جب کہ منطقی سوچ کے ذریعے وہ فطرت کو زیرِ بار لانے کی کوشش کرتا ہے۔ منطقی سوچ نہ ہوتی تو انسان جانور کی سطح سے اُوپر نہ اٹھ سکتا۔ وہبی سوچ نہ ہوتی تو اس کی زندگی معنویت سے یکسر تہی رہ جاتی۔ بلکہ خون کی کمی کے باعث منطقی سوچ کا پودا ہی مرجھا کر ختم ہو جاتا۔ سو یہ ایک دوسری کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ میرا خیال یہ بھی تھا کہ پوری انسانی تاریخ میں ان کروٹوں کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

۸

مگر یہ تقریباً دس برس پہلے کی بات تھی ۱۹۸۰ء کے بعد جب میں متعدد سطحوں پر متحرک ہونے کے بعد دوبارہ سفر پر روانہ ہوا تو "آگہی" کے سلسلے میں مجھے مزید آگہی حاصل ہونے لگی۔ دراصل مجھے اس دوران میں کئی ایسی کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا جن میں اس موضوع کو جدید

سائنسی انکشافات کی روشنی میں زیرِ بحث لایا گیا تھا۔ ان میں سے پانچ کتابوں[1] نے مجھے بالخصوص بہت متاثر کیا۔

ان کتابوں کے مطالعہ نے میری سوچ کو مہمیز لگائی اور میں شب و روز اس موضوع کی معیّت میں رہنے لگا۔ میری اکثر شامیں یوں گزرتیں کہ میں چھڑی ہاتھ میں لیے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چلے جاتا۔ مگر میرا دماغ چہل قدمی کے اس عمل سے خود کو منقطع کر کے ایک اور ہی پٹڑی پر دوڑ رہا ہوتا۔ آہستہ آہستہ تاریکی چھٹنے لگی۔ اور موضوع پہلے سپیدۂ سحر کی طرح نمودار ہوا پھر ایک روشن سورج کی طرح چمکنے لگا۔ میں خوشی سے اُچھل پڑا اور میرے دل میں یہ خواہش کلبلانے لگی کہ میں اپنی اس سوچ کے نتائج میں دوسروں کو بھی شریک کروں۔ چنانچہ میں نے "اوراق" کا ایک پورا اداریہ اپنی اس نئی یافت کو منظرِ عام پر لانے کے لئے مختص کر دیا۔ میں نے لکھا:

> "ہمارے یہاں بہت کم لوگوں نے اس بات پر غور کیا ہوگا کہ انسانی دماغ دو ایوانی BICAMERAL ہے۔ مراد یہ کہ وہ پرانا دماغ OLD BRAIN اور نیا دماغ NEW BRAIN پر مشتمل ہے۔ پرانا دماغ سر کے دائیں طرف اور نیا دماغ بائیں طرف ہے۔ پرانا دماغ وجدانی ہے۔ اس کا مزاج عارفانہ اور رویّہ عاشقانہ اور دُور بینی TELESCOPIC ہے۔ جب کہ نیا دماغ مزاجاً منطقی، تجزیاتی اور خورد بینی MICROSOPIC ہے۔ زبان دانی اور مین میخ نکالنا اس کے امتیازی اوصاف ہیں۔"

---

[1] ARTHUR KOESTLER: THE GHOST IN THE MACHINE.

[2] LYALL WATSON: LIFETIDE.

[3] JULIAN JAYNES: THE ORIGIN OF CONSCIOUSNESS IN THE BREAKDOWN OF THE BICAMERAL MIND.

[4] COLIN WILSON: THE STAR-SEEKERS.

[5] JOSEPH CAMPBELL: CREATIVE MYTHOLOGY.

ظاہر ہے کہ میں سالہا سال سے وہبی سوچ اور منطقی سوچ کے مابہ الامتیاز کے بارے میں جو کچھ لکھتا رہا تھا اب سائنس نے اس کی توثیق کر دی تھی یا کم از کم مجھے اپنے نظریے کی سائنسی بنیاد اب حاصل ہونے لگی تھی۔ اتنا تو مجھے "آشوبِ آگہی" لکھتے ہوئے بھی معلوم تھا کہ انسانی دماغ دراصل دو حصّوں پر مشتمل ہے جن میں بائیں طرف کا حصّہ بطور ایک TUMOUR اس کے جسمانی ارتقا کی تاریخ میں بہت بعد میں نمودار ہوا۔ ورنہ اس نے زیادہ وقت پُرانے دماغ ہی کے ساتھ گزارا ۔ مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں کے مزاج میں اتنا بڑا فرق بھی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ انسانی دماغ دراصل تین دماغوں پر مشتمل ہے۔ سب سے نچلی سطح REPTILIAN BRAIN کی ہے اس کے اوپر MAMMALIAN BRAIN ہے جس میں سے ایک تازہ شاخ "نئے دماغ" کی صورت پھوٹ نکلی ہے اور بے سبب نہیں پھوٹی بلکہ زندگی کے تقاضوں کے پیشِ نظر اس نے جنم لیا ہے اور یہ نیا دماغ سرِ تسلیم خم کرنے کے بجائے سوال کرتا ہے، ہر شے کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ بنے بنائے اصولوں اور احکامات کو ماننے سے منکر ہے۔ انفرادیت اور بغاوت اس کا انداز بھی ہے اور نوشتۂ تقدیر بھی۔ یہ نیا دماغ روز بروز نہ صرف طاقتور ہو رہا ہے بلکہ اس نے پُرانے دماغ کو دھکیل کر پس منظر میں بھی پہنچا دیا ہے۔ تاہم دونوں میں لین دین کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ حیاتیاتی طور پر دماغ کے ان دونوں ایوانوں کو ملانے والا ایک کوریڈار بھی ہے جسے عام لوگ پار نہیں کر پاتے لیکن جسے تخلیق کار غیر شعوری سطح پر عبور کرتے ہیں۔ اور پھر وہ پُرانے دماغ سے ایک انوکھی قوّت حاصل کر کے تخلیقی طور پر فعّال ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اوراق کے اسی اداریہ میں مزید لکھا کہ

"پُرانا دماغ منفعل ہے ایٹم کی طرح اس کی ساری وہبی قوّت MYSTIC FORCE گویا ایک کیپ سول میں بند ہے جب کہ نیا دماغ فعّال اور بیقرار ہے۔ پھٹتے ہوئے ایٹم کی طرح اس کی قوّت چاروں اطراف میں ہمہ وقت پھیلتی ہے۔ نئے دماغ سے آشنا ہوئے بغیر پُرانا دماغ تخلیق کاری کے سلسلے میں ممد ثابت نہیں ہو سکتا جب کہ نیا دماغ اپنی کارکردگی کے لیے پُرانے دماغ کا

دست نگر ہے۔ یہ ایک ایسی مشین ہے جسے ساری قوّت پُرانے دماغ ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا جب تک اسے پُرانے دماغ کا لمس حاصل نہ ہو وہ تخلیق کاری میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظوں میں تخلیق کاری نہ تو اُن لمحات میں ممکن ہے جب نیا دماغ خود کو پُرانے دماغ سے پوری طرح منقطع کر لیتا ہے اور نہ ان لمحات میں جب وہ اس سے متصادم ہوتا ہے۔ تخلیق کاری تو صرف اُن لمحات میں ممکن ہے جب یہ دونوں دو آئینوں کی طرح ایک دوسرے کے رُو برو آتے ہیں اور عکسوں کا ایک ایسا لا متناہی سلسلہ وجود میں آتا ہے جو بے ہیتی کے عالم سے گزر کر بالآخر فن پارے کی تخلیق پر منتج ہو جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابتداءً صرف "پُرانا دماغ" ہی انسان کی تحویل میں تھا۔۔۔ چنانچہ وہ جبلّتوں کا زرہ بکتر پہنے، وجدان کی شمع جلاتے اپنی کائنات سے پوری طرح ہم آہنگ تھا (گویا دوئی کی کوئی صُورت ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی) مگر پھر یوں ہوا کہ پُرانے دماغ کے اندر سے نیا دماغ اس طور باہر آ گیا جیسے کسی بوڑھے درخت کے تنے سے ایک نئی شاخ پُھوٹ نکلتی ہے یا جیسے آدمؑ کی پسلی سے حوّاؑ برآمد ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب ان دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا شروع کیا تو زندگی کا وہ تخلیقی دَور شروع ہوا جو مرورِ ایام کے ساتھ لطیف تر اور پیچیدہ تر ہوتا چلا گیا ہے۔

مگر تصوّف والے اس تقسیم اور تفریق کی افادیّت کو نہیں مانتے۔ ان کے خیال میں انسان کا سارا "دُکھ" ہی اس تفریق اور تقسیم کا شاخسانہ ہے۔ اصل حقیقت غیر منقسم ہے۔ لہٰذا جُز کو اپنی جُزویّت کے احساس سے نجات پا کر کُل میں جذب ہو جانا چاہیے۔ یہی حال نفسیات والوں کا ہے وہ کہتے ہیں کہ تمام نروسس ان دونوں کے باہمی جھگڑے کا نتیجہ ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اگر ان دونوں میں صلح صفائی ہو جائے اور دونوں باہم مربوط ہو جائیں تو شخصیّت کے اجزا جُڑ کر SELF میں تبدیل ہو سکتے

ہیں - اس سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ تخلیق کاری جُز اور کُل کے فرق کو مٹانے
میں نہیں بلکہ ان کے ایک دوسرے کے رُوبرو آنے اور گفتگو DIALOGUE
شروع کرنے میں ہے وغیرہ"

قبل ازیں میں کئی بار اس عجیب و غریب تجربے سے گزرا تھا کہ جب کبھی "آمد" کے لمحے
آتے تو میں "اندر" سے اُبھرنے والی آواز کو لفظوں میں منتقل کرنے سے گھبراتا - خود سے کہتا کہ یہ
خیال یا تشبیہہ یا تمثال جس سے میں آشنا ہوا ہوں اب میری تحویل میں آگئی ہے لہٰذا کسی وقت
بھی بڑے اطمینان سے اسے سپردِ قلم کر لوں گا - بعد ازاں میں بار بار "سپردِ قلم" کرنے کے عمل کو
ملتوی کرتا رہتا - پھر جب میں کسی روز خود کو مجتمع کر کے چاہتا کہ اس "نیک کام" سے فارغ ہو ہی
جاؤں تو دیکھتا کہ دماغ اُس سلیٹ کی طرح ہو گیا ہے جسے اسفنج کے ٹکڑے سے صاف کر دیا
گیا ہو - میں حیران ہوتا کہ وہ تمثال یا تشبیہہ یا خیال کہاں چلا گیا جس سے میں آشنا ہوا تھا — ؟
مگر اس معمّے کو حل نہ کر پاتا - دائیں اور بائیں دماغ کی کارکردگی سے واقف ہوتے ہی میرے
لیے یہ معمہ حل ہو گیا - اب مجھے معلوم ہوا کہ نطق تو بائیں دماغ کی تحویل میں ہے جب کہ دایاں
دماغ گونگا ہے - چونکہ آمد کے لمحات میں دایاں دماغ بائیں دماغ کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے
لہٰذا بائیں دماغ کی کارکردگی یعنی خیال کو لفظ میں منتقل کرنے کا اقدام از خود ملتوی ہونے لگتا
ہے - اسی دوران دایاں دماغ اس خیال یا تشبیہہ یا تمثال کو چپکے سے مٹا دیتا ہے جو ایک لمحۂ
خود فراموشی میں تخلیق ہوئی تھی تاکہ اس کی یہ بے لفظ گونگی بات لفظوں سے داغدار نہ ہونے
پائے - اگر سُر یا رنگ کو بطور میڈیم استعمال کیا جائے تو پھر اس رکاوٹ کا سامنا کرنا نہیں پڑتا
کیونکہ دائیں دماغ کی طرح یہ دونوں میڈیم بھی گونگے ہیں - اور وہ جو کہتے ہیں کہ گونگے کی بات
گونگے کی ماں سمجھتی ہے سو یہ میڈیم دائیں دماغ کی بات کو بآسانی سمجھ جاتے ہیں اور اسے
جسم عطا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں - دوسری طرف خود زبان بھی کہ ہمہ وقت گویا رہتی ہے گونگے دماغ
کی بات کو DECODE کرنے سے گھبراتی ہے - لہٰذا آمد کے لمحات میں تخلیقی عمل کو ملتوی
کرنے کا رویّہ اُبھر آتا ہے - مگر وہ تخلیق کار جو ملتوی کرنے کے میلان سے مغلوب نہیں
ہوتے، اس کوریڈار یعنی کارپس کیلوسم CORPUS CALLOSUM کو عبور کر جاتے ہیں جو

بائیں دماغ کو دائیں دماغ سے جوڑتا ہے اور یوں دائیں دماغ کے دیار کو چھو کر کندن بن جاتے ہیں۔ بایں ہمہ "زبان" دائیں دماغ کی باتوں کو پوری طرح گرفت میں لینے سے معذور رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موسیقی اور مصوری میں ابلاغ سو فی صد ہوتا ہے جب کہ شاعری اور نثری ادب میں ایسا نہیں ہوتا۔

جب میں نے اس موضوع پر مزید غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں نے "تخلیقی عمل" میں جن مدارج کا ذکر کیا تھا ان میں ایک اور مرحلے کا اضافہ اب ضروری ہو گیا ہے۔ میرا نظریہ یہ تھا کہ جب انسانی سائکی میں منفعل اور فعال عناصر ایک دوسرے سے ٹکرا کر بے ہیئت ہو جاتے ہیں تو تخلیق ایک جست کی صورت میں یوں باہر آتی ہے جیسے کائنات پہلی بار "عدم" کی حالت سے باہر آئی تھی۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچا کہ دراصل خود تخلیق کار جست لگا کر ایک ایسے "عالم" میں آجاتا ہے جہاں اس کے اندر کی دونوں سطحیں (پرانا دماغ اور نیا دماغ) ایک دوسری سے ہم کلام ہونے لگتی ہیں۔ اور رنگ اور آواز اور لفظ اس "گفتگو" کو تصویروں، نغموں اور تمثالوں میں ریکارڈ کرنے لگتے ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ یہ گفتگو اس ٹیپ پر از خود ریکارڈ ہو جاتی ہے۔

مگر میں نے سوچا میں یہ کیا کہہ رہا ہوں۔ اگر آگہی منطقی سوچ اور وہبی سوچ کا آمیزہ ہے اور تمام تخلیقی اقدامات ان دونوں کے انضمام کا ثمر ہیں تو پھر وہ کون ہے جو ابھی ابھی اس آمیزے کے وجود سے آشنا ہوا ہے؟ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں تو منطقی سوچ اور وہبی سوچ دونوں کو ایک "تیسری آنکھ" سے دیکھ رہا ہوں مگر سوال یہ تھا کہ یہ تیسری حیثیت نوعیت کے اعتبار سے کیا تھی؟ کیا یہ وہی شے تو نہیں تھی جسے نفسیات والوں نے SELF اور اقبال نے "خودی" کا نام دیا ہے یعنی جب انسان جذب کے عالم کو مس کر لینے کے باوجود "شعورِ ذات" سے متصف رہتا ہے؟ گویا شعورِ ذات اصلاً تیسری آنکھ کھلنے کی وہ صورت ہے جو خود "جذب کے عالم" کی بھی ناظر ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر آگہی، "منطقی سوچ، وہبی سوچ اور شعورِ ذات" ان تینوں کا آمیزہ ہوئی نہ کہ صرف "منطقی سوچ اور وہبی سوچ کا۔ تب میں نے خود سے سوال کیا کہ اب یہ کون ہے جسے اس "تثلیث" کا شعور حاصل ہوا ہے؟ اور میں اس

نئے شعور کو اب کس نام سے پکاروں ؟ میں عجیب سے مخمصے میں تھا کیونکہ ہر بار میرے اندر ایک نئی ہستی جنم لے کر اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر آگہی کے پرتوں کو دیکھنے لگتی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اسی طرح پیچھے کو ہٹتا گیا تو اسی نسبت سے آگہی کے پرتوں میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔ شاید پیچھے ہٹنے کی بھی کوئی حد نہیں اور پرتوں کے وجود میں آنے پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ آگہی دائرہ در دائرہ HIERARCHIES کی صورت ازل سے ابد تک پھیلی ہوئی ہے اور میرا "آگہی کو دیکھنے کا شعور" بھی دائرہ در دائرہ پھیلنے پر قادر ہے۔ گویا دونوں اطراف لامتناہی ہیں۔ عجیب سا احساس تھا! یہ ایسے ہی تھا جیسے کوئی فلم دیکھ رہا ہو اور فلم چلانے والا "فلم اور اس کے دیکھنے والے" کو دیکھنے لگے اور پھر کوئی اور شخص فلم چلانے والے کو دیکھے کہ وہ فلم دیکھنے والے کو دیکھ رہا ہے اور یہ سلسلہ ابد تک پھیلتا ہی چلا جائے۔

۹

آگہی کی اس کارکردگی کے احساس نے مجھے چونکا دیا کیونکہ کائنات کی لامحدودیت کو محسوس کرنے کے لیے مجھے ایک ایسے ہی ہتھیار کی ضرورت تھی جو خود اپنے اندر لامحدود امکانات رکھتا ہو۔ سو اب میرے دل میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ دیکھیں اندر کی کائنات تو دائرہ در دائرہ ہے باہر کی کائنات کا کیا حال ہے ؟ لہٰذا میں ایک بار پھر سفر پہ روانہ ہو گیا۔ مگر یہ ایک عجیب سفر تھا جس میں میں مبتلا بھی تھا اور اکھاڑے کے باہر کھڑا خود کو سفر کرتے ہوئے بھی دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک طرح کی ASTRAL FEELING تھی جس کے تحت میں دو حصّوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک حصّہ مارکوپولو کی طرح مصروفِ سفر تھا جب کہ دوسرا حصّہ ایک یوگی کی طرح اپنی ہی ذات کے کیلاش پہ بیٹھا مارکوپولو کو سفر کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مارکوپولو جس سپوتنک (یعنی کرّۂ ارض) پر سوار تھا وہ بیک وقت کئی مداروں میں گردش کر رہا تھا مگر سوال یہ تھا کہ باقی سیّارے تو بنجر پڑے ہیں۔ صرف زمین ہی زندگی کا گہوارہ کیوں ہے ؟ اور پھر یہ کہ کیا زندگی نے اس زمین پر جنم لیا ہے یا وہ بھی ایک مسافر ہے جو نہ جانے کہاں سے آیا ہے اور کہاں جاتے ہوئے اس نے کچھ عرصہ کے لیے

زمین پر بسیرا کر لیا ہے۔ یہ زمین تقریباً ساڑھے چار ارب سال پہلے وجود میں آئی تھی۔ مگر اس پر زندگی اس کے کافی عرصہ بعد نمودار ہوئی۔ سر ہائل نے لکھا ہے کہ زندگی کا زمین کی کوکھ سے جنم لینا محلِ نظر ہے کیونکہ زندگی کے وجود میں آنے کے لیے سینکڑوں AMINO ACIDS کی زنجیریں درکار ہیں اور ان میں سے ہر زنجیر کی ہر گرہ میں کم از کم بیس امکانات مضمر ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اگر ہر سیکنڈ کے بعد ایک نئے "امکان" کو آزمایا جائے تو بھی اس کرۂ ارض پر "زندگی" کو وجود میں آنے کے لیے زمین کی کُل عمر سے لاکھوں گنا زیادہ عرصہ درکار ہے۔ چنانچہ سر ہائل اور پروفیسر چندر وکرم سنگھ دونوں کا یہ خیال ہے کہ زندگی MICRO-ORGANISMS کی صورت کسی نہ کسی شہابِ ثاقب یا ہیلی ایسے دم دار ستارے پر سوار زمین کے قریب سے گزرتے ہوئے یہ دیکھ کر کہ زمین اس کی رہائش کے لیے موزوں ہے، اس پر اتری ہو گی۔ مگر زمین کی فضا اس کی نشوونما کے لیے پوری طرح موزوں نہیں تھی۔ سو اس نے زمین پر آنے کے بعد خود آہستہ آہستہ اپنے لئے فضا پیدا کی ہو گی۔ آج زمین کے گرد پھیلی ہوئی فضا جو باہر سے دم بدم آنے والی قاتل شعاعوں سے زندگی کو بچائے ہوئے ہے، زندگی کی اپنی پیدا کردہ ہے، مگر تا بہ کے؟ اگر انسان نے خود ہی ایٹمی جنگ لڑ کر فضا ATMOSPHERE کے اس غلاف کو پھاڑ نہ دیا تو بھی ایک دن اس غلاف کو بہر حال پھٹنا ہے اور جب ایسا ہُوا تو زمین پر نشوونما پانے والی "زندگی" یا تو جاں بحق ہو جائے گی یا ایک بار پھر سفر پر روانہ ہو گی تاکہ اپنے لئے کوئی اور بسیرا تلاش کرے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس بھری پُری کائنات میں "زندگی" ایک خانہ بدوش ہے جو اپنی بقا کا سامان اُٹھائے، ایک پتّھر سے جست لگا کر دوسرے پتّھر پر اُترتی ہے۔ پھر اس پتھر پر اپنا "سفرنامہ" تحریر کرنے کے بعد اگلے پتّھر کی طرف کُود جاتی ہے۔

(۱۰)

اپنی ذات کے کیلاش پر سے میں نے دیکھا کہ زمین نظامِ شمسی کا ایک بالکل چھوٹا سا

رُکن تھی اور خود نظامِ شمسی کہکشاں کے ایک غیر اہم گوشے میں یوں پڑا تھا جیسے گھر سے کوڑا کرکٹ نکال کر باہر گلی میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اصل چیز تو کہکشاں تھی جو ایک کھرب ستاروں کا ایک چھتّہ تھا۔ اس میں PULSERS بھی تھے نووا NOVA بھی اور سپر نووا کے مظاہر بھی! اور شاید اینٹی میٹر کے ستارے بھی ——— گویا کارکن مکھیاں بھی، نکھٹو یعنی DRONES بھی اور شہد کے چھتّے کی ملکہ بھی! مگر ملکہ کہاں تھی؟ شاید ملکہ وہ آنکھ تھی جو اپنے چھتّے کے عین درمیان سے نگراں تھی۔ خود نظامِ شمسی اندھے سمپسن کی طرح اس کہکشاں کے گرد گھوم رہا تھا جب کہ خود کہکشاں ایک نقطے کے گرد گھومنے میں مصروف تھی۔ مگر یہ نقطہ کیا تھا؟ مجھے بتایا گیا تھا کہ ممکن ہے یہ نقطہ ایک بلیک ہول ہو۔ میں نے کئی بار دریا کے کنارے کھڑے ہو کر بھنور کی کارکردگی کو دیکھا تھا اور حیران ہوا تھا کہ کس طرح بھنور کے قریب آتے ہی پانی ایک دائرے میں گھومتے ہوئے بھنور کی آنکھ کے اندر اُتر جاتا تھا۔ پھر جب اس پانی پر کوئی شئے تیرتی ہوئی آتی تو وہ بھی بھنور کی آنکھ کے اندر اُتر جاتی۔ کیا اسی طرح کہکشاں کے مرکز میں بھی بھنور کی ایک آنکھ تھی۔ جس کی کششِ ثقل اتنی زیادہ تھی کہ روشنی بھی اس سے پار نہیں جا سکتی تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ آنکھ بجائے خود ایک بلیک ہول تھی جو دم بدم اس کہکشاں کو کھاتی جا رہی تھی؟ ——— میں نے رونگٹے کھڑے کر دینے والا یہ منظر دیکھا تو مجھے کہکشاں سے ہمدردی ہو گئی۔ بے چاری ایک بھنور کی زد میں آ گئی تھی اور ہمہ وقت بھنور کے گرد دیوانہ وار گھومتے ہوئے اس کے اندر اترتی چلی جا رہی تھی۔

میں نے کیلاش کی بلندی سے جب دوسری بار کہکشاں پر ایک نظر ڈالی تو مجھے خود کہکشاں کائنات میں پھرنے والے ایک مسافر کی طرح دکھائی دی۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس کہکشاں کی طرح لاتعداد دوسری مسافر کہکشائیں بھی سراسیمگی کے عالم میں تھیں۔ وہ نجانے کس شئے سے خوف زدہ تھیں۔ پوری کائنات ایک عظیم دھماکے میں سے گزر رہی تھی جس طرح دھماکے کی صورت میں ہر شئے بے پناہ رفتار کے ساتھ مرکز سے باہر کی طرف لپک رہی ہوتی ہے بالکل اسی طرح مجھے کہکشائیں کائنات کے مرکزی نقطے سے

باہر کی طرف لپکتی ہوئی دکھائی دیں۔ چاروں طرف گیس کے بڑے بڑے "جزیرے" سے بن گئے تھے۔ اور ان جزیروں میں اربوں کی تعداد میں ستارے پھنسے ہوئے تھے بالکل جیسے مکڑی کے جال میں مکھیاں اور پتنگے پھنس جاتے ہیں۔ ع:

کہکشاؤں میں تڑپتے تھے ستاروں کے پرند
سبز آکاش پہ ہر سُو تھے بچھے جال اُس کے

ہر طرف پُھلجھڑیاں روشنی کی پتیاں بکھیر رہی تھیں۔ چھوٹے بڑے پٹاخے چھوٹ رہے تھے۔ کائنات کے آخری سرے پر QUASERS تھے جو دراصل ایسی کہکشائیں تھیں جو ابھی بمشکل بیضہ سے برآمد ہوئی تھیں اور ان کے ساتھ ہی BSOS تھے جن سے کوئی ریڈیائی پیغام نشر نہیں ہو رہا تھا اور جو دراصل بُجھے ہوئے QUASERS تھے۔ پوری کائنات میں ایک کہرام برپا تھا اور مارکوپولو صاحب اس کہرام میں خود بھی ایک کہکشاں کی طرح گھبرائے ہوئے اندھا دُھند بھاگ رہے تھے۔

مگر دوسری طرف میں نے کیلاش کی چوٹی پر سے دیکھا کہ اتنے بڑے دھماکے سے گزرنے کے باوجود تمام کہکشائیں دراصل ایک عظیم بھنور کے کناروں پر گردش کر رہی تھیں۔ تو کیا کائنات کے مرکز میں بھی ایک بلیک ہول تھا جو پوری کائنات کو کھا رہا تھا؟

(۱۱)

مگر نہیں! ابھی "کھانے" کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ابھی تو اس نے پہلے کا کھایا ہوا ہی اگلا

ؔ یہ سوال میں نے خود سے جنوری ۱۹۸۶ء میں کیا تھا؟ آج (۱۹ مئی ۱۹۸۶ء) کے ٹائم TIME میں پڑھا کہ سائنسدان ایڈوِن ٹرنر EDWIN TURNER نے کائنات میں ایک ایسی شے کا سُراغ لگایا ہے جو تقریباً ایک ہزار کہکشاؤں کے MASS کے برابر ہے۔ یہ شے ٹیلی سکوپ کی نظروں سے اوجھل ہے۔ فقط اس شے کے دوسری طرف ایک QUASER سے آنے والی روشنی نے جو قوس بنائی ہے اس کی مدد سے اس کے وجود اور حجم کا پتہ چلا ہے۔ خیال ہے کہ یہ ایک بہت بڑا بلیک ہول ہے۔ ایک ایسا مقام جہاں BIG BANG کے ساتھ کائنات کی ابتدا ہوئی تھی۔

تھا۔ اور یہ اُگلا ہوا مواد دم بدم ٹھنڈا ہو کر صورتوں میں ڈھل رہا تھا۔ انتہائی ٹمپریچر کی صورت میں تو کوئی صورت باقی ہی نہیں رہتی۔ جو کائنات مجھے نظر آ رہی تھی وہ ٹمپریچر کے کم ہونے ہی کا شاخسانہ تھی۔ اس کے آخری سرے پر میری زمین تھی جس پر ٹمپریچر بمشکل اتنا تھا کہ زندگی کو پناہ دے سکے۔ میرے اپنے جسم کا درجہ حرارت 37°C ہے۔ اس سے زیادہ ہو تو میں جلنے لگتا ہوں، کم ہو تو میں بجھنے لگتا ہوں۔ عجیب سا پُل صراط ہے جس پر میں ہمہ وقت گام زن ہوں۔ مگر کائنات کے مرکز میں آج بھی ٹمپریچر بہت زیادہ ہے۔ دھماکے سے ذرا پہلے یہ کائنات آگ کا ایک گولا تھا جس کا ٹمپریچر ایک ٹریلین ڈگری تھا لیکن پہلے ہی تین سیکنڈ کے اندر اندر کم ہو کر صرف ۵ بلین ڈگری رہ گیا۔ اس کے بعد جب وہ تقریباً اٹھارہ ارب سالوں کا سفر طے کر کے مجھ تک پہنچا تو صرف 37°C رہ گیا تھا۔

دھماکے سے ایک سیکنڈ پہلے کائنات ایک بلیک ہول تھا جس میں چاروں قوتیں یعنی الیکٹرمیگنیٹنک قوّت، مضبوط قوّت، کم زور قوّت اور کششِ ثقل، یہ سب یکجا تھیں اور ابھی PARTICLES کی تقسیم بھی نہیں ہوئی تھی۔ گویا مادہ اور وہ قوّت جو مادہ کو متاثر کرتی ہے۔ ان دونوں میں یکتائی کا ایک مستقل عالم موجود تھا بلکہ خود مادہ اور قوت کی تقسیم بھی نہیں ہوئی تھی صرف وحدت ہی وحدت تھی[1]۔ مگر دھماکے کے چند ہی منٹ کے اندر اندر نیوٹرون اور پروٹون چار چار کی تعداد میں یکجا ہوئے اور ہیلیم ایٹم کا مرکزہ بن گئے۔ یہ نظر آنے والی کائنات کی ابتدا تھی۔ اس کے اربوں سال بعد ٹمپریچر کے کم ہونے پر کاربن پیدا ہوئی جس کے مرکزہ میں چھ پروٹون اور چھ نیوٹرون تھے۔ یہ گویا "زندگی" کی ابتدا تھی!

کیلاش کی چوٹی پر سے میں نے دیکھا کہ دھماکے کا زور ٹوٹ گیا تھا اور باہر کی طرف

---

[1] HAROLD FRITZSCH نے اپنی کتاب QUARKS میں ایک جگہ لکھا ہے کہ جب ENERGY اور MASS اپنی انتہائی صورت کو پہنچتے ہیں تو مضبوط قوت، کم زور قوت اور الیکٹرومیگنیٹنگ قوّت ـــــ یہ تینوں ایک ہو جاتی ہیں۔ اس قدر کہ QUARKS اور LEPTONS ـــــ میں بھی کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ البتہ جب ٹمپریچر 10^{15} GEV کے مقام سے نیچے گرتا ہے تو تقسیم کا عمل نمایاں ہونے لگتا ہے۔

اُڑتی ہوئی کہکشائیں ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد لوٹنے لگی تھیں۔ وہ دائرہ در دائرہ "مرکزی بھنور" کے مدار میں داخل ہو رہی تھیں۔ جیسے جیسے وہ مدار کے قریب آتیں ان کا ٹمپریچر بڑھنے لگتا۔ پہلے کاربن ختم ہوتی پھر ایٹم ٹوٹنے لگتے۔ دم بدم کشش ثقل میں اضافہ ہونے لگا اور مرکزی بلیک ہول نے ہر شئے کو نگلنے کے لیے اپنا منہ پوری طرح کھول دیا۔ وہ شیو دیوتا کی طرح کائنات کا سارا زہر چوسنے لگا۔ ہوتے ہوتے سارے ہیڈرونز HADRONS جو پروٹون، نیوٹرون اور میسون پر مشتمل تھے اور سارے لیپٹونز LEPTONS جو الیکٹرون، نیوٹری نوز NEUTRINOS اور موآن سے عبارت تھے اور تینوں کوارکس QUARKS جن سے ایک پروٹون مرتب ہوا تھا — یعنی وہ سب جنہیں کائنات کے BUILDING BLOCKS کہنا چاہئے۔ ایک دوسرے سے ٹکرا کر نیست ہو گئے۔ پھر چاروں قوتیں ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک ہو گئیں۔ اب تخلیق کی پہلی ضرب یعنی کن فیکون میں صرف 10^{-43} سیکنڈ کا وقفہ باقی تھا۔ پھر یہ وقفہ بھی ختم ہو گیا اور بظاہر "ناموجود" کے سوا کچھ موجود نہ رہا۔ تب دو سائنسدانوں کی ایک گفتگو میرے کانوں میں گونجی۔ ان میں سے ایک کا نام ول انکن اور دوسرے کا نام کول مین تھا۔ اور گفتگو یہ تھی:

ول انکن: "بھائی! یہ کائنات کسی 'دوسرے عالم' سے آئی اور ایک حباب کی طرح زمان و مکان کے اندر نمودار ہو گئی۔ مگر یہ دوسرا عالم 'ناموجود' کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔"

کول مین: "ناموجود؟ — ناموجود سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

ول انکن: "ناموجود کا مطلب ہے نہ زمان نہ مکان!"

کول مین: "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ابتدا میں کچھ بھی نہ تھا اور پھر کائنات نے اس 'ناموجود' کے اندر سے ایک جست بھری اور 'وقت' کے اندر نمودار ہو گئی؟"

ول انکن: "ہاں بھائی! یہ کائنات 'ناموجود' ہی سے وجود میں آئی ہے۔"

سو اب میری آنکھوں کے سامنے ایک ایسا ناموجود تھا جس کا نہ "اندر" تھا نہ باہر۔ مگر میں بدستور کیلاش کی چوٹی پر بیٹھا اس "ناموجود" کا نظارہ کر رہا تھا اور خود سے پوچھ رہا تھا

کہ اگر ناموجود کے اندر قوانین کی ایک مستقل صورت موجود تھی تو پھر دھماکہ کیسے ہوا یا کس نے کیا ؟

(۱۲)

کانٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ زمان اور مکان دونوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ فقط ہمارے ذہنوں کی اختراع ہے۔ کولن ولسن کا خیال ہے کہ اسی کارن ہم بتا نہیں سکتے کہ مادے کی کائنات میں "مکان" کہاں ختم ہوتا ہے اور کہاں سے "زمان" کا آغاز ہوتا ہے کیونکہ یہ دونوں انسانی ذہن کی تخلیق ہیں اور صرف دائیں جانب کا دماغ ہی ان کے انت کو پا سکتا ہے۔ مگر کیا واقعی ؟ کیونکہ "روشنی" نہ تو دائیں جانب کے دماغ کی میراث ہے نہ بائیں جانب کے دماغ کی۔ روشنی یعنی اندر کی روشنی تو اُس مقام پر طلوع ہوتی ہے جہاں یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل آ کر "گفتگو" کا آغاز کرتے ہیں اور یہ بات ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ صرف تخلیقی اذہان ہی اندر کے بے انت مکان اور بے نہایت زمان کو چھُو لینے پر قادر ہو سکتے ہیں۔ مجھے اندر کی اس کائنات کو جاننے کی خواہش ہوئی جو باہر کی کائنات سے مختلف نہیں تھی۔ تب مجھے GEOFFREY CHEW کے بوٹ سٹریپ نظریے BOOTSTRAP HYPOTHESIS کا خیال آیا جس کے مطابق یہ کائنات ایک ایسا مربوط "کُل" ہے جس کا نہ صرف ہر جُز اتنا ہی بنیادی ہے جتنا کہ کوئی اور جُز بلکہ تمام اجزا ایک دوسرے میں پیوست بھی ہیں۔ اس طور کہ ہر ہیڈرون خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گِلِ کوزہ کے بمصداق ہیڈرونز پر ہی مشتمل ہوتا ہے اور خود بھی کسی ہیڈرون کا جُز ہے نیز ہر ہیڈرون نہ صرف دوسرے ہیڈرونز کو تخلیق کرتا ہے بلکہ خود بھی دوسرے ہیڈرونز کی تخلیق ہے۔

مجھے یاد آیا کہ یہی تو تصوّف کے نظریۂ وحدت الوجود کا عطر بھی ہے۔ یہ نظریہ کُل اور جُز کی تفریق کو نہیں مانتا۔ کُل بیک وقت کُل بھی ہے اور جُز بھی اور اسی طرح ہر جز میں پورا کُل سمایا ہوا ہے۔ ع

"قطرہ میں دجلہ دکھائی دے اور جُز میں کُل"

مگر مجھے محسوس ہوا کہ کُل اور جُز کے اس ربطِ باہم کو دیکھنے والا "مَیں" تو پھر بھی کیلاش کی

چوٹی پر ہی بیٹھا رہا اور اس سب کا ادراک کرتا رہا۔ کہیں ایسا تو نہیں (اور یقیناً ایسا ہی ہے) کہ موجود کی یہ ساری HIERARCHY کسی عظیم تر خلاق قوت کے لاانتہا مظاہر میں سے ایک ہے اور ''میں'' کہ اس ''قوت'' کا ایک ادنیٰ مظہر ہوں۔ موجود میں مبتلا ہونے کے باوجود اس کے مدار سے باہر کھڑا اس کا نظارہ بھی کر رہا ہوں۔ معاً میں اپنی اس نئی حیثیت سے آشنا ہوا جو صرف تخلیقی لمحے ہی میں وارد ہوتی ہے —— ایک ایسا لمحہ جس میں جُز، کُل کو مَس تو کرتا ہے مگر اس لمس کے لیے اپنی جزویت کا بلیدان نہیں دیتا۔

۱۳

کیونکہ اگر وہ ایسا کرے تو باقی نہ رہے۔ انسان کے اندر کا لاشعور ہو یا باہر کا ناموجود یہ اس وقت تک نیست ہے جب تک یہ شعور کی حامل اکائی کے روبرو نہیں آجاتا۔ بدھ مت والے کہتے ہیں کہ جب ذہن انتشار کی زد میں آتا ہے تو اشیا اور مظاہر کی کثرت جنم لیتی ہے جب وہ شانت ہوتا ہے تو کثرت ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ذہن کو نروان کے ذریعے شانت کر دینا چاہیے —— زین بدھ مت کے ایک رشی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ایک بار کوئی پروفیسر اس سے ملنے آیا تاکہ نروان کے بارے میں کچھ جانکاری حاصل کر سکے۔ رشی اس کے لیے چائے بنانے میں منہمک ہو گیا، جب کہ پروفیسر (جیسا کہ پروفیسروں کا دستور ہے) اس کے سامنے اپنے علم وفضل کے انبار لگاتا چلا گیا۔ اسی دوران پروفیسر نے دیکھا کہ اُس کی چائے کی پیالی تو لبالب بھر چکی ہے مگر رشی ہے کہ اس میں چائے انڈیلے ہی چلا جا رہا ہے۔ سو اس نے گھبرا کر رشی سے کہا۔ ''مہاراج! رُک جائیے پیالی میں مزید چائے کی گنجایش نہیں ہے، ساری چائے باہر گر رہی ہے۔''

رشی نے پروفیسر کی بات سُنی تو اس نے تبسّم کیا اور پھر اطمینان سے بولا: ''بھائی پروفیسر! بالکل اسی طرح تیرا کاسۂ سر بھی تو لبالب بھرا ہوا ہے۔ جب تک تُو اسے پہلے خالی نہیں کرے گا میں اس میں نروان کیسے ڈال سکوں گا۔''

بقول زین بدھ مت عطیّہ قبول کرنے کے لیے پہلے کاسۂ سر کو خالی کرنا ضروری ہے بلکہ یہ

خالی کرنا بجائے خود نروان ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ بُدھ مت کا یہ نظریہ دراصل نئے دماغ کے خلاف پُرانے دماغ کی ایک سازش ہے کیونکہ پُرانا دماغ نہیں چاہتا کہ نیا دماغ "چوتھی کھونٹ" کی طرف جائے۔ دوسرے لفظوں میں چونکہ خود "پُرانا دماغ" ہی چوتھی کھونٹ ہے اس لیے وہ نہیں چاہتا کہ کوئی اس کے مراقبے میں مخل ہو۔ دوسری طرف جب نیا دماغ پُرانے دماغ کے رُوبرو آتا ہے تو خود پُرانے دماغ کے اندر کلبلاہٹ سی پیدا ہوتی ہے جو بالآخر ایک دھماکے پر منتج ہوتی ہے اور تخلیق کاری کے عمل کا آغاز ہو جاتا ہے۔

(۱۴)

"تصوّراتِ عشق و خرد" لکھتے ہوئے مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ انتہائی رفتار اور انتہائی سکون (ٹھہراؤ) ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ جب میں سائنس کے جدید ترین نظریات سے آگاہ ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سائنس کے مطابق جیسے جیسے ENERGY اور MASS اپنے انتہائی مراحل کی طرف بڑھتے ہیں، وحدت کا عمل تیز تر ہو جاتا ہے۔ آخر آخر میں چاروں قوتیں بھی ایک ہو جاتی ہیں اور ایک ایسی صورت وجود میں آ جاتی ہے جو ایک لامحدود ٹھہراؤ ہی کا دوسرا نام ہے۔ مگر میں نے سوچا کہ کیا ٹھہراؤ اور وحدت صرف تیز تر اور تابندہ تر ہونے کے نتیجے ہی میں مرتب ہوتی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جب کائنات ٹھنڈی ہو جائے گی اور پھر FREEZING کے اُس مقام پر آ جائے گی جو 10^{15} GEV کا اُلٹ ہے تو ایسی صورت میں وہ بھی سکون اور ٹھہراؤ کے اس مقام پر ہی پہنچے گی جسے "ناموجود" کہا گیا ہے۔ گویا اس زینے کا سب سے اُوپر والا قدم اور زینے کا سب سے نچلا قدم اصلاً ایک ہیں۔ دونوں طرف "ناموجود" کی بادشاہی ہے[1]۔ درمیان میں وجود کی HIERARCHY ہے چاہے وہ اُوپر کی طرف جائے اور قوّت میں اضافہ

---

[1] واضح رہے کہ حقیقتِ عظمٰی "موجود" اور "ناموجود" دونوں سے ماورا ہے۔ وہ انت بھی ہے اور بے انت بھی، منتہا بھی ہے اور لامنتہا بھی!

ہوتا چلا جائے یا نیچے کی طرف آئے اور قوّت منہا ہوتی جائے۔ کائنات کا وجود، اس کی بوقلمونی اور اس کا بے پایاں اظہار زینے کے قدموں پہ اُوپر جانے یا نیچے آنے ہی کا شاخسانہ ہے۔ بشرطیکہ نہ تو زینے کے آخری قدم پر پاؤں رکھا جائے اور نہ نچلے قدم پر۔ کیونکہ دونوں صورتیں "ناموجود" ہیں تاہم زینے کے ان آخری قدموں کو مَس کئے بغیر زینے پر اوپر جانا یا نیچے آنا محض مشقّت ہے، تخلیق کاری کا عمل نہیں ہے۔

(۱۵)

پچھلے دنوں جب مجھے "دائرہ" راولپنڈی کی ایک تقریب میں اپنی موجودہ ذہنی کیفیّت کو بیان کرنے کا موقع ملا تو میں نے برملا کہا:

"جناب عنایت کبریا اور ان کے دستِ راست رشید نثار صاحب کا کمال ہے کہ مجھ ایسے گوشہ نشین کو جو شہروں کی چکاچوند سے گھبرا کر ایک چھوٹے سے ہرے بھرے گاؤں میں منقار زیرِ پر تھا، وہ نہ صرف روشنیوں کے اس شہر (راولپنڈی) میں گھسیٹ لائے ہیں بلکہ اُسے سٹیج پر بھی لا بٹھایا ہے۔ سٹیج پر بیٹھنا اور یوں مرکزِ نگاہ بننا بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے انسان آنکھوں کی عدالت میں پا بجولاں کھڑا فیصلے کی گھڑی کا منتظر ہو اور کبھی وہ محسوس کرتا ہے جیسے اُسے دھکیل کر سٹیج پر پہنچا دیا گیا ہے اور اب اسے آنکھوں کے بھرے میلے میں بادلِ نخواستہ اپنا تماشہ دکھانا اور دیکھنے والوں کو محظوظ کرنا ہے۔ مگر میں آج ان میں سے کسی بھی جان لیوا احساس کی زد میں نہیں ہوں۔ بے شک میں سٹیج پر آیا ہوں بلکہ لایا گیا ہوں مگر احساس یہی ہے کہ شامِ دوستاں آباد ہے اور میں دبے پاؤں عقبی دروازے سے دوستوں کی اس محفل میں شریک ہو گیا ہوں۔ لہٰذا روشنی کی شعاع صرف مجھ ہی پر مرکوز نہیں ہے بلکہ صاحبِ صدر (آفتاب احمد خاں) اور مہمان خصوصی (محترمہ ثاقبہ رحیم الدّین) سے لے کر باتیں کرنے اور باتیں سننے والوں تک کو اپنے دائرۂ نُور میں سمیٹے ہوئے ہے۔

کسی ادیب کے لیے ایک شام مختص کرنے کا مقصد بالعموم اس کی عُمر بھر کی کارکردگی کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ مگر مَیں اپنی کارکردگی کے سلسلے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں۔ لہٰذا کسی قسم کی سرزنش یا شاباش کا بھی مستحق نہیں ہوں۔ میں یہ بات "کسرِ نفسی" کے پیشِ پا افتادہ مسلک کا اعادہ کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا بلکہ احوالِ واقعی کے طور پر عرض کر رہا ہوں۔ میں نے جب کبھی اس وسیع اور لامحدود کائنات کے تناظر میں خود کو دیکھنے کی کوشش کی ہے تو صلے میں ایک تبسمِ زیرِ لب کے سوا مجھے کچھ نہیں ملا۔ ویسے مَیں مسکراہٹ کے اس نادر و نایاب لمحے کی اہمیت سے نا آشنا نہیں ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ مسکراہٹ اس بات کا اعلامیہ ہے کہ مسکرانے والا اپنی معنویت یا بے معنویت کا ادراک کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے ہم میں سے بیشتر لوگ اپنی ذات کی بالائی سطح پر عمرِ عزیز گزار کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ اگر کبھی ہمیں زیرِ سطح جانے یا ذات کی اُس جھری میں سے جسے بعض لوگوں نے CRACK IN THE COSMIC EGG کہا ہے، غیر ذات کی جھلک پانے کی سعادت نصیب ہو تو ہمیں بطور صلہ وہ مسکراہٹ یقیناً عطا ہو گی جس کا مَیں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔ مسکراہٹ، نوعیت کے اعتبار سے منفی بھی ہو سکتی ہے اور مثبت بھی۔ منفی اس صورت میں جب وہ اس احساس سے پھوٹے کہ انسان نہ صرف مکانی طور پر بلکہ زمانی اعتبار سے بھی ایک نقطۂ موہوم ہے۔ سب جانتے ہیں کہ زندگی کا یہ گھونسلہ جسے دھرتی کا نام ملا ہے آج سے تقریباً ساڑھے چار ارب سال پہلے وجود میں آیا تھا۔ اس کے تقریباً ایک ارب سال بعد کچھ MICRO-ORGANISMS اس دھرتی پر نازل ہوئے[1] اور انھوں نے یہاں آتے ہی اپنے لیے "فضا" کی تعمیر کا

---

[1] یہ خیال اوّل اوّل ARRHENIUS نے پیش کیا تھا۔ بعد ازاں فرانسس کرک FRANCIS CRICK نے DIRECTED PANSPERMIA کا نظریہ پیش کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کرۂ ارض پر زندگی

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

کام شروع کردیا۔ شُدہ شُدہ زندگی اس کرۂ ارض پر نشوونما پانے لگی۔ آج سے تقریباً ایک کروڑ سال پہلے RAMAPI THACUS پیدا ہوئے تقریباً چالیس لاکھ سال پہلے AUSTRALOPITHACUS آئے اور آج سے محض چھ لاکھ سال پہلے HOMO SAPIENS نے جنم لیا۔ انسانی تہذیب کا آغاز NEOLITHIC CULTURE سے ہوا جو آج سے کم و بیش پندرہ ہزار برس پہلے کا واقعہ ہے۔ ہماری تاریخ کو شروع ہوئے محض پانچ ہزار سال ہوئے ہیں۔ بقول جولین جینز انسانی شعور کی باقاعدہ ابتدا آج سے صرف تین ہزار سال پہلے ہوئی۔ میں بیسویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوا۔ اس سے پہلے کے اربوں سالوں میں میرا نام و نشان تک نہیں تھا۔ میں بیسویں صدی کے کیپسول میں بند ہوں اور امکان یہ ہے کہ اسے پار نہیں کر سکوں گا۔ وقت رواں دواں ہے۔ زندگی آج سے چند ارب سال پہلے پیدا ہوئی۔ چند کروڑ سال بعد یا اگر انسان نے اس دھرتی پر مزید رہنا ناپسند کیا تو چند سال بعد ہی معدوم ہو جائے گی۔ وقت کی گزران کے ساتھ ساتھ وہ لمحہ جس کے اندر میرا وجود بند ہے سمٹتا جائے گا تا آنکہ نیست ہو جائے گا۔ میں ہی نہیں خود "زندگی" کا اس کرۂ ارض پر آنا اور پھر بے نیلِ مرام واپس چلے جانا محض پلک جھپکنے کا ایک واقعہ قرار پائے گا۔

ادب کے حوالے سے دیکھوں تو میرا نام اور کام بیسویں صدی کی چند دہائیوں تک محدود ہے۔ پوری صدی کے تناظر میں میری حیثیت بالکل معمولی ہے۔ دس صدیوں کے تناظر میں بالکل معدوم ہو جائے گی۔ بات مجھ ہی تک محدود نہیں معدوم ہو جانا انسان کا نوشتۂ تقدیر ہے۔ ایک صدی کے تناظر میں غالب ایک عظیم شاعر ہے۔ ایک ہزار برس کے تناظر میں بھی شاید وہ کسی نہ کسی حد تک عظمت کا حامل رہے مگر ایک لاکھ برس کے تناظر میں غالب کہاں ہوگا اور پھر کیا دس لاکھ برس

(بقیہ پچھلا صفحہ) کا بیج از خود نہیں آیا بلکہ کسی برتر تہذیب نے ایک SPACESHIP کے ذریعے یہاں بھیجا ہے۔

کے تناظر میں اس کا کوئی نام ونشان باقی رہے گا؟ اس وقت تک تو آج کی بولی جانے والی زبانیں اور ان کے گرد لپٹے ہوئے کلچر اور ان کلچروں کو اپنے ہالے میں لئے ہوئے آج کی تہذیب کبھی کی ختم ہو چکی ہو گی اور اس کے ساتھ ہی نام و نمود کے جملہ مظاہر بھی خاک ہو چکے ہوں گے۔ ہم سب اپنی اپنی صدیوں کے مرقدوں میں قید ہیں۔ اگر اس قید سے رہا بھی ہوں تو ایک نسبتاً بڑے مرقد میں قید ہو جائیں گے۔ مگر قید و بند کا یہ سلسلہ لامتناہی نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شخص کی کہانی میں بلکہ ہر کرۂ ارض کی کہانی میں ایک ایسا مقام ضرور آتا ہے جب وہ اپنے مرقد کو عبور نہیں کر پاتا اور نیست ہو جاتا ہے۔ پس جب نیست ہو جانے کے اس المیّے کو دیکھتا ہوں تو زندگی اور اس کے مقاصد کی بے معنویت مجھ پر آشکار ہو جاتی ہے اور مجھے اپنا نام اور کام محض راکھ میں دبی ہوئی ایک چنگاری نظر آتا ہے۔ اور تب مجھے وہ مُسکراہٹ عطا ہوتی ہے جو بے معنویت کے احساس ہی سے پُھوٹ سکتی ہے۔

مگر مسکراہٹ ہمیشہ منفی نوعیّت کی کھسیانی مُسکراہٹ نہیں ہوتی۔ اس کا ایک رُوپ وہ معنی خیز مُسکراہٹ بھی ہے جو مونا لیزا کے لبوں پر نمودار ہو تو اپنی تخلیقی صلاحیّت کے احساس سے منوّر ہو جائے اور گوتم کے ہونٹوں پر آئے تو پہچان اور عرفان سے عبارت دکھائی دے۔ ہرمن ہیسے نے گوبند کے لمحۂ انکشاف و عرفان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ایک روز اپنے دوست سدھیارتھ کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے تھا کہ یکایک اُس نے دوست کے چہرے میں سینکڑوں چہروں کو گزرتے ہوئے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ وہ گزرنے کے باوجود گزر نہیں رہے تھے۔ اس نے مچھلی کا کُھلا ہوا مُنہ دیکھا اور پھر مچھلی کو مرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ایک نوزائیدہ بچّے کا چہرہ دیکھا جس پر لاتعداد جُھرّیاں تھیں۔ پھر اُس نے ایک قاتل کو دیکھا جو کسی کے

پیٹ میں چھرا گھونپ رہا تھا۔ اُسی لمحے اُس نے قاتل کو پابجولاں حالت میں اس طور دیکھا کہ جلاد اس کا سر قلم کر رہا تھا۔ اُس نے ایسی لاتعداد صورتوں کا نظارہ کیا جو ایک دوسری کے ساتھ محبت اور نفرت کے لاکھوں رشتوں میں منسلک تھیں۔ وہ بیک وقت ایک دوسری کو ختم بھی کر رہی تھیں اور اپنی ہی راکھ سے دوبارہ جنم بھی لے رہی تھیں۔ یہ تمام صورتیں رُکتی تھیں، چلتی تھیں، کھلتی اور مُرجھاتی تھیں، ایک دوسری میں ضم ہوتی تھیں اور ان سب پر شیشے کا ایک لطیف اور مہین سا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ یہ غلاف دراصل سدھیارتھ کی ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی —— مسکراہٹ جو جاننے اور پہچاننے کے عمل سے پیدا ہوئی تھی۔

بس یہ ملکوتی مسکراہٹ ہی زندگی کا حاصل ہے لیکن یہ مسکراہٹ صرف اس وقت جنم لیتی ہے جب انسان "دیکھنے" پر قادر ہو جاتا ہے۔ جب اس دھرتی پر "زندگی" نے قدم جمالیئے تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اردگرد کے ماحول کے بارے میں کچھ جانکاری حاصل کرے۔ سو پہلے اس نے اسے ٹٹول کر جاننا چاہا، مگر چھونے کی زد RANGE محدود تھی۔ پھر اس نے اپنی زنبیل سے سُننے، سُونگھنے اور چکھنے کی حسیات نکال کر آزمائیں مگر ان سب کی زد بھی محدود تھی۔ تب اس نے اپنے اندر سے دو لالٹینیں LANTERNS برآمد کیں اور یکایک اسے محسوس ہوا کہ فاصلے سمٹنے لگے ہیں۔ اور دور و نزدیک کی چیزیں اپنے تمام تر رنگوں، تہوں اور زاویوں کے ساتھ اس کی گرفت میں آنے لگی ہیں۔ زندگی کو یہ نیا ہتھیار اتنا اچھا لگا کہ اس نے اسے بڑے پیمانے پر تیار کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ مگر ایک عرصہ تک یہ ہتھیار اُفقی سطح پر ہی استعمال ہوتا رہا، عمودی سطح پر بروئے کار نہ لایا جا سکا۔ انسان آیا تو اس نے پہلی بار نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور یکایک اسے اپنا ماحول کروڑوں اربوں نوری

سالوں پر پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ ہر طرف ستارے اور کہکشائیں اور نجانے کیا کیا کچھ اس پر منکشف ہوتا چلا گیا۔ پوری دھرتی انسانی آنکھ میں تبدیل ہو کر کائنات کو دیکھنے لگی۔ چونکہ خود دھرتی کائنات کے جسم کا ایک انگ تھی۔ لہٰذا یوں کہہ لیجئے کہ کائنات نے "دھرتی کی آنکھ" سے خود کو دیکھنا شروع کر دیا۔ گویا ناظر اور منظور کا رشتہ اُبھر آیا۔

مگر جلد ہی انسان پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ اُس کی آنکھ کے اندر بھی ایک آنکھ مستور تھی جو ناظر اور منظور دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ یعنی ایک طرف تو انسان اپنی نظروں سے کائناتِ اکبر اور کائناتِ اصغر کو ٹٹول رہا تھا اور دوسری طرف وہ "ناظر اور منظور" کی ثنویت سے باہر کھڑا ان دونوں کو دیکھنے لگا تھا۔ یہ "تیسری آنکھ" ہی وہ عطیہ تھا جس کے باعث اس کے ہونٹوں پر ایک ملکوتی تبسم پیدا ہوا —— تبسم جو جاننے اور پہچاننے کا اعلامیہ تھا مگر جو دراصل آغاز تھا، انجام نہیں تھا۔ کیونکہ پہچان کسی ایک لمحۂ انکشاف کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی دائرہ در دائرہ کیفیت ہے جس کی کوئی نہایت نہیں ہے۔ انسان کا کائنات سے باہر نکل کر ایک نظر کائنات کو دیکھنا اور پھر مزید ایک قدم پیچھے ہٹ کر ناظر اور منظور کے اس نئے رشتے کو دیکھنا اور پھر متواتر پیچھے ہٹتے اور ناظر اور منظور کے ہر نئے رشتے کو دیکھتے چلا جانا —— یہی وہ عمل تھا جس کے باعث انسان کے ہاں وہ معنی خیز مسکراہٹ بار بار نمودار ہوئی جو اس کائنات کی ابتدا بھی ہے اور منتہا بھی!

خواتین و حضرات!

میں معذرت خواہ ہوں کہ مجھے آج کی اس محفل میں "درازئ گفتن" کا مرتکب ہونا پڑا مگر ایسا کیے بغیر میں آپ کو اپنی بے بضاعتی کا احساس کیسے دلا سکتا تھا! ۷۴ برس کے سنگِ میل کو پار کیا ہے تو مجھ پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ میں تو محض آنسو کا ایک بلبلہ ہوں مگر میرے لیے یہ بات باعثِ اطمینان

ضرور ہے کہ آنسو کا یہ بُلبلہ کائنات کے عظیم تر بُلبلے ہی کا ایک ادنیٰ رُوپ ہے نیز یہ کہ میں کبھی کبھی اس بُلبلے سے باہر آ کر اسے ایک نظر دیکھنے پر بھی قادر ہوں اور میرے لیے یہ ایک بہت بڑی سعادت ہے"!

("دائرہ" کی ایک تقریب سے خطاب)

(۱۶)

اور اب شام کی آمد آمد ہے، میں بدستور اپنے گاؤں میں رہ رہا ہوں۔ بہت کم سفر کرتا ہوں۔ لیکن ہمہ وقت حالتِ سفر میں ہوں۔ جب سورج ڈھلتا ہے تو میں چھڑی ہاتھ میں لیے دُور کھیتوں میں نکل جاتا ہوں۔ جب میں گاؤں سے نکل رہا ہوتا ہوں تو عین اس وقت پرندے، ڈھور ڈنگر اور کسان رات گزارنے کے لیے گاؤں کی طرف آ رہے ہوتے ہیں۔ راستے میں ان سب سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان کے لیے رات سکون اور آرام اور نیند کا دوسرا نام ہے۔ میرے لیے رات ، سفر کا ایک استعارہ ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ شام بظاہر دن کی روشنی کا آخری نقطہ ہے مگر یہ رات کی روشنی کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور میں ایک طویل مسافرت کے بعد اب کہیں اس نقطے پر پہنچا ہوں۔ آج سے تقریباً چونسٹھ ۶۴ برس پہلے جب میں دن کے نقطۂ آغاز پر کھڑا تھا تو اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے ارد گرد کا ہوش تک نہیں تھا۔ مگر آج کہ رات کے نقطۂ آغاز پر پہنچا ہوں تو دیکھ سکتا ہوں اور یوں اُس گہرے اسرار کو جو معانی کا گہوارہ اور امکانات کا منبع ہے نہ صرف سُن سکتا ہوں بلکہ اُسے "مَس" بھی کر سکتا ہوں۔ میں جب اسے دیکھتا ہوں تو اس کے اندر ویسا ہی دھماکا ہوتا ہے جیسا ناموجود کے اندر ہوا تھا اور پھر سارا آسمان مُسکراتے ہوئے ستاروں سے اَٹ جاتا ہے اور میں ان ستاروں کو اپنے پھیلے ہوئے دامن میں اس طور سمیٹنے لگتا ہوں جیسے گاؤں کی لڑکیاں کپاس چُنتی ہیں۔

مکتبہ فکر و خیال کا اشاعتی پروگرام

انشائیہ — اُردو ادب میں
ڈاکٹر انور سدید

مکتبہ فکر و خیال کی پہلی کتاب چھپ چکی ہے۔ اس کتاب میں اردو انشائیہ کے ماضی کی بازیافت اور حال کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ انشائیہ کے سب مباحث پر مدلل، بامعنی اور باسلیقہ گفتگو کی گئی ہے۔ انشائیہ کی تنقید پر پہلی سنجیدہ کتاب جس میں انشائیہ کی یورپی روایت پر بھی بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴۰ روپے

اک طُرفہ تماشا ہے
غلام الثقلین نقوی

غلام الثقلین نقوی ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں، لیکن ان کے باطن میں ایک خوش فکر مزاح نگار بھی موجود ہے۔ "اک طرفہ تماشا ہے" غلام الثقلین نقوی کے مزاحیہ مضامین کا خوش نظر مجموعہ ہے۔

نرم دمِ گفتگو
غلام جیلانی اصغر

اس کتاب کے بارے میں یہی کہنا کافی ہے کہ یہ غلام جیلانی اصغر کے شگفتہ انشائیوں کا مجموعہ ہے۔

پہلا ورق
حیدر قریشی

رسالہ "اوراق" کے اوارتی صفحے پر ادب کے تازہ موضوعات کو ہمیشہ اہمیت دی جاتی ہے۔ "اوراق" کے اداریوں کو خیال افروز مقالات کی حیثیت حاصل ہے۔ حیدر قریشی نے "اوراق" کے اداریے "پہلا ورق" کے نام سے مرتب کیے ہیں۔ یہ کتاب عصری ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔

دامِ خیال
سجاد نقوی

سید سجاد نقوی اُردو ادب کے ایک خوش فکر قاری اور ذہین نقاد ہیں۔ "دامِ خیال" ان کے منتخب مقالات کا مجموعہ ہے جو قاری کو جدید ادب کے بارے میں مستند اور مفید معلومات فراہم کرے گا۔

مکتبہ فکر و خیال ۱۷۲ ستلج - اقبال ٹاؤن - لاہور